شرح لمعة الاعتقاد

دائمی عقیدہ

امام ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد ابن قدامہ رحمہ اللہ

شارح

الشیخ صالح بن فوزان الفوزان حفظہ اللہ تعالیٰ

مترجم

ابو یحییٰ محمد زکریا زاہد حفظہ اللہ

MAKTABA AL-FURQAN

فہرست

عرضِ ناشر

''دائمی عقیدہ'' امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کی مشہور و معروف کتاب "لـمعة الاعتقاد" کی شرح کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ عقائد کی سرفہرست کتابوں میں سے ایک ہے۔ عقیدہ اسلام کی بنیادی اکائی ہے۔ تمام عبادات اس کے ساتھ منسلک ہیں۔ عقیدہ درست ہے تو عبادات بھی فائدہ دیں گی بصورتِ دیگر نیک اعمال بھی ضائع ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (الانعام: ۸۸)

''اور اگر یہ لوگ شریک بناتے تو یقیناً ان سے ضائع ہو جاتا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔''

جب جب گمراہیوں کے اندھیرے بڑھے اور ان کے باطل عقائد نے لوگوں کو راہِ حق سے بھٹکایا تو ایسے عالم میں اللہ رب العزت نے اپنے خاص بندوں کو ان کے آگے بند باندھنے کے لیے کھڑا کر دیا۔ ان علماء نے صحیح عقیدے کی طرف راہنمائی کے لیے کتب تالیف کیں جن میں ان باطل عقائد کا ردّ اور صحیح عقیدے کا بیان ہوتا۔ یہ معرکہ حق و باطل آج تک جاری و ساری ہے۔ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ درست راہ اختیار کرتے ہوئے صحیح عقیدے کو ہی اختیار کرے اور باقی عقائد کو چھوڑ دے۔

امت مسلمہ کا نصب العین عقیدہ توحید ہے۔ سعودی عرب اسی عقیدہ کی وجہ سے ترقی کر رہا ہے۔ پاکستان جن مشکلات میں اس وقت گھرا ہوا ہے اس کا باعث عقیدہ توحید میں خامی ہی ہے۔ علماء اور سیاستدانوں کے لیے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ لیکن سارا مسئلہ یہی ہے۔ جس دن پاکستان نے اس پر توجہ دی اسی دن دہشت گردی سے لے کر تمام مسائل حل ہو جائیں

گے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ باقی قوموں نے تو ترقی بغیر عقیدہ کے کر لی ہے۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ عقیدہ کو اہمیت دیں ورنہ ان کو ذلت اور رب کی پکڑ سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ کیونکہ مسلمان ہی کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے باقی تو نہیں کہتے اسی لیے ان کو مشکلات درپیش نہیں۔ مسئلہ تو ہمارا ہے ہم اقرار بھی کرتے ہیں اور انکار بھی کرتے ہیں۔ پاکستان میں جتنی شرک کو اہمیت حاصل ہے اتنی توحید کو نہیں۔ الا ما شاء اللّٰہ .

عقائد پر کتب کی اشاعت کے لیے ہم ایک لمبے سلسلے کا عزم رکھتے ہیں۔ جس کا مقصد لوگوں کو بھلائی والے اصل دین کی طرف لانا ہے۔ میں ان تمام بھائیوں کا بھی حد مشکور ہوں جنھوں نے کتاب کو شائع کرنے میں ہمارے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون کیا۔ میں اپنے رفیق عبدالرؤف بھائی کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے اپنی انتھک محنت سے ادارہ کو اس قابل بنا دیا کہ مکتبہ الفرقان کی کتب بہت زیادہ پڑھی جانے لگیں۔

ابوساریہ عبدالجلیل

جدہ، سعودی عرب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصنف رحمہ اللہ کے حالاتِ زندگی

یہ تھے جناب الشیخ، القدوہ، المجتہد، الامام، شیخ الاسلام، موفق الدین ابومحمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ بن مقدام بن نصر المقدسی الجماعیلی، دمشقی الصالحی، الحنبلی رحمہ اللہ۔ فقہ حنبلی کی معروف کتاب ''المغنی'' کا مصنف۔

جناب امام موفق الدین عبداللہ بن احمد بن محمد ابن قدامہ رحمہ اللہ فلسطین کے علاقہ نابلس کی بستیوں میں سے ''جماعیل'' نامی بستی میں ماہِ شعبان ۵۴۱ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ کی عمر دس سال تھی کہ آپ نے اپنے گھر والوں اور عزیز واقارب کے ہمراہ ۵۵۱ھ میں دمشق کی طرف ہجرت کی۔ وہاں آپ رحمہ اللہ نے علوم کی ابتدائی کتب کا سبق شروع کردیا۔ چنانچہ آپ نے قرآن بھی حفظ کرلیا اور مختصر الخرقی بھی یاد کرلی۔

اسی طرح آپ نے اپنے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور فقہ کا علم حاصل کرلیا۔ ساتھ ساتھ آپ نے خط جمیل کا فن بھی حاصل کیا۔ دیکھتے دیکھتے آپ دنیا جہان کے ذہین ترین لوگوں اور علم کے سمندروں میں شمار ہونے لگے۔

پھر امام ابن قدامہ اور ان کے خالہ زاد بھائی الحافظ عبدالغنی بن عبدالواحد بن علی المقدسی (المحدث رحمہ اللہ) ۵۶۱ھ میں تحصیل علم کے لیے بغداد کی طرف روانہ ہوگئے۔ دونوں خالہ زادوں میں اتنی الفت تھی کہ دونوں اکٹھے ہی نکلا کرتے اور دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی مصاحبت میں اپنے سبق اور سماع علم کے لیے جاتا۔ یہ دونوں نوجوان تھے کہ چہروں پر سبزہ ابھی آ ہی رہا تھا، لوگوں نے دونوں کو اہل بغداد کے بارے میں بہت ڈرایا۔ مگر یہ دونوں نوجوان علم کی خاطر بالکل نہ ڈرے اور پھر بغداد پہنچ گئے۔

الحافظ عبدالغنی المقدسی رحمہ اللہ کا رجحان ''علم الحدیث'' کی طرف تھا۔ جبکہ موفق الدین

فقہ پڑھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ حافظ عبدالغنی فقیہ وقانون دان بھی بن گئے (اور علم حدیث بھی حاصل کرلیا۔) جبکہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے ان کے ہمراہ بہت سارے علماء سے سماع حدیث کیا۔ عقلمند اہل علم نے ان دونوں نوجوانوں کو جب عیوب سے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے بہت کم مل جل کر رہنے والے پایا تو وہ ان سے محبت کرنے لگے اور انہوں نے ان سے نہایت اچھا سلوک کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں بھائیوں نے بہت زیادہ علم حاصل کرلیا۔ چنانچہ یہ دونوں خالہ زاد بھائی بغداد میں چالیس سال تک رہے۔

یہ دونوں نوجوان سب سے پہلے فصیلۃ الشیخ عبدالقادر بن عبداللہ الجیلی الحنبلی رحمہ اللہ کے پاس فروکش ہوئے۔ انہوں نے ان دونوں کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا اور ان دونوں کو اپنے پاس مدرسہ میں اقامت دے دی۔ دونوں خالہ زاد بھائیوں نے شیخ محترم سے خوب علم حاصل کیا، مگر اللہ عزوجل کا فیصلہ یوں آ گیا کہ ان دونوں کے یہاں اس مدرسہ میں داخلہ سے ٹھیک پچاس دن بعد فصیلۃ الشیخ / عبدالقادر اللہ کو پیارے ہوگئے۔

پھر یہ دونوں نوجوان امام ابن الجوزی رحمہ اللہ کے ہاں اقامت گزیں ہوگئے۔ اس کے بعد دونوں "رباط النعال" منتقل ہوگئے اور وہیں پر علامہ ناصح الدین ابوالفتح، نصر بن فیتان بن مطر ابن المنی الحنبلی، المفتی جو کہ شیخ الحنابلہ تھے، سے فقہ، خلاف اور اُصول کا علم حاصل کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے علامہ ہبۃ اللہ بن حسن الدقاق سے سماعِ حدیث کیا۔ اور ابوالفتح بن البطی، ابوزرعہ بن طاہر احمد بن المقرب، علی بن تاج القرآء، معمر بن الفاخر، احمد بن الرجبی، حیدرہ بن عمر العلوی، عبدالواحد بن حسین البارزی، خدیجہ النہروانیہ، نفیسہ البزازہ شہدہ الکاتبہ، المبارک بن محمد البادرائی، محمد بن محمد السکن، ابوشجاع محمد بن حسین المادرائی، ابوحنیفہ محمد بن عبید اللہ الخطیبی اور یحییٰ بن ثابت رحمہم اللہ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اسی طرح ان دونوں نوجوانوں نے جناب ابوالحسن علی بن عساکر بن المرحب البطائحی الضریر کے سامنے امام نافع رحمہ اللہ کی قرأت پر قرآن پڑھا (یعنی قرأت وتجوید سیکھی۔) اسی طرح اپنے استاذ الشیخ ابوالفتح ابن المنی رحمہ اللہ کے سامنے ابوعمرو رحمہ اللہ کی قرأت پر قرآن پڑھا اور اپنے اس استاذ ابوالفتح

سے قرأتِ قرآن کی تفقہ حاصل کی حتی کہ اس فن میں اپنے ہم پلہ لوگوں سے فوقیت لے گئے۔ اور پھر موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ نے تو فوقیت حاصل کرنے والے ملکہ کو اپنے ہاتھ میں کرلیا۔ حتی کہ مذہب ومسلک اور موقف کی معرفت اور اس کے اُصول آپ رحمہ اللہ پر منتہی ہوگئے۔ اور پھر آپ رحمہ اللہ کے دمشق واپس پلٹ آنے کے بعد ایک مرتبہ پھر بغدد واپس گئے۔ یہ ۵۶۷ھ کی بات ہے۔ اس مرتبہ آپ رحمہ اللہ کے ہمراہ عماد الدین ابواسحاق ابراہیم بن عبدالواحد بن علی المقدسی رحمہ اللہ بھی تھے۔ یہ دونوں بزرگ وہاں ایک سال تک قیام پذیر رہے۔ آپ رحمہ اللہ نے ۵۷۳ھ میں حج کیا اور مکہ مکرمہ کے علماء سے سماعِ حدیث بھی۔

الناصح بن الحنبلی نے بیان کیا ہے کہ: علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے ۵۷۴ھ میں حج کیا تھا اور پھر آپ عراقی وفد کے ہمراہ بغداد آ گئے۔ وہاں آپ نے ایک سال تک قیام کیا۔ اس دوران آپؒ نے اپنے شیخ اور محترم اور استاذ ابوالفتح ابن المنی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے رکھا۔ پھر آپؒ دمشق پلٹ آئے اور اپنی کتاب ''المغنی'' کی تصنیف میں لگ گئے۔

علامہ موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ اپنے زمانہ میں ملک شام کے بہت بڑے عالم تھے۔ علوم وفنون میں تبحر وثقاہت کے ساتھ ساتھ آپؒ نہایت پرہیزگار، عابد وزاہد اور متقی آدمی تھے۔ آپؒ کے وجود اور چہرے سے ہیبت ووقار چھلکتا تھا۔ آپ کی طبیعت میں بردباری اور اور مؤدت وشفقت تھی۔ آپؒ کے تمام اوقات علم وعمل میں مستغرق تھے۔ آپؒ اپنے مد مقابل علماء کو دلائل وبراہین سے لاجواب کردیتے تھے۔ نہ ہی تو آپ دوران گفتگو تنگی وپریشانی سے بچنے کی کوشش کرتے اور نہ ہی گھبراتے تھے۔ جبکہ مد مقابل چیختا چلاتا بھی اور دلائل نہ ہونے کی وجہ سے حسد کی بنا پر جل جاتا۔ الضیاء المقدسی محمد بن عبدالواحد رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ جس سے بھی مناظرہ کرتے دورانِ مناظرہ آپ مسکراتے رہتے۔

اس پر علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے تعلیقاً لکھا ہے: اس معاملے میں اکثر جو ہم نے مشاہدہ ومعائنہ کیا وہ یہ ہے کہ آپ جب کسی سے بھی مناظرہ کرتے تو اس کے لیے میدان کھلے چھوڑ

دیتے، کسی بھی ایک موضوع کو مخصوص نہ کرتے۔ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ امام ذہبی رحمہ اللہ اپنے اہل زمانہ میں علمی مناظرہ کے ساتھ تنگی دیکھتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ نے ابن فضلان الشافعی رحمہ اللہ جیسے عالم سے بھی مناظرہ کیا کہ مناظرہ میں اس شخص کی مثال دی جاتی تھی مگر آپؒ نے ابن فضلان کو بھی ہرا دیا۔

امام موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ ایک لمبے عرصہ تک مسلسل ہر جمعہ کو نماز جمعہ کے بعد مسجد میں مناظرہ کے لیے بیٹھتے رہے۔ اور اس دور کے فقہاء آپ رحمہ اللہ کے پاس جمع ہو جاتے۔ آپؒ نمازِ فجر کے بعد سے سورج کافی بلند ہو جانے تک پڑھاتے رہتے تھے۔ اسی طرح بعد ظہر سے لے کر مغرب تک۔ اس دوران آپؒ کبھی کبیدہ خاطر نہ ہوتے۔ اور طلبہ آپ کو سبق سناتے رہتے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ: کوئی شخص آپ کو دیکھے اور وہ آپ سے محبت نہ کرے۔ آپ رحمہ اللہ نے کبھی کسی طالب علم کا دل نہیں دکھایا تھا۔ آپ رحمہ اللہ کی ایک ہمسائی ہمیشہ آپؒ کو اپنی بداخلاقی کے ساتھ تکلیف پہنچاتی رہتی تھی مگر آپ اسے کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔

علامہ ضیاء المقدسی رحمہ اللہ نے اپنے استاذ الشیخ موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ کی سیرت پر دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں آپ لکھتے ہیں: آپ رحمہ اللہ مکمل قد وقامت والے، گورے رنگ کے، روشن چہرے والے اور خوبصورت بڑی آنکھوں والے تھے۔ آپ کے حسن وجمال کی وجہ سے ایسے لگتا تھا گویا نور آپ کے چہرے سے نکل رہا۔ چمکدار، روشن رو، کھلی پیشانی، لمبی ڈاڑھی، اٹھی ہوئی ستواں ناک، گھنے ملے ہوئے ابرو، درمیانے سے چھوٹے سر والے، نہایت نرم ہاتھوں اور پیروں والے۔ دبلے وجود اور اپنے حواس خمسہ سے خوب فائدہ اٹھانے والے تھے۔ آپ رحمہ اللہ حد درجہ کے ذہین وفطین، اچھے طرز عمل کو اختیار کرنے والے تھے۔ آپؒ کے حسن سلوک وحسن تصرف کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے! بیان کیا جاتا ہے کہ آپ رحمہ اللہ اپنی پگڑی میں تھیلی نما بندھا ہوا ایک کاغذ رکھتے جس میں سیاہی کو جذب کرنے والا سفوف ہوتا تھا۔ جب لوگوں کو فتاویٰ اور اجازات (سندیں) لکھ کر دیتے تو

آپ اس سفوف کے ساتھ سیاہی کو خشک کرتے۔ اتفاقاً ایک رات آپ کی یہ پگڑی جھپٹا مار کر چھین لی گئی۔ آپؒ نے چھیننے والے سے کہا: ارے بھائی! آپ پگڑی سے تھیلی نما ورقہ لے لو اور جو کچھ اس میں ہے وہ بھی لے جاؤ، مگر میری پگڑی واپس کردو، اس سے میں اپنا سر ڈھانپ لوں۔ اس تھیلی میں جو کچھ ہے، اس میں تمہیں کھلی چھٹی ہے۔ وہ تمہارے لیے میری طرف سے جائز ومباح ہوا۔ چور یہ سمجھا کہ تھیلی میں ضرور چاندی ہوگی۔ اس نے جب تھیلی کو کافی بھاری پایا تو اس نے اسے لے لیا اور پگڑی واپس کردی۔ چنانچہ اُچکے نے باریک چمڑے سے بنی اس تھیلی کا لینا پگڑی کے بدلے بدرجہا بہتر جانا۔ تو، اس طرح علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اپنے حسب اسلوب اورنہایت خوش گفتاری سے اپنی پگڑی واپس لے لی۔

ابن النجار کہتے ہیں: علامہ موفق الدین عبداللہ بن احمد ابن قدامہ رحمہ اللہ دمشق کی جامع مسجد میں حنابلہ کے امام تھے۔ آپؒ نہایت ثقہ وجحت اور معزز وشریف النفس، بے پایاں فضل والے، پاکدامن، متقی و پرہیزگار، سلف صالحین کے منہج وطریق پر نہایت عبادت گزار تھے۔ آپ کے چہرہ پرنور اور اخلاق وچال میں وقار تھا۔ آدمی ان کی بات سننے سے پہلے ان کے دیدار سے ہی فائدہ حاصل کرلیتا تھا۔

عمر بن الحاجب کہتے ہیں: موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ امام الائمہ، امت کے مفتی تھے جنہیں اللہ عزوجل نے نہایت وافر فضل سے نواز رکھا تھا۔ نہایت معزز، مکمل علم والے تھے کہ جن کے تذکرہ سے شہروں میں شور مچ گیا تھا اور ابن قدامہ جیسے لوگوں سے زمانے بخیل ہوگئے تھے۔ (صدیوں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ مگر یہ نہایت ہی مبالغہ آرائی ہے۔ انہی ابن قدامہ رحمہ اللہ کی مسند کو سنبھالنے والے امام احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔) ان سے نقلی اور عقلی جامع الحقائق لیے گئے ہیں۔ ...... ابن قدامہ رحمہ اللہ کی تصنیفات بھی بہت ساری ہیں۔ زمانے نے کسی کو بھی شک میں نہیں ڈالا کہ موفق الدین رحمہ اللہ جیسا کوئی شخص فیاض اور فراخ دل ہو۔ آپؒ نہایت متواضع، حسن اعتقاد (پختہ عقیدہ والے) بردبار وباوقار تھے۔ آپؒ کی مجلس فقہاء اور محدثین سے پر رہتی تھی۔ آپؒ بہت زیادہ عبادت

گزار، ہمیشہ تہجد پڑھنے والے تھے۔ ہم اپنے زمانے میں ان جیسا کوئی شخص نہیں دیکھ رہے۔

امام ابوالعباس ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام اوزاعی کے بعد ملک شام میں الشیخ موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ جیسا کوئی شخص داخل نہیں ہوا۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: امام ابن قدامہ رحمہ اللہ مغرب اور عشاء کے مابین اپنے محراب کے قریب نفل پڑھتے رہتے تھے۔ اور جب نماز عشاء پڑھ لیتے تو (دمشق کے) محلّہ الرصیفہ میں الدولعی والے راستے اپنے گھر کو چلے جاتے۔ سر راہ میسر آنے والے فقراء ومساکین کو اپنے ہمراہ لے جاتے جو آپ کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے۔ آپؒ کا اصل گھر ''قاسیون'' میں تھا۔ چنانچہ بعض راتوں میں عشاء کے بعد آپ پہاڑ کی طرف چلے جاتے۔

علامہ ضیاء المقدسی رحمہ اللہ کہتے ہیں: موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ نہایت ہی حسن اخلاق والے تھے۔ ہر شخص آپؒ کو مسکراتے ہوئے دیکھتا تھا۔ آپ حکایات وواقعات بیان کرتے اور مزاح بھی کرتے تھے۔ میں نے بہاء اللہ سے سنا؛ وہ کہتے تھے: الشیخ موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ قرأت کے دوران ہم سے مزاح کر لیا کرتے تھے اور آپ خوش رہتے۔ ایک بار لوگوں نے ان بچوں کے بارے میں آپؒ سے شکایت کی جو آپ کے پاس پڑھتے تھے۔ (کہ وہ شرارتیں کرتے ہیں) تو آپ نے فرمایا: کوئی بات نہیں، بچے جو ہوئے، ان کو ضرور کھیلنا چاہیے۔ تم بھی تو انہی جیسے ہوا کرتے تھے۔ آپؒ نہ ہی تو دنیاداروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے اور نہ ہی کسی قسم کی شکایت کرتے تھے۔ بسا اوقات آپ دوسروں سے زیادہ ضرورت مند ہوتے آپ ان کو ترجیح دے دیتے۔

میں نے بہاء اللہ سے سنا، آپؒ امام موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ کی شجاعت وبہادری والی صفت بیان کر رہے تھے۔ اور پھر فرمایا: آپؒ دشمن کی طرف پیش قدمی کرتے۔ آپ کی ہتھیلیاں (ہتھیاروں کے استعمال کی وجہ سے) زخمی ہو جاتیں۔ آپؒ دشمن پر تیراندازی خوب کرتے تھے۔

ضیاء المقدسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: آپؒ نماز نہایت خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے۔ آپؒ

ہمیشہ مغرب وعشاء اور فجر کی سنتیں اپنے گھر میں پڑھتے تھے۔ اسی طرح آپ مغرب وعشاء کے درمیان چار رکعات پڑھتے۔ ان چاروں رکعات میں (جو دو، دو کر کے پڑھی جاتیں) سورۃ السجدۃ، سورۃ یٰسین، سورۃ الدخان اور تبارک الذی پڑھتے۔ ایسا امکان ہی نہیں ہوتا تھا کہ آپؒ ان میں کوتاہی کریں گے۔ سحری کے وقت بھی آپ تہجد کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ بسا اوقات آپ اپنی آواز کو بلند کر دیتے۔ آپ کی آواز بہت دلکش تھی۔ ایک بار الملک العزیز بن العادل آپ کی زیارت کے لیے آیا۔ اتفاقاً آپؒ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ چنانچہ وہ آپؒ کے قریب بیٹھ گیا اور خاموشی سے بیٹھا رہا حتی کہ آپ نماز سے فارغ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ آپ سے ملا۔ اُس نے احتراماً آپ کی نماز میں بالکل خلل اندازی نہ کی۔

سبط ابن الجوزی رحمہ اللہ کا بیان ہے: امام موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ عقیدہ وایمان باللہ کے بارے میں شبہ ڈالنے والی باتوں سے بہت ناراض ہوتے۔ آپ بالکل صحیح اور پختہ عقیدے والے تھے۔ ضیاء المقدسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے الحافظ الیونینی رحمہ اللہ سے سنا فرماتے تھے: جب میں حنابلہ کے متعلق اللہ عزوجل کی ذات اقدس وصفات عالیہ کے بارے میں عدم تشبیہ کا سنتا کہ وہ اس کے قائل نہیں ہیں اور لوگ نہایت بھونڈے انداز میں ان پر تنقید کرتے ہیں تو ایک بار میں نے علامہ موفق الدین رحمہ اللہ سے س بارے میں معلوم کرنے کا پورا پختہ ارادہ کر لیا۔ میں کئی مہینے اس حال میں رہا کہ ان سے اس کے متعلق پوچھوں۔ بالآخر صالحیہ محلّہ والی جانب میں ان کے ہمراہ جبل قاسیون پر چڑھنے لگا۔ امام رحمہ اللہ کا صالحیہ میں گھر تھا۔ چنانچہ جب میں ابن محارب کے گھر کے قریب پہنچا تو میں نے کہا: یا سیّدی! کسی کو مخاطب کرنے کے لیے اکثر اوقات میں یہ کلمہ استعمال کرتا تھا۔ آپؒ نے فرمایا: ''اللہ عزوجل کی صفات میں تشبیہ یکسر باطل اور حقیقت سے ہٹی ہوئی (مستحیل) ہے۔'' میں نے پوچھا: کیوں جی؟ فرمایا: اس لیے کہ تشبیہ کی بنیادی شروط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مشبہ لہ کو ہم نے دیکھ رکھا ہو پھر ہم اس کی تشبیہ بیان کریں۔ سوال یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ کو کس نے دیکھا ہے جو اس کی تشبیہ بیان کرے؟ امام ابن رجب رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: ابن قدامہ رحمہ اللہ دین کے

موضوع پر کلام کرنے والوں، علم کلام کے ماہر لوگوں (منطقیوں) کے ساتھ کلام کی باریکیوں میں کہ جنہیں آسانی سے نہ سمجھا جا سکے گفتگو میں مشغول ہونے کی رائے نہیں رکھتے تھے۔ آپ اصول وغیرہ کے باب میں منقول (قرآنی نصوص اور سنت کے دلائل) کی کثرت سے متابعت کرنے والے تھے۔ جو عبارتیں مؤثر نہ ہوں ان کے اطلاق کی آپ رائے نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ آپؒ اسی چیز کو بہتر طور پر انجام دینے اور اسی کے اعتراف و بیان کا حکم دیتے تھے جو اللہ عزوجل کی صفات عالیہ کے حوالے سے قرآن وسنت میں آیا ہے۔ یعنی ان کی شرح وتفسیر کیے بغیر، نہ اللہ عزوجل کے اسماء حسنیٰ اور صفات عالیہ کی کیفیت بیان کی جائے، نہ کی مثال بیان کی جائے، نہ ان کی تحریف کی جائے اور نہ ہی تاویل وتعطیل۔

علامہ ضیاء الدین المقدسی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: میں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے میرے سامنے ایک مسئلہ پیش کیا۔ میں نے عرض کیا: یہ کتاب ''الخرقی'' میں ہے۔ آپؒ نے فرمایا: تمہارے ساتھی موفق الدین نے ''الخرقی'' کی شرح میں سستی اور کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ علامہ ضیاء کہتے ہیں: موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ تفسیر القرآن، شرح الحدیث، اس کے مشکلات کے حل اور فقہ کے بھی امام تھے۔ بلکہ فقہ الاسلام میں تو آپؒ اپنے دور کے نابغۂ روزگار تھے۔ اسی طرح آپؒ علم الخلاف کے بھی امام اور فرائض (علم المیراث) کے بھی نابغۂ روزگار تھے۔ بعینہٖ آپ اصولِ فقہ، نحو، حساب، متحرک ستاروں اور افلاک کی منازل والے علم کے بھی امام تھے۔

جب آپؒ بغداد آئے تو آپ کے شیخ ابوالفتح المنی رحمہ اللہ نے آپ سے کہا: آپ یہاں بغداد میں رہائش اختیار کرلیں۔ اہل بغداد حصولِ علم میں آپؒ کے محتاج ہیں۔ اگر آپ بغداد سے چلے جاتے ہیں تو پھر آپ اپنے پیچھے کسی کو بھی اپنے جیسا چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ علامہ ضیاء المقدسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے داؤد بن صالح المقری سے سنا، وہ بیان کرتے تھے: میں نے الشیخ ابوالفتح ابن المنی سے سنا، فرماتے تھے اور اس وقت امام موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے: جب یہ نوجوان بغداد سے چلا جائے گا تو اس وقت اس شہر کو

اس کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہوگا۔ اور میں نے مفتی ابوبکر محمد بن معالی بن غنیمہ کو سنا، آپ فرماتے تھے: میں اپنے زمانے میں امام موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ کے سوا کسی شخص کو نہیں پاتا کہ جس نے اجتہاد کے درجہ کو پالیا ہو۔ اسی طرح میں نے حافظ ابوعبداللہ الیونینی کو سنا، کہتے تھے: میں نے ہمارے شیخ اور ہمارے سردار موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ کے حالات کو جتنا جانا ہے، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ: بلا شک وشبہ اب تک میں نے جس کسی شخص کو بھی دیکھا ہے، میں اس بات کا اعتقاد رکھتا ہوں کہ علوم میں کمال ان کے علاوہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہوا۔ اسی طرح وہ صفاتِ حمیدہ کہ جن کے ساتھ کمال حاصل ہوتا ہے وہ بھی ان کے علاوہ کسی شخص کو ہمارے زمانے میں حاصل نہیں ہوئیں۔

بلا شک وشبہ موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ حسن واحسان، بردباری، شان وشوکت والا ہونے، مختلف علوم، اخلاق حمیدہ اور وہ امور جنہیں میں نے ان کے علاوہ کسی اور میں نہیں دیکھا کہ مکمل ہوئے ہوں، ان سب صفات کے مکمل امام تھے۔ میں نے آپ رحمہ اللہ کے کریمانہ اخلاق، حسن معاشرت، انتہا درجہ کی بردباری، کثرت علم، گہری و بے بہا ذہانت، کمال مروت، کثرتِ حیاء، بشاشت میں ہیشگی، دنیا اور دنیا والوں سے علیحدگی وتنہائی، حکومتی مناصب اور حکام سے دوری کا جو مشاہدہ کیا ہے اس سے بڑے بڑے اولیاء وعلماء عاجز تھے۔ بلا شبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ((مَا اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلٰى عَبْدٍ نِعْمَةً أَفْضَلُ مِنْ أَنْ يُلْهِمَهُ ذِكْرَهُ.)) ''اللہ تعالیٰ کسی بندے پر کسی بھی نعمت کا جو انعام کرتا ہے تو وہ انعام اس سے افضل نہیں ہوسکتا کہ ربّ کریم اس کا ذکر (اس کی یاد) لوگوں کے دلوں میں ڈال دے۔'' (الہیثمی نے اسے مجمع الزوائد میں درج کیا ہے: ۴/ ۴۲۷/ عن ابی ذر رضی اللہ عنہ۔ الترغیب والترہیب: ۴۴۱۸)

اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ کسی کی یاد کا اللہ عزوجل کی طرف سے دلوں میں ڈالا جانا افضل الکرامات میں سے ہے۔ اور سب سے افضل یاد یہ ہے کہ اس کا نفع بندوں تک دراندازہو جائے اور وہ ہے؛ قرآن وسنت کی تعلیم۔ اس سے بڑھ کر اور اس سے عمدہ یہ ہے کہ: وہ یاد

فطری اور طبعی ہو، اس میں تکلف نہ ہو۔ اور قابل ذکر صفات؛ عقل وحیاء، فضل وکرم اور بردباری ہیں۔ اللہ عزوجل نے امام موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ کو نہایت معزز اخلاق کریمہ پر پیدا فرمایا تھا اور آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے نہایت وافر مقدار میں مکارمِ اخلاق (بمع حسن ووجاہت) عطا فرمائے تھے، اس نے اپنی نعمتیں بھی ابن قدامہ رحمہ اللہ کو ان گنت دی تھیں اور ہر حال میں ان پر اللہ کریم نے مہربانی فرمائی تھی۔ آپ رحمہ اللہ نہایت عمدہ شعر بھی کہا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں: ع

يُخَرَّقُ عُمْرِىْ كُلَّ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ فَهَلْ أَسْتَطِيْعُ رَقْعَ مَا يَتَخَرَّقُ

میری عمر ہر دن رات میں بوسیدہ ہو کر پرانے کپڑے کی طرح پھٹتی چلی جارہی ہے۔ تو کیا جو بوسیدہ ہو کر پھٹتا چلا جارہا ہے اسے میں رفو کرنے کی طاقت رکھتا ہوں؟

ایک اور نہایت عمدہ بات کس قدر شاندار پیرائے میں بیان کی ہے۔

لَا تَجْلِسَنَّ بِبَابِ مَنْ يَأْبىٰ عَلَيْكَ دُخُوْلَ دَارِهِ

اُس کے دروازے (در) پہ مت بیٹھو جو اپنے گھر میں تیرے داخلے کا انکار کردے۔

شخصی حالات:

امام موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اپنی چچا زاد مریم بنت ابوبکر بن عبداللہ بن سعد المقدسی سے شادی کی تھی جن سے اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو تین بیٹے، عیسیٰ، محمد اور یحییٰ جبکہ دو بیٹیاں، صفیہ اور فاطمہ عطا کیے تھے۔ مریم کے علاوہ آپؒ نے دو اور لڑکیوں سے بھی شادیاں کیں پھر آپ نے غیریہ سے شادی کی جو آپ سے پہلے فوت ہوگئی تھی۔ آپ کے تینوں بیٹے محمد، یحییٰ اور عیسیٰ آپ کی زندگی میں ہی فوت ہوگئے تھے۔ اور پھر عیسیٰ کے علاوہ کسی بیٹے کی اولاد نہ ہوئی۔ عیسیٰ کے نہایت صالح دو بیٹے زندہ رہے مگر وہ بھی فوت ہوگئے۔ یوں ابن قدامہ رحمہ اللہ کی نسل آگے نہ چل سکی۔

امام موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ بروز ہفتہ ۶۲۰ھ عید الفطر والے دن اپنے ربّ سے جاملے اور اگلے دن جامع المظفری کے پیچھے جبل قاسیوں کے معروف قبرستان میں دفن کیے

گئے۔ آپ رحمہ اللہ کے جنازے میں لوگوں کا اتنا بڑا ازدھام تھا کہ ایسا جم غفیر کبھی کسی کے جنازے میں نہیں دیکھا گیا۔ محمد بن عبدالرحمٰن العلوی کا بیان ہے: ہم جبل بنی ہلال میں تھے کہ عید رات کو ہم نے جبل قاسیون پر (دمشق میں) بہت بڑی روشنی دیکھی جس سے ہمیں گمان ہونے لگا کہ شاید دمشق کو آگ لگ گئی ہے۔ ساری بستی والے باہر نکل کر اس روشنی کی طرف نکلنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی امام موفق الدین رحمہ اللہ کی وفات کی خبر پہنچ گئی۔

علامہ موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ نے درج ذیل شہروں میں موجود اپنے زمانہ کے کبار وصغار سب علماء سے علم حاصل کیا؛ دمشق بغداد، مکہ المکرّمہ اور موصل۔ آپؒ اچھی خاصی بڑی جمعیت کے علم وفضل میں ممتاز شخصیت والے سردار بھی تھے۔ یہ بات امام ذہبی رحمہ اللہ نے (سیر اعلام النبلاء میں) درج کی ہے۔

دمشق کے علماء جن سے آپ نے سماع کیا:

۱...... آپ کے والد محترم، احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی

۲...... ابوالمعالی عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن احمد بن علی بن صابر السلمی الدمشقی

۳...... ابوالمکارم عبدالواحد بن محمد بن المسلم بن ہلال الازدی الدمشقی المسند رحمہم اللہ

بغداد میں آپ کے اساتذہ کرام:

۱...... محی الدین ابومحمد عبدالقادر بن عبداللہ بن جنکی، الجیلی الحنبلی شیخ بغداد۔ علامہ موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ جب پہلی بار بغداد میں آئے تو آپ انہی صاحب کے پاس قیام پذیر ہوئے تھے۔ ان سے آپؒ نے کتاب ''الخرمی'' پڑھی تھی۔

۲...... جمال الدین ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد بن الجوزی البغدادی الحنبلی الواعظ جو ڈھیر ساری کتب کے بہت بڑے مصنف تھے۔ آپؒ ان کے بعد عبدالقادر الجیلی کے ہاں اقامت پذیر ہونے کے بعد بغداد میں ان کے پاس رہائش پذیر ہوگئے تھے۔ آپ نے ان سے خوب اکتسابِ علم کیا۔

۳...... ناصح الاسلام ابوالفتح نصر بن فتیان بن مطر ابن المنی النہروانی الحنبلی المفتی، شیخ الحنابلہ۔

ان سے آپؒ نے بغداد میں ابوعمرو رحمہ اللہ کی قرأت پر قرآن کی تلاوت کو سیکھا۔ شیخ ابوالفتح ابن المنی کی آپؒ نے ایک لمبا عرصہ مصاحبت اختیار کی اور ان سے حنبلی فقہ ومسلک اور خلاف واُصول کو سیکھا۔

۴...... ابومحمد عبداللہ بن احمد بن احمد بن احمد بن الخشاب البغدادی العلامہ المحدث، امام النحو، جو اپنے دور کے عربی علوم ونحو اور لغت کے امام مانے جاتے تھے۔ آپ کے زمانہ کے علماء ان موضوعات پر آپ سے فتویٰ طلب کیا کرتے تھے اور وہ آپ سے عربی عبارتوں میں مشکل الفاظ اور محاورہ جات وضرب الامثال کا حل پوچھا کرتے تھے۔

موصل کے اساتذہ:

موصل میں آپؒ نے علامہ ابوالفضل عبداللہ بن احمد بن محمد الطّوسی الشافعی خطیب موصل سے اکتسابِ علم کیا تھا۔

مکہ مکرمہ میں آپؒ کے اساتذہ:

آپؒ نے مکہ مکرمہ میں الشیخ / ابومحمد المبارک بن علی البغدادی الحنبلی المحدث الحافظ، امام الحنابلہ بالحرم سے سماع حدیث کیا۔

امام ذہبی ﷺ بیان کرتے ہیں کہ: موفق الدین ابن قدامہ اور ان کے خالہ زاد بھائی الحافظ عبدالغنی رحمہما اللہ نے درج ذیل علماء کرام رحمہم اللہ سے سماعِ حدیث اور اکتسابِ علم کیا ہے۔

(۱)...... الشیخ عبدالقادر بن عبداللہ الجیلی
(۲)...... ہبۃ اللہ بن الحسن الدقاق
(۳)...... ابوالفتح بن البطی (نصر بن فتیان)
(۴)...... ابوزرعہ بن طاہر
(۵)...... احمد بن المقرب
(۶)...... علی بن تاج القراء
(۷)...... معمر بن الفاخر
(۸)...... احمد بن محمد الرجبی
(۹)...... صیدرہ بن عمر العلوی
(۱۰)...... عبدالواحد بن الحسین البازری
(۱۱)...... خدیجہ النہروانیہ
(۱۲)...... نفیسہ البزازہ
(۱۳)...... شہدہ الکاتبہ
(۱۴)...... المبارک بن محمد البادرائی

(۱۵)......محمد بن محمد بن السکن (۱۶)......ابوشجاع محمد بن الحسین المادرائی

(۱۷)......ابوحنیفہ محمد بن عبید اللہ الخطیبی اور (۱۸)...... یحییٰ بن ثابت رحمہم اللہ جمیعاً

علامہ موفق الدین ابن قدامہ ﷺ کی کتاب ''المغنی'' کے محقق نے اس کتاب کے مقدمہ میں ان علماء کے نام شمار کیے ہیں جن سے امام موصوف ﷺ نے اکتسابِ علم کیا تھا اور ان کی تعداد (۳۲) بتیس کبار علماء کی گنوائی ہے۔ اور پھر جن علماء نے الشیخ الامام موفق الدین ابن قدامہ ﷺ سے اکتسابِ علم کیا تھا یا ان سے سماعِ حدیث کیا تھا اور ان سے تفقہ فی الدین حاصل کیا، ان کی اپنی تحریر کردہ کتب ان سے پڑھی تھیں، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ امام ذہبی ﷺ نے (سیر اعلام النبلاء میں) بیان کیا ہے کہ جن علماء نے امام موفق الدین ابن قدامہ ﷺ سے روایت کیا ہے، ان میں سے (۱) البہاء عبدالرحمٰن۔ (۲) الجمال ابوموسیٰ بن الحافظ (۳) ابن نقطہ (۴) ابن خلیل۔ (۵) الضیاء المقدسی (۶) ابوشامہ (۷) ابن النجار (۸) ابن عبدالدائم (۹) الجمال بن الصیر فی (۱۰) العز ابراہیم بن عبداللہ (۱۱) الفخر علی (۱۲) التقی بن الواسطی، (۱۳) الشمّس بن الکمال (۱۴) التاج عبدالخالق (۱۵) العماد بن بدران (۱۶) العز اسماعیل بن الفراء (۱۷) العز احمد بن العماد (۱۸) ابوالفہم بن النمیس (۱۹) یوسف الغسولی (۲۰) زینب بنت الواسطی اور دیگر بیسیوں علماء وطلاب علم بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

''المغنی'' کے محقق نے لکھا ہے کہ: امام موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اُصول الدین، اصول الفقہ، اصول تفسیر، اصول حدیث، فقہ، الانسان والفضائل کے موضوعات پر بہت ساری کتب لکھی ہیں۔ ان سب میں اہم ترین آپ کی تصنیف ''المغنی شرح مختصر الخرقی'' ہے جو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مسلک ومذہب پر فقہ الاسلام کی نہایت شاندار اور بہت ہی مفید کتاب ہے۔ حتی کہ الشیخ عز الدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علم کتاب وسنت پر مشتمل کتب اسلام میں سے امام ابن حزم رحمہ اللہ کی المحلی اور المجلی اور الشیخ موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ کی کتاب ''المغنی'' جیسی کتابیں اپنی ندرت وجودت کے لحاظ سے میں نے کہیں اور کوئی نہیں

دیکھیں۔ میرا نفس فتویٰ صادر کرنے کے لحاظ سے اتنی دیر تک تیار ہی نہ ہوا حتی کہ میرے ''المغنی'' کا نسخہ آ گیا۔

اسی طرح امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کی "روضة الناظر وجنة المناظر" اصولِ فقہ میں، ''الکافی اور المقنع'' حنبلی فروعات کی فقہ میں اور تاویل باطل کی مذمت میں اور گانے و رقص وسرور سے متعلق تصوف کے معانی کی مذمت میں، وسوسوں کی مذمت میں، عقیدہ کے موضوع پر، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اسی طرح آپؒ کی یہ کتاب ''لمعة الاعتقاد......دائمی عقیدہ'' بھی ہے جس کی شرح کرنے کی ہم سعادت حاصل کررہے ہیں۔ فضائل صحابہ اور التوابین بھی آپ کی کتب ہیں۔

''المغنی'' کے محقق نے لکھا ہے کہ: امام موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ کی تصنیفات تک جتنا اہل علم کو حاصل کرنا ممکن ہوا، ان کی تعداد سینتالیس (۴۷) ہے۔ جن میں سے بعض کتب کی کئی ایک جلدیں ہیں اور کچھ ایک ایک جلد کی۔ جبکہ بعض رسالہ جات کی صورت میں ہیں۔

هـذا ما علمنا والله اعلم بالصواب وصلى الله على نبينا محمد وبارك وسلم تسليما كثيرا۔ [1]

صالح بن فوزان بن عبداللہ الفوزان
ممبر کبار علماء کمیٹی وممبر دائمی افتاء کمیٹی
مملکت سعودی عرب

---

[1] امام موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ کی سیرت (حالاتِ زندگی) پر درج ذیل اہم مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے:

(۱)...... امام الذہبی رحمہ اللہ کی۔ سیر اعلام النبلاء، جلد نمبر ۲۲، ص ۱۶۵ تا ۱۷۳.

(۲)...... العز احمد بن العماد کی۔ شذرات الذہب، جلد نمبر ۵، ص ۸۸ تا ۹۲.

(۳)...... حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی۔ البدایہ والنہایہ، جلد نمبر ۱۳، ص ۹۹ تا ۱۰۱.

(٤) ...... ابن رجب رحمہ اللہ کی۔ ذیل طبقات الحنابلہ، جلد نمبر ۲، ص ۱۳۳ تا ۱۴۹.

(۵)...... المغنی پر مقدمة المحقق، جلد نمبر ۱، ص ٦ تا ۳۷.

مقدمہ

قَالَ الشَّيْخُ العلّامةُ موفّقُ الدِّينِ عبدُ اللّٰه بن اَحمدَ بن قدامه المَقدسیُّ رحمه الله تعالیٰ:

بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم .

الشیخ علامہ موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہ المقدسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

تشریح......: ہر طرح کی حمد وثنائے جمیل اس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے اور درود وسلام ہوں اس کے بندے اور رسول، ہمارے پیارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، آپ کی آل پر اور آپ کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر۔

حمد وثناء کے بعد!

یہ عقیدہ کی کتاب کہ جس کا نام "لمعة الإعتقاد الهادی إلی سبیل الرشاد" ہدایت کے راستے کی طرف راہنمائی کرنے والی (دائمی عقیدہ) ہے۔ اس کے مؤلف ہیں جناب امام ابومحمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ حنبلی۔ جو کہ مذہب حنبلی کے بہت بڑے عالم تھے۔

آپ رحمہ اللہ نے فقہ اور اصول فقہ وغیرہ کے موضوعات پر بھی کتابیں لکھیں۔ مثلاً فقہ کے موضوع پر آپ رحمہ اللہ کی درج ذیل کتابیں ہیں:

(۱)...... "عمدة الفقه" یہ مختصر کتاب ہے۔

(۲)...... "المُقنع" یہ عمدۃ الفقہ سے بڑی اور تفصیلی کتاب ہے۔

(۳)...... "الکافی" جو کہ مقنع سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ ان کے علاوہ "المُغنی" جو کہ ایک مشہور کتاب اور فقہ کے موضوع پر ایک بہت بڑا موسوعہ ہے۔ اس میں آپ رحمہ اللہ نے

بہت سے اسلاف کی فقہ اور مذاہب اربعہ کو مع دلائل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سب کو شامل کیا ہے۔ اکثر راجح قول کی بھی نشاندہی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب فقہ اسلامی میں ایک مرجع کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

اصول میں آپ نے ”روضة الناظر“ اور ”وجنة المناظر“ تصنیف فرمائیں۔

ان کے علاوہ آپ نے اصلاحی موضوعات اور تمام علمی فنون پر کتابیں لکھیں۔ الغرض آپ رحمہ اللہ ایک جلیل القدر عالم دین ہیں۔ عقیدہ کے موضوع پر آپ کی کتابوں میں سے ایک یہ رسالہ ”لمعة الإعتقاد الهادي إلى سبيل الرشاد“ ہے۔

امام ابن قدامہ ان علماء میں سے ایک ہیں جنہوں نے (لوگوں کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے) صحیح عقیدے کی وضاحت کے لیے کتابیں لکھیں اور اس بارے میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا خاتمہ کیا۔ بالخصوص جب مختلف عقائد اور شبہات کے حامل گمراہ فرقوں کا ظہور ہوا تو علماء نے ضروری جانا کہ صحیح عقیدے کی وضاحت کی جائے اور اس کے مخالفین کا ردّ کیا جائے۔ یہ سلسلہ زمانہ قدیم سے ہی جاری ہے۔ علماء کرام چونکہ عقیدہ کے معاملہ میں خصوصی توجہ دیتے ہیں اس لیے متقدمین اور متاخرین میں سے مختلف علماء نے مختلف ناموں سے عقیدہ کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے بعض تو عقیدہ کی کتب کو ”کتب السنّه“ کا نام دیتے ہیں۔ جیسے: عبداللہ بن امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کی ”کتاب السنة“ امام خلال رحمہ اللہ کی ”کتاب السنه“ اور ابن ابی عاصم کی ”کتاب السنه“۔ بعض علماء کتب عقیدہ کو ”الشريعة“ کا نام دیتے ہیں۔ جیسے امام آجری رحمہ اللہ کی ”کتاب الشريعة“۔ بعض علماء انھیں ”الأصول“ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جیسے: امام لالکائی رحمہ اللہ کی کتاب ”اصول اعتقاد اهل السنة والجماعة“ ہے۔ بعض انھیں ”التوحيد“ کا نام دیتے ہیں۔ جیسے امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کی ”کتاب التوحيد“ امام ابن مندہ رحمہ اللہ کی ”کتاب التوحيد“۔ شیخ الاسلام، مجدد ملت محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی ”کتاب التوحيد“ اور امام، علامہ مؤرخ المقریزی کی کتاب ”تجريد التوحيد“ وغیرہ۔

جبکہ بعض علماء ایسی کتابوں کو العقیدہ یا الاعتقاد کا نام دیتے ہیں۔ جیسے امام طحاوی رحمہ اللہ کی کتاب "العقيدة الطحاويه"، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب "العقيدة الواسطيه" اور کتاب ہذا "لمعة الاعتقاد" بھی اسی قسم کی کتابوں میں سے ایک ہے۔

لمعۃ الاعتقاد کا مفہوم:

"لمعة" لفظ "لمعان" سے ہے اور اس سے مراد وہ چیز ہے جس میں روشنی اور چمک ہو۔ چنانچہ "لمعة" کا معنی ہوا چمکدار اور روشن۔ ظلمت اور اندھیرے کے برعکس۔ اس کتاب کو "لمعۃ" کا نام دینے کی اس معنی سے مناسبت یہ ہے کہ یہ کتاب ان کتابوں سے مختلف ہے جو گمراہ کرنے والی اور لوگوں کے عقائد میں شکوک وشبہات پیدا کرنے والی ہیں۔

الاعتقاد، اِعْتَقَدَ کا مصدر ہے اور اس سے مراد وہ پختہ یقین ہے جو دل میں گھر کر جائے اور اسے ایمان بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اعتقاد اور ایمان کا ایک ہی معنی ہے اسی لیے سیّدنا جبریل علیہ السلام نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

((أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيْمَان . قَالَ: الْإِيْمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ، وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ.))

"مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، آخرت کے دن اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لائے۔" [1]

یہی اصول الاعتقاد ہیں اور انھیں ارکانِ ایمان بھی کہا جاتا ہے چنانچہ "لمعة الإعتقاد" کا معنی ہوا: صحیح عقیدے کا بیان۔ جسے اختیار کرنا اور اس کے علاوہ باقی عقائد کو چھوڑنا واجب ہے۔

---

[1] یہ سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔ اسے امام احمدؒ نے اپنی مسند میں (۳۶۷)، مسلمؒ نے (۸)، ابوداؤدؒ نے (۴۶۹۵)، ترمذیؒ نے (۲۶۱۰)، نسائیؒ (۸/۹۷) اور ابن ماجہ (۶۳) وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

الهادي......: سے مراد ہے رہنما۔

الـرشاد ......: یہ گمراہی اور ضلالت کی ضد ہے۔ چنانچہ یہ عقیدہ ایسے صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا ہے برعکس گمراہ لوگوں کے عقائد کے۔ کیونکہ وہ تو ہلاکت اور گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم:

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کو سنت پر عمل کرتے ہوئے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے شروع کیا ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے: ہر عظیم الشان کام کو بسم اللہ سے شروع کیا جائے۔ یعنی ہر اہم اور عظیم کام کو سرانجام دیتے وقت بسم اللہ کو پڑھا اور لکھا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن کریم کو اور قرآن کریم کی ہر سورت کو اس سے شروع کیا ہے۔ اور جیسا کہ سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا بلقیس کو اپنے خط کے آغاز میں لکھا:

﴿قَالَتْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمَلَؤُا۟ إِنِّىٓ أُلْقِىَ إِلَىَّ كِتَٰبٌ كَرِيمٌ ۝ إِنَّهُۥ مِن سُلَيْمَٰنَ وَإِنَّهُۥ بِسْمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ۝﴾ (النمل: ۲۹ تا ۳۰)

''اس (ملکہ) نے کہا اے سردارو! بے شک میری طرف ایک عزت والا خط پھینکا گیا ہے۔ بے شک وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور بے شک وہ اللہ کے نام سے ہے، جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔''

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، قرآن کریم کی ایک آیت ہے۔ کیونکہ یہ قرآن کے ساتھ نازل ہوئی تھی اور یہ سورۂ نمل کے علاوہ باقی سورتوں کے شروع میں تو صحیح مؤقف کے مطابق ایک مستقل آیت ہے۔ لیکن سورۂ نمل میں یہ مستقل آیت نہیں بلکہ آیت کا ایک حصہ ہے۔ یہ سورۃ فاتحہ اور اس کے علاوہ دیگر سورتوں میں شامل نہیں ہے بلکہ اسے محض سورت سے پہلے پڑھا جاتا ہے۔ اسے سورت نمل کے علاوہ کسی معین سورت کا ایک حصہ نہیں کہا جا سکتا اور سورۂ نمل میں بھی یہ آیت کا ایک حصہ ہے۔

قولِ مصنف: ''بـاسـمِ اللّٰہ'' میں جار اور مجرور پوشیدہ عبارت کے متعلق ہیں۔ اور وہ ہے: ''اَسْتَعِيْنُ بِبِاسْمِ اللّٰہِ'' (میں بسم اللہ کے ساتھ مدد طلب کرتا ہوں) یا ''أَتَبَارَكُ بِبِاسْمِ اللّٰہِ'' (میں بسم اللہ کے ساتھ برکت حاصل کرتا ہوں)

اور لفظ إسم: سُمُوٌّ سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنی ہے: بلندی۔ یا سِمَةٌ سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے: علامت۔ علامت اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کوئی چیز ممتاز ہوتی

ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسماء وضع فرمائے اور وہ آدم علیہ السلام کو سکھلائے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ (البقرہ: ۳۱)

''اور آدم کو سب کے سب نام سکھلا دیے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا، پھر فرمایا مجھے ان کے نام بتاؤ، اگر تم سچے ہو۔''

یعنی چیزوں کے نام سکھلائے۔ الغرض ہر چیز کا کوئی نام ہوتا ہے جس سے وہ ممتاز ہوتی ہے۔

قول مصنف: ''باسم اللہ'' میں لفظ ''اسم'' مضاف ہے اور لفظ ''اللہ'' مضاف الیہ۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء مراد ہیں۔ کیونکہ جب مفرد کی اضافت کردی جائے تو اس میں عموم پیدا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ بِاسْمِ اللّٰهِ کا معنی ہوا: میں اللہ تعالیٰ کے تمام ناموں کے ساتھ مدد طلب کرتا ہوں اور برکت حاصل کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے نام اتنے زیادہ ہیں کہ ان سب کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَ ذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اَسْمَآئِهٖ سَیُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ (الاعراف: ۱۸۰)

''اور سب سے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، سو اسے ان کے ساتھ پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں کے بارے میں سیدھے راستے سے ہٹتے ہیں۔ انھیں جلد ہی اس کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے۔''

اور لفظ اللہ پاک ذات ربّ العالمین کا نام ہے۔ یہ نام صرف اسی کے لیے خاص ہے۔ اور اس لفظ (اللہ) کا اطلاق صرف اسی پر ہوتا ہے جل جلالہ۔ کیونکہ لفظ اللہ الوہیت سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے: بندگی، اور بندگی کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس کی طرف

دل مائل ہوتے ہیں اور اس کی بزرگی وعظمت کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں۔

الرحمن الرحیم:

یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے دو نام ہیں جن میں رحمت کا معنی پایا جاتا ہے۔ رحمت اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے جو اسی کی عظمت کے لائق ہے اور الرحمٰن بھی صرف اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ البتہ الرحیم کا لفظ مخلوقات میں سے بھی کسی پر کبھی بول دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾

''یعنی وہ (محمد ﷺ) مومنوں پر شفقت اور رحم کرنے والے ہیں۔''

الرحمٰن میں الرحیم سے زیادہ عموم پایا جاتا ہے۔ کیونکہ الرحمٰن سے مراد تمام مخلوقات کے لیے عام رحمت ہے، جبکہ الرحیم سے مراد وہ رحمت ہے جو صرف مومنوں کے لیے خاص ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا﴾

الغرض یہ دو عظیم نام ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا معنی پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس کی عظمت کے لائق ہے۔

❀❀❀❀❀

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ:

ترجمہ......: تمام قسم کی خاص تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔

تشریح......: مؤلف رحمہ اللہ نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے بعد ''الحمد لله'' کے ساتھ اپنے کلام کا آغاز کیا اور کلام کو ''الحمد للہ'' کے ساتھ شروع کرنا بھی سنت ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ ایسا کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع کیا جو کہ سورۃ فاتحہ میں ہے۔

الحمد میں الف ولام استغراق کے لیے ہے۔ یعنی تمام قسم کی سب تعریفیں اللہ کے

لیے ہیں اور وہی مطلق طور پر تعریف کا حق دار ہے۔ ''حمد'' کا لفظ ''شکر'' سے عام ہے کیونکہ شکر صرف افعال پر ہوتا ہے جبکہ ''حمد'' کا لفظ اس سے وسیع تر معنی میں ذات، اسماء وصفات اور افعال تعریف کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

چنانچہ الحمد للّٰہ کا معنی یہ ہے کہ کامل تعریف کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے۔

❀❀❀❀❀

المحمودُ بِکُلِّ لِسانٍ:

ترجمہ......: جس کی تعریف ہر زبان میں کی جاتی ہے۔

تشریح......: یعنی اللہ تعالیٰ کی تعریف ہر اس زبان میں کی جاتی ہے جو اس نے اپنی مخلوقات میں سے ہر کسی کو سکھائی ہے۔ چنانچہ ہر مخلوق اپنی اپنی زبان میں جو اللہ نے اسے سکھائی ہے اس کی پاکی اور تعریف بیان کرتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا﴾ (الاسراء: ٤٤)

''ساتوں آسمان اور زمین اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ بھی جو ان میں ہیں۔ اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ بے شک وہ ہمیشہ سے بے حد بردبار، نہایت بخشنے والا ہے۔''

❀❀❀❀❀

اَلْمَعْبُوْدُ فِيْ كُلِّ زَمَانٍ

ترجمہ......: جس کی ہر زمانے میں عبادت کی جاتی ہے۔

تشریح......: یعنی وہ ہمیشہ کے لیے عبادت کا حقدار ہے اور اس کی مخلوق قیامت قائم ہونے تک اس کی عبادت کرتی رہے گی۔ چنانچہ قیامت تک کوئی دور بھی اللہ کے بندوں سے خالی نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہ صرف اسی کی عبادت اور توحید کا پرچار کرتے رہیں گے۔

اسی طرح ہر جگہ اس کی عبادت ہوتی رہے گی۔ چنانچہ آسمانوں میں بھی اللہ عزوجل کی عبادت کی جاتی ہے اور زمین پر بھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ﴾ (الزخرف: ٨٤)

''اور وہی ہے جو آسمانوں میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہی کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

الٰہ سے مراد یہاں معبود ہے۔ معنی یہ ہوا کہ آسمانوں میں بھی اس کی عبادت کی جاتی ہے اور زمین پر بھی اسی کی عبادت کی جاتی ہے۔ جہانِ بالا بھی اس کی عبادت کرتا ہے اور جہانِ پست بھی اور اس کی مخلوقات میں سے جن اور انسان بھی ہر جگہ اس کی عبادت کرتے ہیں۔ الغرض اس کی عبادت کسی جگہ کے ساتھ خاص نہیں۔ اسی لیے رسالت مآب ﷺ نے فرمایا:

((جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا .))

''میرے لیے ساری زمین کو سجدہ گاہ بنا دیا گیا ہے۔''[1]

اگرچہ آسمان و زمین میں ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاسکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے بعض جگہوں پر عبادت کی فضیلت زیادہ رکھی ہے۔

❀❀❀❀❀

---

[1] یہ سیّدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔ اسے بخاری (۳۳۵)، مسلم (۵۲۱) اور نسائی رحمہ اللہ (۱/۲۱۰۔۲۱۱) نے بیان کیا ہے۔

اَلَّذِیُ لَا یَخُلُو مِنُ عِلُمِهٖ مَکَانٌ

ترجمہ......: جس کے علم سے کوئی جگہ پوشیدہ نہیں۔

تشریح......: آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ اسے جانتا ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ مَا یَکُوۡنُ مِنۡ نَّجۡوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمۡ وَلَا خَمۡسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمۡ وَلَاۤ اَدۡنٰی مِنۡ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَکۡثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمۡ اَیۡنَ مَا کَانُوۡا ثُمَّ یُنَبِّئُهُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۝﴾ (المجادلہ: ۷)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ تین آدمیوں کی کوئی سرگوشی نہیں ہوتی مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے۔ اور نہ کوئی پانچ آدمیوں کی مگر وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے۔ اور نہ اس سے کم ہوتے ہیں اور نہ زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، جہاں بھی ہوں۔ پھر وہ انھیں قیامت کے دن بتائے گا جو کچھ انھوں نے کیا۔ یقیناً اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَمَا یَخۡرُجُ مِنۡهَا وَمَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعۡرُجُ فِیۡهَا وَهُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ۝﴾ (الحدید: ٤)

''وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔ وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے اور وہ تمھارے ساتھ ہے، جہاں

بھی تم ہو۔ اور اللہ اسے جو تم کرتے ہو، خوب دیکھنے والا ہے۔''

تیسری جگہ پر ارشاد ربانی ہے:

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ﴾ (البقرہ: ۲۵۵)

''جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے اور جو ان کے پیچھے ہے۔''

چنانچہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے جو ہو چکی ہے یا ہونے والی ہے اور اس سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ﴾

(آل عمران: ۵)

''بے شک اللہ وہ ہے جس پر کوئی چیز نہ زمین میں چھپی رہتی ہے اور نہ آسمان میں۔''

وہ یہ سب کچھ ہمیشہ سے جانتا تھا پھر اس نے ہر چیز کو لوح محفوظ میں لکھ دیا۔

وہ ہمیشہ اور ہر حال میں عالم ہے اور کبھی اپنے علم سے جدا نہیں ہوتا۔ الغرض علم ہمیشہ سے اس کی صفت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ وہ خود تو آسمان میں عرش کے اوپر ہے لیکن اس کا علم ہر جگہ کو محیط ہے۔ آسمان اور زمین، اس کی مخلوقات اور ماضی و مستقبل میں سے کچھ بھی اس پر پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ ہر اس چیز کو جانتا ہے جو ہو چکی ہے اور جو ہو گی اور یہ کہ وہ کیسے ہو گی۔ اس کے علم سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْأَرْضِ وَ لَآ أَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ﴾

(سبأ: ۳)

''وہ (اللہ) سب چھپی چیزیں جاننے والا ہے! اس سے ذرہ برابر چیز نہ آسمانوں میں چھپی رہتی ہے اور نہ زمین میں۔ اور نہ اس سے چھوٹی کوئی چیز ہے اور نہ

بڑی مگر ایک واضح کتاب میں ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اور علم کو الگ الگ کیا۔ چنانچہ اس کی ذات تو آسمانوں پر بلندی میں ہے اور اس کا علم ہر جگہ پر ہے کوئی جگہ بھی اس سے خالی نہیں۔

❀❀❀❀❀

وَلا یشغلهُ شأنٌ عَن شأن

ترجمہ......: اور اسے کوئی بھی کام کسی دوسرے کام سے غافل نہیں کرتا۔

تشریح......: اسے کوئی کام کسی دوسرے کام سے نہیں روکتا۔ وہ بیک وقت پیدا بھی کرتا ہے، رزق بھی دیتا ہے، زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ عزت بھی دیتا ہے اور ذلت بھی۔ محتاج بھی کرتا ہے اور غنی بھی۔ الغرض وہ اپنی مخلوقات کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور مخلوق کے برعکس اسے کوئی بھی کام کسی دوسرے کام سے مصروف نہیں کرتا۔ جبکہ مخلوق جب کسی کام میں مصروف ہو تو وہ بیک وقت کوئی دوسرا کام نہیں کرسکتی۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی کام کسی دوسرے کام سے غافل کردے کیونکہ وہ قدرت کاملہ اور علم کامل کا مالک ہے۔

❀❀❀❀❀

جَلَّ عَنِ الأشباهِ وَالأندادِ

ترجمہ......: وہ ہم مثل اور شریکوں سے عظیم تر، نہایت بلند رتبہ والا ہے۔

تشریح......: جَلَّ: یعنی اللہ سبحانہ کا معاملہ سب سے عظیم ہے۔ عن الأشباہ: یعنی وہ ہم مثل سے عظیم ہے اور مخلوق میں سے کوئی بھی چیز اس کے مشابہ نہیں۔

الأنداد: نِدٌّ کی جمع ہے اور یہ بھی مشابہ کے معنی میں ہے۔ تو معنی یہ ہوا کہ اللہ کے مشابہ، اس کا شریک اور اس کا ہمسر کوئی نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

وَتَنَزَّہَ عَنِ الصَّاحِبَۃِ وَالْأَوْلَادِ

ترجمہ......: اور وہ بیوی اور اولاد سے پاک ہے۔

تشریح......: الصاحبۃ سے مراد بیوی ہے۔

تنزہ: یعنی وہ پاک ہے بیوی سے۔

والأولاد: اللہ تعالیٰ اولاد سے بھی پاک ہے۔

کیونکہ وہ اپنی مخلوق سے بے نیاز ہے اور بیوی و اولاد کی ضرورت تو مخلوق کو ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ کمزور اور کسی مددگار کی محتاج ہوتی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے بے نیاز ہے۔ اسے بیوی اور اولاد کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اولاد اپنے والد کا حصہ ہوتی ہے اور اللہ جل و علا کا کوئی مثل، شریک اور ہمسر نہیں۔ اس کی مخلوق میں سے کوئی اس کی مثل نہیں۔ چنانچہ وہ مخلوق سے بے نیاز ہے اور اس نے اپنی کوئی اولاد نہیں بنائی۔ نہ تو اس نے کسی کو جنا اور نہ ہی کسی نے اس کو جنا اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس نے ان لوگوں کا ردّ کرتے ہوئے خود کو اولاد سے پاک قرار دیا جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے۔ مثلاً عیسائی سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کو، یہودی سیّدنا عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ﴾ (الانعام: ۱۰۱)

”اس کی اولاد کیسے ہوگی، جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں۔“

اور صاحبۃ کا معنی ہے: بیوی۔

اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہیں۔ یہ تو صرف مخلوق کے لائق ہے کہ وہ شادی، نسل اور اولاد کی محتاج ہوتی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ مخلوق سے بے نیاز ہیں۔ بلکہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی محتاج ہوتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝﴾ (مریم: ۸۸تا۹۵)

''اور انھوں نے کہا اللہ الرحمٰن نے کوئی اولاد بنا لی ہے۔ بلا شبہ یقیناً تم ایک بہت بھاری بات کو آئے ہو۔ آسمان قریب ہیں کہ اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ڈھے کر گر پڑیں۔ کہ انھوں نے اللہ الرحمٰن کے لیے کسی اولاد کا دعویٰ کیا۔ حالانکہ رحمٰن کے لائق نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمٰن کے پاس غلام بن کر آنے والا ہے۔ یقیناً اس نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور انھیں خوب اچھی طرح گن کر شمار کر رکھا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اس کے پاس اکیلا آنے والا ہے۔''

سب اس کے غلام اور بندے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اس کی اولاد نہیں۔ جیسا کہ کفار، مشرکین اور یہود و نصاریٰ جیسے گمراہ لوگ ایسا عقیدہ رکھتے ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَنفذ حُكمهَ فِي جميعِ الْعبادِ

ترجمہ......: تمام بندوں پر اس کا حکم لاگو ہوتا ہے۔

تشریح......: نفذ حکمہ: یعنی اس کی قضا و قدر (فیصلہ اور تقدیر) تمام بندوں پر چلتی ہے۔ یہاں حکم سے مراد حکم قدری ہے جو کہ تمام بندوں پر نافذ ہوتا ہے۔ چنانچہ کوئی بھی اس کے فیصلے اور تقدیر (قضاء و قدر) کے خلاف بغاوت نہیں کرسکتا۔ خواہ وہ مومن ہو یا کافر،

جاندار ہو یا بے جان۔ الغرض تمام مخلوقات پر اللہ کے تقدیری فیصلے اور حکم نافذ ہوتے ہیں۔ کوئی بھی اس کی مخالفت نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس سے کوئی جائے فرار ہے۔

❁❁❁❁❁

لَا تُمثلهُ العقولُ بِالتفكيرِ وَلَا تَتوَهمهُ الْقُلوبُ بِالتَّصْويرِ ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ o ﴾ (الشوریٰ : ۱۱)

ترجمہ......: عقلیں سوچ و بچار کرکے اس کی مثال پیش نہیں کرسکتیں اور دلوں کا وہم اس کی تصویر کشی نہیں کرسکتا۔ اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سمیع وبصیر ہے۔

تشریح......: (۱)...... (بڑے بڑے) عقل مند اپنی فکریں لڑا کر بھی اس کا کوئی نقشہ (مورتی) نہیں بنا سکتے اور دل اپنی قوت واہمہ کی مدد سے اس کی تصویر گری نہیں کرسکتے۔ کیونکہ نہ تو اس کی مثال اور شبیہ موجود ہے اور نہ ہی خود اس کے سوا کوئی دوسرا اس کی ذاتِ اقدس کو جانتا ہے کہ وہ اپنی ہیئت میں کیسا ہے؟ چنانچہ کسی کے لیے یہ تصور کرنا جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا ایسا ہے یا وہ فلاں فلاں کے مشابہ ہے۔ یہ نہ تو جائز ہے اور نہ ہی لوگوں کے لیے اپنے علم سے اللہ تعالیٰ کا احاطہ کرنا ممکن ہے۔

(۲)...... آیت ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ میں اللہ تعالیٰ سے مماثلت کی نفی کی گئی ہے۔ چنانچہ نہ تو کوئی اس کے مماثل ہے اور نہ ہی مشابہ اور ہمسر۔ کیونکہ وہ ہر چیز سے عظیم تر ہے۔ مزید برآں اس آیت میں نفی کے لیے استغراق ہے۔ اس لیے کہ نکرہ کو جب نفی کے سیاق میں ذکر کیا جائے تو وہ عام ہوجاتا ہے۔ چنانچہ تمام مخلوقات میں سے کوئی بھی عظمت، کبریائی، بے نیازی اور قدرت میں اس کے مشابہ نہیں۔ الغرض کوئی مخلوق بھی اللہ تعالیٰ سے مشابہت نہیں رکھتی۔

﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو سماعت و بصارت کے ساتھ متصف کیا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صفات باری تعالیٰ کا اثبات تشبیہ کا تقاضا نہیں

کرتا۔ جیسا کہ گمراہ لوگوں کا عقیدہ ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے مشابہت کی نفی کی ہے اور سماعت و بصارت کی صفات کو اپنے لیے ثابت کیا ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ صفات کے اثبات اور مشابہت کے درمیان خاصیت تلازم نہیں۔

اگرچہ ان صفات کے نام مخلوقات میں موجود ہیں۔ مثلاً سمع، بصر، کلام، قدرت، چہرہ اور ہاتھ وغیرہ۔ لیکن یہ صفات صرف مخلوق کے ساتھ خاص ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفات وہی ہیں جو اس کی ذات کے لائق ہیں اور مخلوقات کی صفات سے مشابہت نہیں رکھتیں۔ جو نام اور معنی کے اعتبار سے تو اگرچہ مخلوق کی صفات کے ساتھ متفق ہیں لیکن حقیقت اور کیفیت کے اعتبار سے کلی طور پر مختلف اور جدا ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا بیان

لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى وَالصِّفَاتُ الْعُلَا ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰىO لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰىO وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰىO﴾ (طه: ٥-٧)

ترجمہ......: اسی کے لیے ہیں اچھے اچھے نام اور بلند صفات ''وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اور جو زمین کے سب سے نچلے حصے میں ہے۔ اور اگر تو اونچی آواز سے بات کرے تو وہ تو پوشیدہ اور اس سے بھی پوشیدہ بات کو جانتا ہے۔''

تشریح......: مصنف کے قول ''لـهُ الأسماءُ الحُسنٰى'' میں اللہ تعالیٰ کے لیے ناموں کا اثبات ہے جیسا کہ اس نے خود اپنے لیے ان کا اثبات کیا ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (الاعراف: ١٨٠)

''اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں۔''

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (طٰهٰ: ٨)

''اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، سب سے اچھے نام اسی کے ہیں۔''

قرآنِ عظیم نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام ہیں اور یہ بھی بتلایا ہے کہ وہ تمام کے تمام اچھے ہیں۔ یعنی کامل واکمل ہیں اور ان میں کسی قسم کا نقص نہیں۔

والصفات الْعُلا ......: یعنی بلند صفات اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اور صفات سے مراد رحمت، علم، قدرت، ارادہ اور سمع وبصر وغیرہ ہیں۔ انھی چیزوں کو صفات کہا جاتا ہے۔

جہاں تک السمیع، البصیر، الخبیر وغیرہ کا تعلق ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے نام ہیں اور ان میں سے ہر ایک سے اللہ تعالیٰ کی ایک صفت مشتق ہوتی ہے۔ چنانچہ القدیر میں قدرت کا، السمیع میں سماعت کا، البصیر میں بصارت کا، العلیم میں علم کا اور الحکیم میں حکمت کا اثبات ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ہر نام، اس کی صفات میں سے کسی کو متضمن ہے۔ وہ تمام اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں جو اس نے خود اپنے لیے بیان کیے ہیں یا اس کے رسول ﷺ نے اس کے لیے بیان کیے ہیں۔ اور وہ تمام بلند و بالا اور عظمت کی صفات اسی کی ہیں جن سے کوئی چیز مشابہت نہیں رکھتی۔

مذکورہ آیات سورۃ طٰہٰ کی ابتدائی آیات ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تَنْزِيلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى﴾ (طٰه: ٤)

''اس کی طرف سے اتارا ہوا ہے جس نے زمین کو اور اونچے آسمانوں کو پیدا کیا۔''

یعنی قرآن اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور وہ اس کا کلام ہے۔

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰه: ٥)

''وہ بے حد رحم والا، عرش پر بلند ہوا۔''

یہ آیت مبارکہ ان سات آیات میں سے ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش پر استواء حقیقی کو ثابت کیا ہے۔ جیسا کہ اس کے جلال کے لائق ہے اور وہ ہے اس کا عرش پر بلند ہونا۔ عرش اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔

استوی کا معنی ہے: اللہ عزوجل نے قرار پکڑا، وہ بلند ہوا، اس پر چڑھا اور اُس نے اس پر قرار پکڑا۔ لیکن یہ تمام معانی ویسے ہی سمجھے جائیں گے جیسے اللہ تعالیٰ کی عظمت کے لائق ہیں۔ نہ کہ مخلوق کے مخلوق پر قرار پکڑنے، بلند ہونے اور چڑھنے کی طرح۔ کیونکہ مخلوق اپنی اس ضرورت کی وجہ سے کسی چیز پر چڑھ بیٹھتی ہے کہ کہیں وہ گر نہ جائے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کو عرش اور آسمانوں کی کوئی حاجت نہیں بلکہ عرش اور آسمان اس کے محتاج ہیں۔ کیونکہ اس نے ان کو

پیدا کیا اور انھیں اُس نے تھاما ہوا ہے۔ چنانچہ یہ تو اللہ کے محتاج ہیں مگر اللہ کو ان کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا مخلوق کے مخلوق پر ٹھہرنے کے مشابہ نہیں۔ اگرچہ خالق و مخلوق کے استواء کا معنی ایک ہے لیکن کیفیت اور حقیقت مختلف ہے۔

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ ......: اللہ تعالیٰ نے سات آیات میں یہی خبر دی ہے۔ ان سب میں "استوی علی العرش" کے الفاظ وارد ہیں (اعراف:۷، یونس:۳، رعد:۲، فرقان:۵۹، سجدہ:۴، حدید:۵۷)

سورۂ طٰہٰ میں یہ الفاظ ہیں:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ (طٰہٰ : ٥)

"وہ بے حد رحم والا، عرش پر بلند ہوا۔"

﴿لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ﴾ ......: یعنی ساتوں آسمانوں میں فرشتے وغیرہ جو بھی مخلوقات ہیں وہ اسی کے لیے ہیں۔

﴿وَ مَا فِی الْاَرْضِ﴾ ......: یعنی زمین کی تمام مخلوقات، آدمی، چوپائے، جن، انسان، حیوانات، پرندے، زمین پر رینگنے والی، چلنے والی اور پائی جانے والی ہر مخلوق اللہ کی ملکیت ہے۔ وہی ان میں تصرف اور تدبیر کرتا اور انھیں رزق دیتا ہے۔

﴿وَ مَا بَیْنَهُمَا﴾ ......: یعنی آسمانوں اور زمین کے درمیان پائی جانے والی وہ مخلوقات بھی جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اسی کی ملکیت ہیں۔

﴿وَ مَا تَحْتَ الثَّرٰی﴾ ......: اور سطح زمین کے نیچے جو بھی مخلوقات، معدنیات اور مردے ہیں سب کے سب اللہ کی ملکیت ہیں اور اسی نے ان سب کو پیدا کیا۔

﴿وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ یَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰی﴾......: اللہ تعالیٰ کے علم میں ظاہر و پوشیدہ سب برابر ہے۔ وہ ظاہر کو بھی سنتا ہے اور پوشیدہ کو بھی۔

﴿وَاَخْفٰی﴾ ......: یعنی پوشیدہ سے پوشیدہ تر چیز بھی اس پر مخفی نہیں۔

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ ......: یعنی اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں۔

﴿لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ ......: یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور ان سب کے اچھا ہونے کا اثبات ہے اور حسنیٰ سے مراد ہے کامل اور ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک۔

❀❀❀❀❀

أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْئٍ عِلْمًا وَقَهَرَ كُلَّ مَخْلُوقٍ عِزَّةٌ وَّحكمًا

ترجمہ......: اس نے ہر چیز کو علم کے اعتبار سے گھیر رکھا ہے اور حکومت اور غلبہ کے اعتبار سے ہر مخلوق پر غالب ہے۔

تشریح......: أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْئٍ عِلْمًا: یعنی اس کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے خواہ وہ ہو چکی ہے یا ہونے والی ہے۔ ماضی میں تھی یا مستقبل میں ہوگی۔ اور اس زمانے کی چیزوں کا بھی جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ہر چیز اس کے علم میں ہے اور جو چیز بھی وجود میں آئے گی اس کے علم میں ہے۔

قَهْرَ كُلَّ مَخْلُوقٍ ......: یعنی اس نے ہر مخلوق کو اپنے غلبہ کی وجہ سے جھکا دیا ہے۔ اس سے کوئی مخلوق مستثنیٰ نہیں خواہ وہ غنی ہوں یا فقیر، بادشاہ ہوں یا غلام، فرشتے ہوں یا انبیاء و رسل، تمام مخلوقات اس کے تصرف، غلبہ اور تدبیر کے تحت مغلوب ہیں اور کوئی اس کے غلبہ سے نکل نہیں سکتا۔

چنانچہ اس میں ان بے دین صوفیاء کا ردّ ہوتا ہے جن کا وہم ہے کہ بعض اولیاء اور قطب کائنات میں تصرف کرتے ہیں۔

عزۃ سے مراد ہے قوت۔ اور حکمًا: سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز اس کے حکم کے تابع ہے۔ وہ اس میں تصرف کرتا ہے اور کوئی چیز اس کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتی۔

❀❀❀❀❀

وَوَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ رَحْمَةً وَّعِلْمًا: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا﴾

ترجمہ......: اور اس نے رحمت اور علم کے اعتبار سے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ ''وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

تشریح......: اور اس نے رحمت وعلم کے اعتبار سے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (الاعراف: ١٥٦)

''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے۔''

اور اس کے علم نے بھی ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ: ١١٠)

''وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

چنانچہ کوئی چیز اس کے علم سے مخفی نہیں اور اس کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ بخلاف مخلوق کے۔ وہ اگر کسی چیز کا علم رکھتی ہے تو بہت سی چیزوں سے جاہل ہوتی ہے۔ جبکہ اللہ جل وعلا ہر چیز کو جانتا ہے۔ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں اور اس کی رحمت نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس اعتبار سے کفار کو بھی محیط ہے کہ وہ انھیں رزق دیتا اور ان سے درگزر کرتے ہوئے ہر وہ چیز عطا کرتا ہے جس کی انھیں ضرورت ہوتی ہے۔

اس کی رحمت حیوانات کو بھی پہنچتی ہے اور وہ اللہ کی رحمت کے سائے میں ہی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ ان پر عنایات کرتا، انھیں رزق عطا کرتا، ان سے درگزر کرتا ہے۔ انھیں بیماریوں سے شفا بخشتا ہے اور ان کے دلوں میں اولاد کی شفقت ڈالتا ہے۔ چنانچہ وہ اللہ کی رحمت سے ہی اپنی اولاد پر شفقت کرتے ہیں۔ حالانکہ انھیں اپنی اولاد سے کسی فائدے کی

امید نہیں ہوتی۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کی اس رحمت کا ہی مظہر ہے جس نے حیوانات، مومنین اور کفار سب کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ یہ تو دنیا میں اللہ کی رحمت کا معاملہ ہے۔ لیکن آخرت میں اس کی رحمت صرف مومنین کے ساتھ خاص ہے۔ لہٰذا کفار کو آخرت میں اللہ کی رحمت کی کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ﴾ ......: یعنی وہ گزری ہوئی باتوں کو جانتا ہے۔

﴿وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ ......: یعنی وہ مستقبل کی باتوں کو بھی جانتا ہے۔

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ: ۱۱۰)......: یعنی بندے اپنے علم سے اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ اس معنی میں اپنے رب کو نہیں جانتے کہ وہ اس کی ذات، شان اور اسماء وصفات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اور یہ چیزیں وہ صرف اسی قدر جان سکتے ہیں جس قدر اللہ تعالیٰ نے انھیں اطلاع دی ہے۔ تاکہ وہ اس کو پہچان کر فقط اسی کی عبادت کریں۔ لہٰذا وہ اللہ کے سکھلائے ہوئے علم کے علاوہ کچھ نہیں جانتے حتیٰ کہ فرشتے بھی پکار اٹھے:

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾

''اے رب تو پاک ہے ہمیں صرف وہی معلوم ہے جو تو نے ہمیں سکھلایا۔''

❀❀❀❀❀

مَوْصُوفٌ بِمَا وَصَفَ بِهِ نَفْسَهُ فِيْ كِتَابِهِ الْعَظِيمِ، وَعَلَى لِسَانِ نَبِيِّهِ الْكَرِيمِ:

ترجمہ......: وہ ان اوصاف کے ساتھ متصف ہے جو اس نے اپنی عظیم کتاب میں بیان کیے اور اپنے نبی کریم ﷺ کے ذریعے بتلائے ہیں۔

تشریح......: وہ ان اوصاف کے ساتھ متصف ہے جو اس نے اپنی کتاب قرآن کریم میں اور اس کے نبی مکرم ﷺ نے اپنی سنت میں بیان فرمائے ہیں۔ چنانچہ اللہ کے اسماء وصفات توقیفی ہیں۔ اور ہمارے لیے جائز نہیں کہ اسے کسی ایسے نام سے پکاریں یا ایسی صفت کے ساتھ متصف کریں جو قرآن وسنت سے ثابت نہیں۔ یہی معنی ہے قولِ مصنف:

مَوْصُوْفٌ بِمَا وَصَفَ بِهِ نَفْسَهُ فِيْ كِتَابِهِ الْكَرِيْمِ وَبِمَا وَصَفَهُ بِهِ نَبِيُّهُ الْعَظِيْمُ ﷺ:

کیونکہ اللہ ربّ العالمین کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والا خود اللہ عزوجل ہے اور اس کے بعد سب سے زیادہ جاننے والا، اللہ کا رسول ہے ﷺ۔ لہٰذا ہم صرف اتباع کریں گے اور اپنی طرف سے اپنی عقل و پسند کی بنیاد پر کچھ نہیں کہیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں یہ ممنوع ہے۔

❀❀❀❀❀

وَكُلُّ مَا جَاءَ فِي الْقُرْاٰنِ أَوْصَحَّ عَنِ الْمُصْطَفٰى ﷺ مِنْ صِفَاتِ الرَّحْمٰنِ وَجَبَ الْإِيْمَانُ بِهِ وَتَلَقِّيهِ بِالتَّسْلِيْمِ وَالْقُبُوْلِ وَتَرْكُ التَّعَرُّضِ لَهُ بِالرَّدِّ وَالتَّأْوِيْلِ، وَالتَّشْبِيْهِ وَالتَّمْثِيْلِ:

ترجمہ......: اللہ تعالیٰ کی جو صفات قرآن کریم میں وارد ہیں، یا رسول کریم ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں ان پر ایمان لانا، کامل اطاعت و فرمانبرداری سے انھیں قبول کرنا، ان کی تردید، تاویل، تشبیہ اور تمثیل کی کوشش کو ترک کرنا واجب ہے۔

تشریح......: یہ ماقبل جملہ کی ہی وضاحت ہے جو کچھ بھی قرآن کریم سے اور نبی کریم ﷺ سے صحیح سند سے ثابت ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے۔

پس ہم اسماء وصفات کا اسی طرح اثبات کریں گے جیسے اللہ اور اس کے رسول نے کیا ہے اور ہم اپنی عقل، سوچ اور باہمی مشاورت سے کوئی چیز اس میں داخل نہیں کریں گے۔ کیونکہ یہ ایک توقیفی چیز ہے اور ہمارے لیے اس میں اضافہ کرنا جائز نہیں۔ ہم پر تو صرف تسلیم و رضا اور ایمان واجب ہے۔ ایک بندۂ مومن کی یہی صفت ہے۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ کی اپنی کتاب میں اور رسول اللہ ﷺ کی اپنی احادیث میں بیان کردہ صفات الٰہی میں کوئی فرق نہیں۔

صحیح احادیث میں وارد اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر ایمان لانا اسی طرح واجب ہے جیسا کہ قرآن کریم میں وارد اسماء وصفات پر۔ بخلاف ان گمراہ لوگوں کے جو تمام احادیث کو یا

اخبار آحاد کو حجت نہیں مانتے۔ کیونکہ یہ گمراہی کا راستہ ہے۔

لٰہذا اللہ تعالیٰ کے جو اسماء و صفات رسول اکرم ﷺ سے صحیح ثابت ہیں ان پر ایمان لانا اور انھیں تسلیم کرنا واجب ہے۔ خواہ وہ متواتر احادیث سے ثابت ہوں یا اخبار آحاد سے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پاک ہے:

﴿وَ مَا آتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾

(الحشر: ۷)

''اور رسول تمھیں جو کچھ (شرعی امور میں سے) دے وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ۔''

دوسری جگہ پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰیo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰیo﴾ (النجم: ۳۔۴)

''اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے۔ وہ تو (جو ہمارا پیغمبر بولتا ہے) صرف وحی ہے جو نازل کی جاتی ہے۔''

چنانچہ اسماء و صفات کے باب میں رسول اللہ ﷺ سے جو بھی صحیح ثابت ہے اس پر ایمان لانا، اس کی تصدیق کرنا، اللہ کو اس نام سے پکارنا اور اس صفت سے متصف ماننا اسی طرح واجب ہے جس طرح قرآن کریم میں وارد اسماء و صفات کے ساتھ۔ اور ان میں کوئی فرق نہیں، جو ان میں فرق کرے گا وہ گمراہ اور رسول اکرم ﷺ کی تکذیب کرنے والوں میں سے ہوگا اور جس نے نبی کریم محمد رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی وہ کافر ہے۔

تَـلْقِیـہ......: اس کا معنی ہے اس کو قبول کرنا، حفظ کرنا، روایت کرنا، بیان کرنا۔ اور بغیر کسی اعتراض کے قبول کرنا واجب ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ہے اور اس بارے میں ہمارا روّیہ تسلیم و قبول والا ہونا چاہیے۔ نہ کہ گمراہ لوگوں کی طرح اس پر اعتراض کرنا اور اپنی عقل و فکر کی بنیاد پر اس میں اضافہ کرنے کا۔

تَرْكُ التّعرضِ ......: یعنی اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے باب میں جو کچھ کتاب اللہ

یا سنت رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اس کی تردید و انکار نہ کرنا۔ جیسا کہ گمراہ لوگ کہتے ہیں: ''ہم سنت کو حجت مانتے ہیں اور نہ ہی اخبار آحاد کو''۔ یہ اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کی بیان کردہ باتوں کی تردید اور قرآن کے کچھ حصے پر ایمان لانے اور کچھ کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔

بعض لوگ کتاب وسنت کے الفاظ کا تو انکار نہیں کرتے لیکن معانی کا انکار کرتے ہیں۔ وہ یوں کہ تاویل کا راستہ اختیار کرتے ہوئے وہ اس کی غلط تفسیر کرتے ہیں۔ یہی معنی کا انکار ہے جو کہ لفظ کے انکار کی طرح ہی ہے۔

چنانچہ ایسے لوگ دو میں سے ایک راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یا تو وہ سرے سے نص کا ہی انکار کرتے ہیں اور اسے بالکل قبول ہی نہیں کرتے۔ یا نص کو بظاہر تو قبول کرتے ہیں لیکن اس کی تاویل کرتے ہوئے اس کو صحیح معنی سے پھیر کر اپنی خواہشات، تصورات، منطقی اور کلامی قواعد اور اپنی نام نہاد عقل کے مطابق بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ نصوص کو اپنی عقلوں اور انسانی اصطلاحات کے تابع کر دیتے ہیں اور یہ درحقیقت کتاب وسنت پر ایمان کے منافی ہے۔

ہم پر واجب ہے کہ کتاب وسنت پر لفظاً اور معناً ایمان لائیں یعنی ان کے الفاظ اور معانی دونوں کو قبول کریں۔ معطلہ اور مؤولہ جیسے گمراہ فرقوں کی طرح ان کی تاویل وتحریف اور غلط تفسیر نہ کریں۔

والتأویل ......: یہ ایک گروہ کا مذہب ہے۔

والتشبیـــــہ ......: یہ ایک دوسرے گروہ کا مذہب ہے جو کہ لفظ اور معنی دونوں مانتے تو ہیں لیکن اللہ کو اس کی مخلوق کے مشابہ کر دیتے ہیں۔ ان کو مُشَبِّہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کو مخلوق کے اسماء وصفات سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ غالی قسم کے لوگ ہیں جو اثبات میں غلو کرتے ہیں۔

اور پہلی قسم کے لوگ معطلہ ہیں جنھوں نے تنزیہہ اور نفی میں غلو کیا۔ یہ دونوں فرقے راہ حق اور صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں۔ سیدھا راستہ وہ ہے جس پر اہل سنت والجماعت سلفی

اہل حق گامزن ہیں۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے ثابت ہے اسے تحریف، تعطیل، تکییف، تشبیہ اور تمثیل کے بغیر ماننا۔

یہی وہ سیدھا راستہ ہے جس پر اہل حق قائم ہیں اور جو لوگ ان کے مخالف ہیں مثلاً مُعَطِّلہ، مُشَبِّہ، مُمَثِّلہ وغیرہم۔ وہ گمراہ اور باطل ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَمَا أَشْكَلَ مِنْ ذَالِكَ وَجَبَ اِثْبَاتُهُ لَفْظًا وَتَرْكُ التَّعَرُّضِ لِمَعْنَاهُ وَنَرُدُّ عِلْمَهُ عَلَى قَائِلِهِ، وَنَجْعَلُ عُهْدَتَهُ عَلَى نَاقِلِهِ، اِتِّبَاعًا لِطَرِيْقِ الرَّاسِخِيْنَ فِي الْعِلْمِ الَّذِيْنَ أَثْنَى اللّٰهُ عَلَيْهِمْ فِيْ كِتَابِهِ الْمُبِيْنِ، بِقَوْلِهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى: ﴿وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ (آل عمران: ٧)

ترجمہ......: اور ان میں سے جو اشکال پیدا کریں ان کو لفظاً ثابت کرنا اور ان کے معنی کے پیچھے نہ پڑنا واجب ہے۔ ہم اس کا علم اس کے کہنے والے کی طرف لوٹا دیں گے اور اس کی ذمہ داری اس کو نقل کرنے والے پر ڈالیں گے، علم میں پختہ کار لوگوں کی پیروی کرتے ہوئے جن کی اللہ تعالیٰ نے یہ کہتے ہوئے اپنی کتاب مبین میں تعریف فرمائی ہے: ''اور جو علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔''

تشریح......: یہ جملہ شیخ رحمہ اللہ کی طرف سے غیر تسلیم شدہ ہے۔ گویا کہ اس میں انھوں نے صفات کے دلائل کی دو قسمیں کی ہیں۔

پہلی قسم......: جس کا معنی اور تفسیر ہم پر ظاہر ہو جائے۔ اس کے الفاظ پر بھی ہم ایمان لائیں گے اور اس کی تفسیر اور معنی پر بھی۔

دوسری قسم......: جس کا معنی ہمارے لیے ظاہر نہ ہو۔ تو اس کو ہم اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں گے۔ اور یہ غلط ہے کیونکہ اسماء و صفات کی تمام نصوص کے معانی معلوم ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی مشتبہ اور متشابہ نہیں۔ اسماء و صفات کی نصوص میں سے کوئی بھی متشابہ نہیں اور نہ ہی

متشابہ میں داخل کی جائے گی۔ جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے سلف اور معتبر علماء میں سے کسی کے کلام میں نہیں پایا کہ تمام اسماء وصفات یا ان میں سے کچھ ایسے متشابہ ہیں جن کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

چنانچہ اسماء و صفات کی تمام نصوص محکم ہیں۔ ان کے معانی معلوم ہیں۔ ان کی وضاحت وتشریح کی جائے گی اور ان میں کوئی بھی ایسا متشابہ نہیں جس کا معنی معلوم نہ کیا جاسکے۔ جیسا کہ مصنف رحمہ اللہ نے یہاں فرمایا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ اس نے جو کتاب نازل کی ہے اس میں محکم آیات بھی ہیں جو اصل کتاب ہیں اور کچھ متشابہات بھی ہیں۔ تو اس جگہ متشابہات اور محکمات سے کیا مراد ہے؟

اس بارے میں اہل علم فرماتے ہیں:

مُحْکَم: وہ لفظ ہوتا ہے جس کا معنی واضح اور وہ اپنی تفسیر میں غیر کا محتاج نہ ہو۔

متشابہ: وہ لفظ ہوتا ہے جو اپنی تفسیر اور معنی کی وضاحت میں اپنے غیر کا محتاج ہو۔ ان میں سے بھی بعض نصوص ایسی ہیں جو مشکل تو ضرور ہیں لیکن جب انھیں دوسری نصوص کے ساتھ ملایا جائے جو ان کی وضاحت کرتی ہوں تو اشکال ختم ہوجاتا ہے اور حق واضح ہوجاتا ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ یہ عام وخاص، مطلق ومقید، ناسخ ومنسوخ اور مجمل ومفصل وغیرہ ہیں۔ محکم ومتشابہ کا یہی معنی ہے۔

اور ایسی نصوص قرآن کریم میں بھی موجود ہیں اور احادیث رسول ﷺ میں بھی۔ جو مشکل ہوتی ہیں اور انھیں دوسری نصوص کی طرف لوٹایا جاتا ہے کیونکہ کلام اللہ اور کلام نبوی کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔

اَلْاُمَّ: اس اصل کو کہتے ہیں جس کی طرف رجوع کیا جائے۔

وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ: یعنی وہ نصوص کہ اگر وہ اکیلی ہوں تو ان کا معنی مشکل ہو اور جب

انھیں محکم نصوص کی طرف لوٹایا جائے تو واضح ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ پختہ علم والے لوگ متشابہ کو محکم کی طرف لوٹاتے ہیں اور کلام اللہ کی کلام اللہ سے اور کلام رسول ﷺ سے تفسیر کرتے ہیں۔ یا کلام اللہ کی سنت رسول اللہ ﷺ سے اور سنت رسول اللہ ﷺ کی کلام اللہ سے تفسیر کرتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک اللہ کی طرف سے ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں:

﴿اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ (آل عمران : ۷)

''ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔''

یعنی محکم اور متشابہ سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ لیکن جو گمراہ ہیں وہ متشابہات سے استدلال کرتے اور محکم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنی بدنیتی کی وجہ سے متشابہ کو محکم کی طرف نہیں لوٹاتے۔ ﴿ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ﴾ (آل عمران : ۷) یعنی لوگوں کو ان کے دین کے بارے میں فتنہ میں ڈالنے کے لیے وہ ایسا کرتے ہیں۔

اور کہتے ہیں: دیکھو یہ کلام اللہ ہے اور یہ کلام رسول ہے۔ یہ کہہ کر لوگوں کو فتنے میں ڈالتے ہیں اور جب وہ لوگوں کے سامنے کوئی متشابہ آیت یا حدیث لے کر آتے ہیں تو کہتے ہیں: یہ کلام اللہ ہے اور یہ حدیث رسول ﷺ، اب تمھارا کیا خیال ہے؟ یوں وہ لوگوں کو تذبذب کا شکار کردیتے ہیں کہ وہ کلام اللہ کو لیں یا حدیث رسول اللہ ﷺ سے استدلال کریں؟ یوں لوگ فتنہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

مثال کے طور پر! بعض جاہل لوگ کوئی متشابہہ حدیث تلاش کرتے ہیں اور پھر اسے لوگوں کے سامنے پیش کرکے کہتے ہیں: کیا ہم اس حدیث سے استدلال کریں؟ اور لوگوں کو تشویش میں ڈالتے ہیں کہ وہ حق پر نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ احادیث جو وہ لاتے ہیں اہل علم پر مخفی نہیں ہوتیں۔ علماء کرام ان کی وضاحت کر بھی چکے ہیں لیکن یہ لوگ نصوص کو ایک دوسری سے کاٹ دیتے ہیں۔

﴿وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ﴾ (البقرہ : ۲۷)

''اور اس چیز کو قطع کرتے ہیں جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا کہ اسے ملایا جائے۔''

گمراہ لوگوں کا ہر دور میں یہی طریقہ رہا ہے کہ وہ کلام اللہ کے حصوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے اور کلام نبوی کے حصوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کلام اللہ اور کلام رسول ﷺ سے استدلال کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں: نہیں! تم نے کلام اللہ اور کلام رسول اللہ ﷺ سے استدلال کیا ہی نہیں۔ اگر تم قرآن و حدیث دونوں سے استدلال کرتے تو تم متشابہ کو محکم کی طرف لوٹاتے۔ لیکن تم ایک حصے کو تو لیتے ہو اور دوسرے کو ترک کردیتے ہو۔ یہ نہ تو کلام اللہ سے استدلال ہے اور نہ ہی کلام رسول اللہ ﷺ سے۔

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (آل عمران : ۷)

''پھر جن لوگوں کے دلوں میں تو کجی ہے وہ اس میں سے ان کی پیروی کرتے ہیں جو کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں، فتنے کی تلاش کے لیے اور ان کی اصل مراد کی تلاش کے لیے، حالانکہ ان کی اصل مراد نہیں جانتا مگر اللہ۔''

گمراہ لوگوں کا ہمیشہ سے ہی یہ طریقہ رہا ہے۔

❁❁❁❁❁

تاویل کی قسمیں

تاویل کی درج ذیل قسمیں ہیں:

پہلی قسم...... : تاویل سے مراد تفسیر اور معنی کی وضاحت ہے۔ متقدمین مثلاً ابن جریر وغیرہ رحمہم اللہ کے ہاں یہی تاویل معروف تھی۔ وہ تفسیر کو تاویل کا نام دیتے تھے۔ اس صورت میں "اَلرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" معطوف ہوگا لفظ جلالہ پر۔

اور معنی یہ ہوگا: ''نہیں جانتے اس کی تفسیر کو مگر اللہ تعالیٰ اور پختہ علم والے لوگ۔'' یعنی کچے علم والوں کے برعکس پختہ علم والے متشابہات کی تفسیر کو جانتے ہیں۔ کیونکہ کچے علم والے تو محکم اور متشابہ کا معنی بھی نہیں جانتے۔ بعض قراء کی قراءت میں وقف ''فی العلم'' پر ہے اور معنی یہ ہوگا: ''اللہ تعالیٰ بھی اس کو جانتا ہے جو اس نے نازل کیا ہے اور پختہ علم والے بھی۔'' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں انبیاء کا وارث ہونے کی وجہ سے یہ سکھلایا ہے۔ رہے متعلّم اور مبتدی تو وہ اس درجہ کو نہیں پہنچتے۔

تاویل کا دوسرا معنی:

''اس حقیقت کی پہچان ہے جس کی طرف مستقبل میں چیز لوٹے۔'' اس صورت میں لفظ اللہ جلالہ پر وقف متعین ہو جاتا ہے۔

﴿وَ مَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (آل عمران : ۷)

''حالانکہ ان کی اصل مراد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

کیونکہ وہ چیزیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذکر کیا ہے مثلاً جنت، جہنم، احوال قیامت، مستقبل کے حالات وغیرہ ان کی حقیقت اور کیفیت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اسی طرح اسماء وصفات کی کیفیت اور حقیقت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ چنانچہ اس صورت میں

لفظ جلالہ پر وقف متعین ہو جاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ﴾ میں تاویل اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ تو صرف اس چیز کا انتظار کر رہے ہیں جس کی طرف دنیا مستقبل میں لوٹے گی۔ ﴿يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ﴾ یعنی اس دن اس کی وہ حقیقت اور کیفیت واقع ہو جائے گی جس کی اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ:

﴿يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ﴾ (الاعراف: ۵۳)

"تو وہ لوگ جنھوں نے اس سے پہلے اسے بھلا دیا تھا، کہیں گے: یقیناً ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے، تو کیا ہمارے لیے کوئی سفارش کرنے والے ہیں کہ وہ ہمارے لیے سفارش کریں۔ یا ہمیں واپس بھیجا جائے تو ہم اس کے برخلاف عمل کریں جو ہم کیا کرتے تھے۔"

جب وہ قیامت کے دن ان غیبی حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے جن کی اللہ تعالیٰ نے انھیں خبر دے رکھی ہے تو وہ جان لیں گے کہ انھوں نے غلطی اور کوتاہی کی اور بے کار زندگی گزار دی۔ پھر وہ دنیا میں واپس آنے اور کسی سفارشی کی تمنا کریں گے۔

اسی طرح یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب یوسف نے اپنے والدین کو عرش پر بٹھا لیا اور بھائی سجدے میں گر گئے تو فرمایا:

﴿وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؗ﴾

(یوسف: ۱۰۰)

"اور اس نے کہا: اے میرے باپ! یہ میرے پہلے کے خواب کی تعبیر ہے۔ بے شک میرے رب نے اسے سچا کر دیا۔"

یعنی یہ میرے اس خواب کی (جو میں نے پہلے دیکھا تھا) حقیقت اور انجام ہے اور اب

وہ واقع ہوا اور واضح ہو گیا ہے۔ کیونکہ سورۃ کے شروع میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ رَاَیۡتُہُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ﴾ (یوسف: ٤)

”اے میرے باپ! بے شک میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے، میں نے انھیں دیکھا کہ مجھے سجدہ کرنے والے ہیں۔“

اور اس خواب کی تاویل بڑے لمبے عرصے کے بعد واقع ہوئی جب آپ مصر کے بادشاہ بن گئے۔ اور آپ کے والدین اور بھائی آپ کے پاس آئے۔

﴿فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰی یُوۡسُفَ اٰوٰۤی اِلَیۡہِ اَبَوَیۡہِ وَ قَالَ ادۡخُلُوۡا مِصۡرَ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیۡنَ ۝ وَ رَفَعَ اَبَوَیۡہِ عَلَی الۡعَرۡشِ وَ خَرُّوۡا لَہٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ یٰۤاَبَتِ ہٰذَا تَاۡوِیۡلُ رُءۡیَایَ مِنۡ قَبۡلُ ۫ قَدۡ جَعَلَہَا رَبِّیۡ حَقًّا ؕ وَ قَدۡ اَحۡسَنَ بِیۡۤ اِذۡ اَخۡرَجَنِیۡ مِنَ السِّجۡنِ وَ جَآءَ بِکُمۡ مِّنَ الۡبَدۡوِ مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ نَّزَغَ الشَّیۡطٰنُ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَ اِخۡوَتِیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَطِیۡفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ۝﴾ (یوسف: ٩٩۔١٠٠)

”پھر جب وہ یوسف کے پاس داخل ہوئے تو اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں داخل ہو جاؤ، امن والے، اگر اللہ نے چاہا۔ اور اس نے اپنے ماں باپ کو تخت پر اونچا بٹھایا اور وہ اس کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑے اور اس نے کہا: اے میرے باپ! یہ میرے پہلے کے خواب کی تعبیر ہے۔ بے شک میرے رب نے اسے سچا کر دیا اور بے شک اس نے مجھ پر احسان کیا جب مجھے قید خانے سے نکالا اور تمھیں صحرا سے لے آیا۔ اس کے بعد کہ شیطان نے میرے درمیان اور میرے بھائیوں کے درمیان جھگڑا ڈال دیا۔ بے شک میرا رب جو چاہے اس کی بہترین تدبیر کرنے والا ہے، بلاشبہ وہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔“

﴿الْعَرْشِ﴾......: بادشاہ کی کرسی اور بیٹھنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

﴿وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا﴾......: (اور وہ آپ کے لیے سجدے میں گر گئے) یہ سجدۂ تحیہ وسلام تھا۔ یہ ان کی شریعت میں جائز تھا۔ ہماری شریعت میں اسے منسوخ کر کے مخلوق کو سجدہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

یہ تھی حقیقت آپ کے پہلے دیکھے ہوئے خواب کی۔ قرآن کریم میں بیان کردہ لفظ تاویل کا یہی معنی ہے، جس کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم......: معنی کی پہچان۔

دوسری قسم......: اس حقیقت اور کیفیت کی پہچان جس کی طرف مستقبل میں چیز لوٹے۔

پہلی قسم کی تاویل کو علماء جانتے ہیں۔ لیکن دوسری قسم کی تاویل کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

تیسری قسم......: تاویل کا ایک کا تیسرا جدید بدعتی معنی بھی ہے جسے علماء کلام نے ایجاد کیا ہے۔ وہ بزعم خویش تاویل کی تعریف یہ کرتے ہیں:

> ''لفظ کو اس کے ظاہر سے کسی دوسرے معنی کی طرف اس سے متصل کسی دلیل کی بنیاد پر پھیرنا۔''

لیکن کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں اس تاویل کی کوئی اصل نہیں۔ یہ محض ایک اصطلاح ہے جو انھوں نے گھڑ لی ہے۔ اسی لیے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کی قدرت کے ساتھ، اس کے چہرے کی ذات کے ساتھ، رحمت کی ارادۂ انعام کے ساتھ، غصے کی ارادۂ انتقام کے ساتھ، اترنے اور آنے کی اس کے حکم کے اترنے اور آنے کے ساتھ تاویل کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ لفظ کو پھیر دیتے ہیں اور اس کی تفسیر اس کے اصلی معنی سے ہٹ کر کرتے ہیں۔ یہ ایک مذموم تاویل اور بدعتی اصطلاح ہے۔

صحیح تاویل:

وہ ہے جس کا قرآن کریم میں ذکر ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں جنھیں ہم نے پہلے بیان کردیا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے دلوں میں ٹیڑھ پن ہے تو وہ متشابہ کو لے لیتے ہیں اور اسے محکم کی طرف نہیں لوٹاتے۔ یوں وہ متشابہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور محکم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں: ہم نے قرآن سے استدلال کیا ہے۔

چنانچہ خوارج کہتے ہیں آیت مبارکہ:

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا۝﴾

(الجن: ۲۳)

''اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کی نافرمانی کرے گا تو یقیناً اسی کے لیے جہنم کی آگ ہے، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں ہمیشہ۔''

اس بات پر دلیل ہے کہ گناہ گار کافر ہے اور مـخلّد فِی النّار (ہمیشہ جہنم میں رہنے والا) ہے۔

لیکن وہ اس آیت کو درج ذیل ارشادات باری تعالیٰ کی طرف نہیں لوٹاتے۔

۱ .... ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (النساء: ٤٨)

''بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا۔''

۲ .... ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا۝﴾ (النساء: ۳۱)

''اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تم سے تمھاری چھوٹی برائیاں دور کر دیں گے اور تمھیں باعزت داخلے کی جگہ میں داخل کریں گے۔''

اسی طرح وہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی:

((لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ .))[1]

''تم میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔''

اور قول باری تعالیٰ:

﴿وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا﴾

(النساء: ۹۳)

''اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والا ہے۔''

کو لے کر کافر قرار دے دیتے ہیں اور درج ذیل ارشادات باری تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے:

۳.... ﴿وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ o اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ o﴾ (الحجرات: ۹ تا ۱۰)

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ مومن تو (باہم) بھائی

[1] سیّدنا ابوبکرہ کی حدیث کا ٹکڑا ہے جو بخاری (۴۴۰۶) اور مسلم (۱۶۷۹) میں ہے۔

بھائی ہیں۔ پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے باہمی قتال کرنے والوں کو مومن کہا ہے۔ ان کے درمیان صلح کرانے کا حکم دیا ہے اور انھیں ہمارا بھائی کہا ہے حالانکہ وہ آپس میں قتال کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ دلیل ہے اس بات کی کہ قاتل کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ اور جب قصاص کا ذکر کیا تو فرمایا:

﴿فَمَنۡ عُفِيَ لَهٗ مِنۡ اَخِيۡهِ﴾ (البقرہ: ۱۷۸)

”پھر جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معاف کر دیا جائے۔“

درج بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے مقتول کو قاتل کا بھائی کہا ہے۔ یعنی ”اخیه القتيل“۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ قاتل کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ وہ ایمان کی بنیاد پر مقتول کا بھائی ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ﴾ (الحجرات: ۱۰)

”مومن تو بھائی ہی ہیں۔“

پتہ چلا کہ گمراہ لوگ قرآن و سنت کے ایک حصے کو تو لیتے ہیں اور وہ ہے متشابہ۔ لیکن دوسرے حصے کو جو اس کی تشریح اور وضاحت کرتا ہے فتنہ پیدا کرنے اور لوگوں کو راہ حق سے ہٹانے کی غرض سے چھوڑ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں: ”ہم قرآن و حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔“ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے قرآن و حدیث سے کبھی استدلال نہیں کیا۔ کیونکہ جو استدلال وہ کرتے ہیں وہ صحیح استدلال نہیں۔ بلکہ یہ نصوص کو ایک دوسرے سے کاٹنے کے مترادف ہے اور یہ باطل استدلال ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ وَ يَقۡطَعُوۡنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ وَ يُفۡسِدُوۡنَ فِي الۡاَرۡضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ۝﴾

(البقرہ: ۲۷)

''وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو، اسے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اس چیز کو قطع کرتے ہیں جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ اسے ملایا جائے۔ اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔''

الغرض دلیلوں کو ایک دوسرے کی طرف لوٹا دیا جائے۔ کلام اللہ یا حدیث رسول ﷺ کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے ٹکرایا نہیں جائے گا۔ کیونکہ ان کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر وتشریح کرتا ہے۔

اسی لیے پختہ علم والے کہتے ہیں:

﴿اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ (آل عمران: ۷)

''ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔''

یعنی محکم اور متشابہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ چونکہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے اس لیے اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے، اللہ کے کلام میں تناقض نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۝﴾ (النساء: ۸۲)

''تو کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے۔ اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔''

پس کلام اللہ میں تناقض اور اختلاف نہیں۔ ضرورت صرف ایمان، وجوہ استدلال اور کیفیت استدلال کے علم، گہری بصیرت اور ایسے پختہ علم کی ہے جو ایک مجتہد کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے علماء کرام مجتہد کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کا عالم ہو۔ ناسخ ومنسوخ، مطلق ومقید، مجمل ومبیّن اور محکم ومتشابہ کو پہچانتا ہو۔ ورنہ اسے اجتہاد اور علم کے مسائل میں بولنے کی اجازت نہیں حتیٰ کہ وہ ان امور کو پہچان لے تاکہ وہ ان معاملات میں ان لوگوں کی طرح گمراہی میں نہ پڑ جائے جن اُمور میں ٹیڑھی راہ

والے پڑ گئے ہیں۔

❁❁❁❁❁

وَقَالَ فِي ذَمِّ مُبْتَغِي التَّأْوِيْلِ لِمُتَشَابِهِ تَنْزِيْلِهِ: ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (آل عمران : ۷) **فَجَعَلَ ابْتِغَاءَ التَّأْوِيْلِ عَلَامَةً عَلَى الزَّيْغِ وَقَرَنَهُ بِابْتِغَاءِ الْفِتْنَةِ فِي الذَّمِّ.**

ترجمہ......: اور اللہ تعالیٰ متشابہ آیات کی تاویل کی کوشش کرنے والوں کی مذمت میں فرماتے ہیں: چنانچہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ ان آیات میں سے ان کی پیروی کرتے ہیں جو کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں، فتنے کی تلاش کے لیے اور ان کی اصل مراد کی تلاش کے لیے۔ حالانکہ ان کی اصل مراد نہیں جانتا مگر اللہ۔'' پس اللہ تعالیٰ نے تاویل کی کوشش کو گمراہی کی علامت قرار دیا اور اسے مذمت میں فتنہ کی کوشش کے ساتھ ذکر کیا۔

تشریح......: متشابہ کو محکم کی طرف لوٹائے بغیر اس کی تفسیر کی کوشش کرنا گمراہی کی علامت ہے۔

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ﴾......: ''پس وہ لوگ جن کے دلوں میں ٹیڑھ پن یعنی انحراف ہے'' ...... زیغ کا معنی ہے حق سے انحراف۔

﴿فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ﴾ ......: پس وہ پیروی کرتے ہیں اس کے متشابہ مقامات کی۔'' یعنی وہ کتاب وسنت میں سے صرف ایک طرف کو ہی لیتے ہیں اور دوسری جانب کی نصوص کو چھوڑ دیتے ہیں۔

﴿ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ﴾ ......: ''فتنہ چاہتے ہوئے اور اس کی تفسیر چاہتے ہوئے'' یعنی اس کی تفسیر کو جاننے کی کوشش میں۔ خواہ پہلے معنی میں اس کی تاویل (تفسیر) چاہتے ہوئے یا دوسرے معنی کے مطابق اس چیز کو جاننے کی کوشش میں جس کی طرف مستقبل میں چیز لوٹتی ہے۔ اور یہ طریقہ دونوں صورتوں میں ہی باطل ہے۔ برابر ہے وہ

معنی کی وضاحت کرنا چاہتے ہوں یا اس حقیقت اور انجام کار کو جاننا چاہتے ہوں جو مستقبل میں وقوع پذیر ہوگا۔ کیونکہ پہلی صورت میں اس کا معنی محکم کی طرف لوٹائے بغیر واضح نہیں ہوگا اور دوسرے معنی میں تفسیر کو وہ جان نہیں سکتے۔

پہلے معنی میں تاویل کو اللہ تعالیٰ اور پختہ علم والے جانتے ہیں۔ دوسرے معنی میں تاویل کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ چنانچہ ان میں سے کسی بھی تاویل کو جاننے کی کوشش میں ایسا کرنے والے گمراہ کہلائیں گے جب تک وہ بعض نصوص کو لے کر بعض کو ترک کرتے رہیں گے۔ اور اپنے فائدے اور خواہشات کے مطابق آنے والی نصوص کو لے کر اپنے اور اپنی خواہشات کے مخالف نصوص کو چھوڑتے رہیں گے۔ ایسے لوگ گمراہ ہیں، یہ لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کرنا اور دین سے پھیرنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف کی نصوص کو لے کر دوسری جانب کی نصوص کو چھوڑ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قرآن و سنت سے استدلال کر رہے ہیں۔ یوں لوگوں کو کلام اللہ اور کلام رسول اللہ ﷺ کے بارے میں شک میں ڈالتے ہیں۔ حالانکہ یہ کتاب اللہ سے استدلال نہیں بلکہ یہ تو لوگوں کو شکوک وشبہات میں ڈالنے کی کوشش ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے:

((إِذَا رَأَيْتهُمُ الَّذِيْنَ يَتبِعُوْنَ الْمُتَشَابِهَ ، فَأُوْلٰئِكَ الَّذِيْنَ سَمَّى اللّٰهُ فَاحْذَرُوْهُمْ .))

"جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو متشابہ (نصوص) کے پیچھے دوڑتے ہیں تو (جان لو) یہی وہ لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا ہے۔ سو، ان سے بچو۔" [1]

یعنی یہ وہی لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تذکرہ کیا ہے۔

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾ (آل عمران: ٧)

[1] یہ حدیث سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آئمہ کرام رحمہم اللہ بخاری (۴۵۴۷)، مسلم (۲۶۶۵)، ابوداؤد (۴۵۹۸) نے روایت کی ہے۔

''پھر جن لوگوں کے دلوں میں تو کجی ہے وہ اس میں سے ان کی پیروی کرتے ہیں جو کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں، فتنے کی تلاش کے لیے اور ان کی اصل مراد کی تلاش کے لیے۔''

رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس قسم کے لوگوں سے ڈرایا ہے۔ اور یہ وہ نام نہاد علماء ہیں جو علم کے کسی قابل قدر مقام پر نہیں پہنچے ہوتے جو انھیں علم کے بارے میں بولنے کے اہل بناتا ہو۔ یا پھر یہ کچھ تھوڑا بہت پڑھے تو ہوتے ہیں لیکن لوگوں کو حق سے پھیرنا اور گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ الغرض یہ دو قسم کے لوگ ہیں:

۱...... یا تو یہ جاہل ہیں اور ایسے مسائل میں دخل اندازی کرتے ہیں جن کا انھیں اچھی طرح علم نہیں۔

۲...... یا پھر یہ ایسے گمراہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام میں ٹکراؤ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ ہر حال میں کج رو ہیں۔ خواہ قصداً ایسا کرتے ہوں یا بلا ارادہ۔

چنانچہ کسی کے لیے اس وقت تک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کے بارے میں بحث کرنا جائز نہیں جب تک اس کے پاس اتنی اہلیت نہ ہو جو اسے راسخین فی العلم (پختہ علم والے علماء) کے درجہ تک پہنچا دے۔

اور راسخ فی العلم کا مطلب یہ ہے کہ ان کے پاؤں اور دل علم نافع پر جم جائیں صرف ایسے علماء کو ہی دین کے مسائل پر بحث کرنے کا حق ہے اور یہ قاعدہ صرف علماء سلف اور ان کے پیروکار علماء خلف پر ہی منطبق ہوتا ہے۔ یہی لوگ راسخین فی العلم ہیں۔

❀❀❀❀❀

ثُمّ حَجبھُم عمّا أمّلُوہ وَقَطَعَ أَطْمَاعَھُمْ عَمَّا قَصَدُوْہُ بِقَوْلِہٖ سُبْحَانَہٗ: ﴿وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ (آل عمران : ۷)

ترجمہ......: پھر انہیں اس چیز سے روکا جس سے انہوں نے امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ اور اپنے درج ذیل فرمان کے ساتھ ان کی طمع جات کو کاٹا جن کا اُنہوں نے قصد کر رکھا ہے۔ فرمایا: اوران کی اصل مراد کو ایک اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ وہ اہل ضلال کبھی اپنے مقصد کو نہیں پا سکتے۔ کیونکہ پہلی قسم کے لوگ تو اس مرتبہ کو نہیں پہنچتے کیونکہ ان کے پاس اہلیت اور بصیرت نہیں اور متعالم (نام نہاد عالم) کبھی عالم نہیں ہوسکتا خواہ وہ جتنی بھی کوشش کر لے، بہت سی نصوص حفظ کر لے، بہت زیادہ بحث کر لے، بے شمار کتابیں اور تعلیقات لکھ لے۔ وہ ہرگز عالم نہیں بن سکتا۔ ایسے ہی کج روی اختیار کرنے والا، گمراہ اور جادہ مستقیم سے ہٹا ہوا کبھی راسخین فی العلم میں شامل نہیں ہوسکتا بلکہ وہ ان اہل کتاب کی طرح علم کے نور اور ہدایت سے محروم رہتا ہے جن کے پاس علم تو ہے لیکن وہ راسخین فی العلم نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ گمراہی، کج روی اور کتاب اللہ میں شکوک وشبہات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

❁❁❁❁❁

قَالَ الْإِمَامُ اَبُوعَبْدِ اللّٰہِ اَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ حَنْبَلٍ [۱] فِیْ قَوْلِ النَّبِیِّ ﷺ "إِنَّ اللّٰہَ یَنْزِلُ إِلٰی سَمَاءِ الدُّنْیَا(۱)"، "وَإِنَّ اللّٰہَ یُرَی فِی الْقِیَامَةِ (۲)" وَمَا أَشْبَہَ ھٰذِہِ الْأَحَادِیْث [۲] نُؤْمِنُ بِھَا [۳] وَنُصَدِّقُ بِھَا لَا کَیْفَ وَلَا مَعْنَی [۴] وَلَا نَرُدُّ شَیْئًا مِنْھَا [۵] وَنَعْلَمُ أَنَّ مَا جَاءَ بِہِ الرَّسُوْلُ حَقٌّ [۶] وَلَا نَرُدُّ عَلَی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ. [۷]

ترجمہ......: امام ابوعبد اللہ احمد بن محمد بن حنبل نبی کریم ﷺ کے فرمان ''بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ آسمان دنیا پر اترتے ہیں'' اور ''بے شک اللہ تعالیٰ کو قیامت کے دن دیکھا

جاسکے گا'' اوراس جیسی دوسری احادیث کے بارے میں فرماتے ہیں: ''ہم ان پر ایمان لاتے اوران کی تصدیق کرتے ہیں۔لیکن کیفیت اور معنی بیان نہیں کرتے اور نہ ہی اس میں سے کسی چیز کی تردید کرتے ہیں۔اور ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ لائے ہیں وہ حق ہے۔ لہٰذا ہم رسول اللہ ﷺ (کے فرامین) کی تردید نہیں کرتے۔''

---

(۱) أخرجه الامام أحمد في المسند۔ جلد نمبر ۱۵ فصل نمبر ۳۶۳ حديث: ۹۵۹۲ رواه ابوهريرة رضي الله عنه۔ اسناده صحيح على شرط الشيخين.

(۲) روزِ قیامت اللہ عزوجل کی رؤیت کے بارے میں دیکھئے۔

(۱)...... ابن الاثیر رحمہ اللہ کی ''جامع الاصول'' جلد نمبر ۱۰ ص ۴۳۸ حدیث نمبر ۷۹۷۳، ص ۴۴۶، حدیث ۷۹۷۵۔

(۲)......شرح العقیدۃ الطحاویہ جلد نمبر ۱ ص ۲۱۵ و ص ۲۱۸

تشریح......: (۱)...... امام ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی رحمہ اللہ ائمہ اربعہ میں سے ایک ہیں۔آپ اہل سنت کے امام اور مصائب پر صبر کرنے والے تھے۔آپ پر آزمائش آئی تو آپ نے صبر کیا اور ثابت قدم رہے۔حتیٰ کہ آپ رحمہ اللہ کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اس عقیدے کی مدد کی اور آپ کی بدولت ہی جہمیہ اور معتزلہ جیسے گمراہ فرقوں کا قلع قمع کیا۔اور وہ اپنی خبیث فکر اور خلق قرآن کے باطل دعویٰ کو نافذ نہ کرسکے۔کیونکہ آپ رحمہ اللہ ان کے سامنے ایک چٹان کی طرح کھڑے رہے اور دوسرے آئمہ نے بھی آپ کے ساتھ ٹھوس موقف اپنایا۔ لیکن آپ رحمہ اللہ نے سب سے زیادہ قوت کے ساتھ اس فتنہ کا مقابلہ کیا اور مصائب پر صبر کیا۔ آپ رحمہ اللہ پر کوڑے برسائے گئے، قید کیا گیا اور قتل کے لیے آپ رحمہ اللہ کو مشرق کی طرف لے جایا گیا۔لیکن آپ رحمہ اللہ نے صبر کیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ رحمہ اللہ کے ساتھ ملت اسلامیہ کی مدد فرمائی اور جہمیہ اور معتزلہ کا قلع قمع کیا۔ وہ بے پناہ قوت اور حاکم وقت کے تعاون کے باوجود اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکے۔اس امام جلیل امام احمد بن

حنبل کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان کی چالوں کا خاتمہ کیا۔

(۲)...... یہاں مصنف رحمہ اللہ کتاب و سنت سے اسماء و صفات پر ایمان لانے کے وجوب کو بیان کرنے کے بعد اس بارے میں مذہب سلف اور ان کے اقوال سے مثالیں بیان کر رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے امام احمد، امام شافعی رحمہما اللہ، سیّدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ امیر المومنین خلیفہ راشد سیّدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ، امام اہل سنت امام اوزاعی رحمہ اللہ کے اقوال بیان کیے ہیں جن کا ذکر ان شاء اللہ آگے آئے گا۔ یہ تمام اقوال اس مسئلہ میں سلف صالحین کے مذہب کے ترجمان ہیں۔

(۳) امام احمد رحمہ اللہ کا قول:

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہم ان نصوص پر ایمان لائیں گے: مثلاً اللہ تعالیٰ کا آسمان دنیا پر اترنا اور اس جیسی دوسری احادیث۔ اسی طرح اس پر بھی کہ اللہ تعالیٰ کو قیامت کے دن بالکل واضح طور پر اپنی آنکھوں سے دیکھا جاسکے گا اور مومن رب ذوالجلال کو واضح طور پر اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔'' اس مسئلہ میں دوسری احادیث پر امام احمد رحمہ اللہ ان بدعتی لوگوں کے خلاف، جو ان نصوص پر ایمان نہیں لاتے اور ان کے مقابلے میں تاویل و تحریف اور تکذیب کا روّیہ اپناتے ہیں، فرماتے ہیں:

''ہم ان پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی تصدیق کرتے ہیں۔''

(۴) لا کیف:

یعنی ہم اس کی کیفیت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے یہ نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نازل تو ہوتا ہے لیکن کیسے؟ کیونکہ کیفیت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ وہ جیسے چاہتا ہے نزول فرماتا ہے۔ اس کی عظمت و قدرت کو خود اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لہٰذا ہم اس کے نزول کی کیفیت کے بارے میں بحث نہیں کریں گے کہ: اس وقت کیا عرش خالی ہوجاتا ہے یا نہیں؟ اور کیا ایسے ہوتا ہے یا نہیں؟ اور وہ آسمان دنیا پر کیسے اترتا ہے؟ حالانکہ ثلث اللیل کا وقت تو مختلف مقامات پر مختلف ہوتا ہے؟

(ذرا سوچو) دن، رات اور کائنات کو پیدا کرنے والا کون ہے؟ جواب ہوگا ''اللہ ربّ العالمین'' تو وہ اس پر بھی قادر ہے کہ جیسے چاہے اترے۔ اگرچہ ثلث اللیل کا وقت مختلف علاقوں میں مختلف ہوتا ہے لیکن یہ ہماری نسبت سے ہے، اللہ کی نسبت سے نہیں۔ کیونکہ وہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔ لہٰذا ہم اس کی کیفیت نزول کے پیچھے نہیں پڑیں گے۔ اسی طرح ہم یہ نہیں کہیں گے: اسے قیامت کے دن کیسے دیکھا جائے گا؟ (وہ قیامت کے دن کیسے دکھائی دے گا؟)۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑیں گے۔ بلکہ صرف اس کا اثبات کریں گے کہ وہ بالکل واضح طور پر دکھائی دے گا جیسے چودھویں رات کا چاند دکھائی دیتا ہے اور جیسے بادل نہ ہونے کی صورت میں سورج چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں لیکن رؤیت کی کیفیت پر بحث نہیں کرتے۔ کیونکہ اسے اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اسی طرح قرآن مجید میں ہے:

﴿وَجَآءَ رَبُّكَ﴾ (الفجر : ٢٢)...... ''اور تیرا رب آئے گا۔''

ہم اس بحث میں ہی نہیں پڑیں گے کہ وہ کیسے آئے گا؟ لیکن ہم اثبات کرتے ہیں کہ وہ آئے گا جیسا کہ اس کے جلال کے لائق ہے۔ الغرض ہم صفات پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے معنی کو جانتے ہیں لیکن اس کی کیفیت پر بحث نہیں کرتے۔ اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ولا کیف''.

ولا معنی:

اس سے مراد معنی حقیقی کی نفی نہیں کیونکہ یہ معنی تو معروف ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ معنی ہے جس کے ساتھ بدعتی لوگ اس کی تفسیر کرتے ہیں اور وہ ہے تاویل۔ جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اَلْإِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ، وَالْإِيْمَانُ بِهٖ وَاجِبٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ.'' [1] یعنی اللہ تعالیٰ کا عرش پر استواء معلوم ہے، اس کی کیفیت معلوم نہیں، اس پر ایمان واجب ہے اور کیفیت کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔

[1] لالکائی نے اسے ''شرح اصول اعتقاد اهل السنة والجماعة'' ١/ ٢٤ (٦٦٤) میں بیان کیا ہے۔

لہٰذا ولا معنی سے وہ معنی مراد ہے جو گمراہ لوگ مراد لیتے ہیں اور وہ ہے تاویل۔ مثال کے طور پر لفظ "ید" کی تاویل قدرت کے ساتھ، مجیئی کی تاویل اس کے حکم کے آنے کے ساتھ اور نزول کی تاویل اس کے حکم کے نازل ہونے کے ساتھ۔

یہ وہ معانی ہیں جو انھوں نے بیان کیے ہیں لیکن ہم ان کی نفی کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ وہ معانی نہیں جو اللہ کی مراد ہیں۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اس معنی کی نفی نہیں کرنا چاہتے جو لغت عرب میں کلام کا معنی ہوتا ہے۔ بلکہ وہ تو اس بدعتی معنی کی نفی کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بدعتیوں کا ردّ کر رہے ہیں۔ اور اس معنی کا ردّ کر رہے ہیں جو بدعتیوں نے ایجاد کیا ہے اور ان کا مقصود ہے۔

لہٰذا اس عبارت میں ایسے شخص کی کوئی دلیل نہیں جو حق کو مشکوک کرنا چاہتا ہو اور کہتا ہو کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ مفوض [1] تھے کیونکہ انھوں نے کہا ہے: "لا معنی" اور یہ مفوضہ کا طریقہ ہے۔ حالانکہ امام احمد رحمہ اللہ مفوضہ میں سے نہیں تھے۔ آپ رحمہ اللہ صرف کیفیت میں تفویض کرنے والے ہیں۔ اس لیے کہ کیفیت میں تفویض واجب ہے۔ رہا لغوی معنی تو وہ واضح ہوتا ہے اس لیے اس میں تفویض نہیں کی جائے گی بلکہ اس کی وضاحت اور تفسیر کی جائے گی۔

(۵)...... ہم بدعتیوں کی طرح مخالف عقل نصوص کی تردید نہیں کرتے کیونکہ وہ تو نصوص کی تردید کرتے اور عقل کو حاکم بناتے ہیں۔

(۶)...... نبی کریم محمد رسول اللہ ﷺ جو بھی لائے ہیں وہ حق ہے۔ اس میں کسی قسم کی غلطی، گمراہی اور تلبیس نہیں اور وہ اپنی حقیقت پر قائم بالکل حق ہے۔ کیونکہ اسے مخلوق کا سچا ترین انسان لے کر آیا ہے جو اپنی خواہش کے مطابق نہیں بولتا، جو امین اور مامون ہے۔ لہٰذا وہ جو بھی لایا ہے، اپنے ظاہر اور حقیقت میں حق ہے۔

---

[1] یہ اسماء وصفات کے معانی کو بیان نہ کرنے اور اللہ کے سپرد کرنے والا ایک فرقہ ہے۔ (مترجم)

(۷) ولا نرد علی رسول اللہ ﷺ:

اور ہم گمراہ لوگوں کی طرح رسول اللہ ﷺ کی (باتوں کی) تردید نہیں کرتے کہ رسول اللہ ﷺ تو فرماتے ہیں:

((یَنْزِلُ رَبُّنَا .)) ❶ ......''ہمارا رب اترتا ہے۔''

اور وہ کہتے ہیں: ''اس کا حکم اترتا ہے'' گویا وہ رسول اللہ ﷺ کی غلطی پکڑتے ہوئے (العیاذ باللہ) کہتے ہیں: ''نبی کریم ﷺ نے حقیقت بیان نہیں فرمائی۔ ''یَنْزِلُ رَبُّنَا'' حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا حکم اترتا ہے۔'' اور یہی رسول اکرم ﷺ کی تردید ہے۔ اسی طرح ارشاد ربانی ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ﴾ (الفجر: ۲۲) ''تیرا رب آئے گا۔''

لیکن یہ کہتے ہیں: ''اس کا حکم آئے گا'' گویا قرآن کریم اور رب العالمین کی (غلطی کی) تصحیح کرتے ہیں۔ (العیاذ باللہ)

❀❀❀❀❀

وَلَا نَصِفُ اللّٰهَ بِأَكْثَرَ مِمَّا وَصَفَهُ بِهِ نَفْسَهُ بِلَا حَدٍّ وَلَا غَايَةٍ: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

ترجمہ......: ہم اللہ تعالیٰ کی اس سے زیادہ صفات بیان نہیں کرتے جو خود اس نے اپنے بارے میں بیان کی ہیں بغیر حد اور انتہا کے۔ اس نے خود فرمایا ہے: ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

تشریح......: ہم تو سنت کی پیروی کرنے والے ہیں بدعتی نہیں۔ چنانچہ ہم اللہ کی ایسی صفات بیان نہیں کرتے جو اس نے خود اپنے لیے بیان نہیں کیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات توقیفی ہیں۔ اس لیے ہم اللہ کے صرف وہی اسماء وصفات بیان کرتے ہیں جو خود اس نے اپنے لیے بیان کیے ہیں۔ اپنے پاس سے اس کے اسماء وصفات بیان نہیں کرتے ہیں۔ یہ قاعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات توقیفی ہیں اور صرف وہی اسماء وصفات ثابت ہوں

---

❶ یہ سیّدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ٹکڑا ہے جو بخاری (۷۴۹۴) اور مسلم (۷۵۸) نے بیان کی ہے۔

گے جو کتاب وسنت میں مذکور ہیں۔

بلا حد ولا غاية:

اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کی کیفیت بیان نہیں کرتے کہ اس کی حدود اور انتہاء بیان کرنے لگ جائیں۔ کیونکہ نہ تو ہمارے علم اور طاقت میں ہیں اور نہ ہی ان کی حدود، کیفیت اور انتہا کو اللہ کے سوا کوئی جانتا ہے۔

قوله: ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٞۖ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلۡبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

یہ آیت کریمہ اس باب میں ایک اصول اور قاعدہ کی حیثیت رکھتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز نہیں۔ اس کے ایسے اسماء وصفات ہیں جن کے مشابہ مخلوق کے اسماء وصفات نہیں ہوسکتے۔ اگرچہ مخلوق ان اوصاف کے ساتھ متصف تو ہوتی ہے اور ان اسماء کے ساتھ موسوم تو ہوسکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور مخلوق کے اسماء وصفات میں بہت بڑا فرق ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ بھی سنتا ہے اور مخلوق بھی سنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی دیکھتا ہے، مخلوق بھی دیکھتی ہے، اللہ تعالیٰ بھی کلام کرتا ہے مخلوق بھی کلام کرتی ہے۔ لیکن مخلوق اور خالق کی ان صفات میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا ہم رب ذوالجلال کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار نہیں دیں گے۔ بلکہ ہم یہ ایمان رکھیں گے کہ خالق کی صفات وہ ہیں جو اس کے لائق اور اس کے ساتھ خاص ہیں۔ اور مخلوق کی صفات وہ ہیں جو ان کے لائق اور ان کے ساتھ خاص ہیں۔ اور آیت مبارکہ:

﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٞۖ﴾ (الشوری: ۱۱) ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سماعت مخلوق کی سماعت جیسی، اس کی بصارت مخلوق کی بصارت جیسی، اس کی قدرت مخلوق کی قدرت جیسی، اس کا ہاتھ مخلوق کے ہاتھ جیسا اور اس کا چہرہ مخلوق کے چہرے جیسا نہیں ہے۔ اس لیے خالق ومخلوق کی صفات میں کسی قسم کی کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ تو آیت مبارکہ ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٞۖ﴾ تشبیہ کا ردّ کرتی ہے اور ﴿وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ

الْبَصِيْرُ﴾ کے الفاظ تعطیل کا ردّ کرتے ہیں۔ یعنی ان لوگوں کا ردّ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی نفی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے اسماء وصفات کا بھی اثبات کیا ہے۔ ﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ میں "السمیع" اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اسی طرح "البصیر" بھی اللہ تعالیٰ کا ایک نام ہے اور "سمع و بصر" اس کی صفات میں سے دو صفات ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى﴾ (طٰهٰ: ٤٦)

"میں سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔"

"أسمع و أرى" سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دیکھتا اور سنتا ہے جو کہ مخلوق بھی کرتی ہے۔

﴿وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ (البقرہ: ٢٦٥)

"اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے خوب دیکھنے والا ہے۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے، تم اللہ سے چھپ نہیں سکتے۔

﴿الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ۝ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝﴾ (الشعراء: ٢١٨ تا ٢٢٠)

"جو تجھے دیکھتا ہے، جب تو کھڑا ہوتا ہے۔ اور سجدہ کرنے والوں میں تیرے پھرنے کو بھی۔ بے شک وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے فرمایا:

﴿قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى﴾ (طٰهٰ: ٤٦)

"فرمایا ڈرو نہیں، بے شک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔"

یعنی فرعون ان سے جو کچھ کہہ رہا تھا وہ اسے سنتا اور اس کی سرکشی اور طغیانی کو دیکھ رہا تھا۔

❀❀❀❀❀

وَنَقُوْلُ كَمَا قَالَ وَنَصِفُه بِمَا وَصَفَ بِهِ نَفْسَهُ، لَا نَتَعَدّى ذَالِكَ وَلَا يَبلغُه وَصُفُ الْوَاصِفِيْنَ .

ترجمہ......: اور ہم ویسے ہی کہتے ہیں جیسے اس نے فرمایا ہے۔ اور اس کے وہی اوصاف بیان کرتے ہیں جو خود اس نے اپنے لیے بیان کیے ہیں۔ ہم اس سے تجاوز نہیں کرتے اور نہ ہی صفات بیان کرنے والے اس کا حق ادا کر سکتے ہیں۔

تشریح......: ہم بھی وہی کچھ کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

اس آیت کو ہم اسماء وصفات باری تعالیٰ کے باب میں قاعدہ بناتے ہیں اور اس کے ذریعے مُشبّہہ اور مُعطِّلہ کا ردّ کرتے ہیں۔

ہم خالق کائنات کی وہی صفات بیان کرتے ہیں جو اس نے خود بیان فرمائی ہیں یا اپنے رسول ﷺ کی زبان سے بتلائی ہیں۔ ہم ان سے تجاوز نہیں کر سکتے کیونکہ یہ توقیفی [1] مسئلہ ہے اس میں ذاتی عقل وسمجھ اور پسند وناپسند کا کوئی دخل نہیں۔

کوئی شخص بھی اللہ تعالیٰ کی کماحقہ صفات بیان نہیں کرسکتا۔ صرف اللہ تعالیٰ خود ہی اپنی صفات بیان کرسکتا ہے یا اس کا نبی اس کی صفات بیان کرتا ہے۔ ساری مخلوق میں سے کوئی غیر نبی اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهِ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ: ۱۱۰)

''اور وہ علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

---

[1] یعنی ایسا مسئلہ جو وحی پر موقوف ہو۔

''علما'' یعنی علم کے اعتبار سے۔ یعنی لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں صرف وہی جانتے ہیں جو اس نے انہیں سکھلایا ہے۔ اور جب آپ کسی چیز کے بارے میں جانتے ہی نہیں تو اس کی صفت کیسے بیان کر سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ نہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسماء و صفات کو جانتے ہیں اور نہ ہی اس کی صفت بیان کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ بلکہ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ خود اپنے اسماء و صفات بیان کر سکتا ہے یا اس کا رسول وحی کی مدد سے ایسا کر سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بارے اور اپنے علاوہ کے بارے میں سب سے زیادہ جانتا ہے۔

❀❀❀❀❀

نُؤْمِنَ بِالقرآنِ كُلهِ مُحكمهِ وَمتشابههِ .

ترجمہ......: ہم سارے قرآن پر ایمان لاتے ہیں، اس کی محکم آیات پر بھی اور متشابہہ پر بھی۔

تشریح......: پختہ علم والوں کا یہی طریقہ کار ہے کہ وہ کہتے ہیں: ''ہم سارے قرآن پر ایمان لاتے ہیں اس کی محکم آیات پر بھی اور متشابہ پر بھی۔'' چنانچہ ہم متشابہ کو محکم کی طرف لوٹاتے اور اس کی مدد سے تفسیر کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ تمام ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ لیکن جو شخص متشابہ کو لے لیتا اور محکم کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ گویا قرآن کے کچھ حصے پر ایمان لاتا اور کچھ کا انکار کرتا ہے۔ چنانچہ جو شخص آیت کے شروع والے حصے ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ کو لے کر یہ کہتا ہے کہ یہ آیت صفات کی نفی پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ اگر ہم صفات کا اثبات کریں گے تو یہ تشبیہ ہوگی، وہ گمراہ ہے۔ کیونکہ اس نے آیت کے آخری حصے کو نہیں لیا۔ جبکہ اس کے آخر میں اللہ تعالیٰ اپنے لیے اسماء وصفات کو ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾

''اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

چنانچہ ثابت ہوا کہ اسماء و صفات کا اثبات مشابہت کا تقاضا نہیں کرتا۔

ایسے ہی وہ شخص بھی گمراہ ہے جو آیت کے آخری حصے ﴿وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ کو

لے کر یہ کہتا ہے کہ اس سے مراد ہے: اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے مشابہ ہے اور خالق ومخلوق کی سماعت و بصارت میں کوئی فرق نہیں۔ ہم کہتے ہیں اللہ کی پناہ یہ تو مُشَبّہ ہے۔ کیونکہ اس نے آیت کے پہلے حصے ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ چھوڑ دیا اور آخری حصے کو لے لیا۔ اس کے برعکس جو شخص پہلے حصے کو لے لیتا ہے اور آخری کو چھوڑ دیتا ہے وہ مُعَطِّل ہے۔ جبکہ ایک مومن اور توحید پرست وہ ہے جو مکمل آیت کو لیتا ہے اور کہتا ہے ﴿كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ (آل عمران: ۷) ''سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔''

❀❀❀❀❀

وَلَا نَزِيْلُ عَنْهُ صِفَةً مِّنْ صِفَاتِهِ لِشَنَاعَةٍ شُنِّعَتْ وَلَا نَتَعَدّى الْقُرْاٰنَ وَالْحَدِيْثَ وَلَا نَعْلَمُ كَيْفَ كنه ذَالِكَ إِلَّا بِتَصْدِيْقِ الرَّسُوْلِ وَتَثْبِيْتِ الْقُرْاٰنِ.

ترجمہ......: ہم کسی طعنہ دینے والے کے طعنے سے ڈرتے ہوئے اس کی صفات میں سے کسی میں کمی نہیں کرتے، نہ ہم قرآن وسنت سے آگے بڑھتے ہیں، ہم اس کی کنہ کو رسول اللہ کی تصدیق اور قرآن کی تثبیت کے بغیر نہیں جان سکتے۔

تشریح......: اور ہم بھی وہی صفات ثابت کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لیے ثابت کی ہیں، خواہ معطلہ ہمیں برا بھلا کہتے رہیں اور ہمیں مشبہہ، مجسمہ، حشویہ ہونے کا طعنے دیں۔ کیونکہ راہ راست سے ہٹے ہوئے لوگ، اہل توحید اور اسماء وصفات کا اثبات کرنے والوں کو یہی القاب دیتے ہیں۔ چنانچہ ہم ان باتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کتاب وسنت سے چمٹے رہیں گے اور ان کا طرح طرح کے القاب دینا ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ ہم تو محض اپنے پروردگار کو راضی کرنا چاہتے ہیں نہ کہ مخلوق کو۔

قولہ: ولا نتعدی القرآن......

یہ گزشتہ بات کی ہی تاکید ہے کہ اسماء وصفات توقیفی ہیں۔ ایسے ہی آخرت اور قبر وغیرہ کے معاملات علم غیب میں شامل ہیں۔ لہٰذا ہم بلا دلیل ان مسائل میں کوئی بات نہیں کر سکتے

اور نہ ہی دلائل کو متعدی [1] کر سکتے ہیں۔

قوله: ولا نعلم كيف كنه ذالك......

یعنی اسماء و صفات کے صرف معنی کو تو جانتے اور اسی کا اثبات کرتے ہیں لیکن ان کی کیفیت سے واقف نہیں۔ اسی لیے جب ایک شخص نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ قرآن میں ہے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰهٰ: ٥)

''وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا۔''

اللہ تعالیٰ عرش پر کیسے مستوی ہے؟

یعنی وہ استواء کی کیفیت کے بارہ میں سوال کر رہا تھا۔ تو امام مالک رحمہ اللہ نے سر جھکا لیا، پھر سر اٹھایا تو آپ اللہ تعالیٰ کے حیاء کی وجہ سے پسینہ میں غرق تھے اور فرمایا:

"اَلْإِسْتواءُ معلومٌ، والكيفُ مجهولٌ، وَالإيمانُ بهِ واجبٌ، وَالسؤالُ عَنه بدعةٌ، وما أَراكَ إِلّا رجُلَ سُوءٍ."

''استواء معلوم جبکہ اس کی کیفیت نامعلوم ہے، لیکن اس پر ایمان لانا واجب اور اس کے بارے میں پوچھنا بدعت ہے۔ مجھے تُو بہت برا آدمی معلوم ہوتا ہے۔''

پھر آپ رحمہ اللہ نے لوگوں کو حکم دیا اور اس کو مجلس سے نکال دیا گیا۔ [2] چنانچہ ہم رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتے ہیں اگرچہ ہمیں اس کی کیفیت کا علم نہیں۔ کیونکہ اللہ کا رسول، اللہ ہی کا پیغام پہنچاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾

(الحشر: ٧)

---

[1] یعنی کسی خاص دلیل کو دوسرے مسائل پر دلیل نہیں بنا سکتے۔ (مترجم)

[2] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

''اور رسول تمھیں جو کچھ دے وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے اس سے رک جاؤ۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ﴾ (النساء: ٦٤)

''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی فرماں برداری کی جائے۔''

چنانچہ جو شخص اسماء و صفات کے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کی تصدیق نہیں کرتا وہ رسول اللہ کا مطیع اور آپ کی رسالت پر ایمان لانے والا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ عقیدہ میں سب سے بنیادی حیثیت کا حامل مسئلہ ہے، بلکہ یہ عقیدہ کی جان ہے۔

سو، ہم رسول اللہ ﷺ اور قرآن حکیم کی پیروی کرتے ہیں۔ چنانچہ جس چیز کا قرآن اور رسول ﷺ نے اثبات کیا ہے ہم بھی اس کا اثبات کریں گے۔ اور جس چیز کا قرآن اور رسول نے نفی کی ہے ہم بھی اس کی نفی کریں گے۔ قرآن وسنت کو نفی و اثبات کے معاملہ میں متعدی نہیں کریں گے۔ یہی سلف صالحین کا طریقہ ہے۔

❁❁❁❁❁

قَالَ الْإِمَامُ اَبُوعَبْدِ اللّٰهِ مُحَمَّدُ بْنُ إِدْرِيْسٍ الشَّافِعِيُّ (١) آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَبِمَا جَاءَ عَنِ اللّٰهِ عَلٰي مُرَادِ اللّٰهِ. (٢)

ترجمہ......: امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور اس چیز پر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی اللہ تعالیٰ کی مراد کے مطابق۔

تشریح......: (١) امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا کلام ختم ہونے کے بعد اب امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ کے کلام کا ذکر کیا جارہا ہے۔ آپ رحمہ اللہ کو آپ کے دادا شافع کی نسبت سے شافعی کہا جاتا ہے۔ آپ بنی عبد المطلب بن عبد مناف سے ہیں۔ یعنی آپ مطلبی اہل بیت

میں سے ہیں۔ اسی لیے اہل علم آپ کو ''عالم قریش'' کا لقب دیتے ہیں۔ اس عظیم امام کا سنت رسول ﷺ کے دفاع اور گمراہ لوگوں کے ردّ میں بڑا عظیم موقف ہے۔

(۲) آمنتُ بِاللّٰهِ وَبِمَا جَاءَ عَنِ اللّٰهِ:

جو شخص اللہ کی طرف سے آنے والی چیز پر ایمان نہیں لاتا وہ گویا اللہ پر ایمان نہیں لاتا۔

عَلٰى مُرادِ اللّٰهِ:

یعنی ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی چیز پر اس کی مراد کے مطابق ایمان لاتے ہیں۔ اپنی طرف سے اس میں کچھ داخل نہیں کرتے۔

چنانچہ ہم کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے جو اسماء وصفات بیان کیے ہیں ہم ان پر اس کی مراد کے مطابق ایمان لاتے ہیں۔ نہ تو ہم اس کی تاویل کرتے ہیں اور نہ ہی تحریف۔ بلکہ ہم اس کے لیے سمع وبصر، حیات وقدرت، کلام وارادہ اور دیگر تمام صفات کا اثبات کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اسماء وصفات اس نے خود بیان کیے ہیں۔''

❀❀❀❀❀

وَآمنْتُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ، وَبِمَا جَاءَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ، عَلَى مُرَادِ رَسُوْلِ اللّٰهِ (۱).

ترجمہ......: اور میں ایمان لایا رسول اللہ ﷺ پر اور اس چیز پر جو رسول اللہ ﷺ لائے، رسول اللہ ﷺ کی مراد کے مطابق۔

تشریح......: (۱) اللہ تعالیٰ اور اس کی طرف سے آنے والی چیز پر اس کی مراد کے مطابق ایمان لانے کے بعد اسی طرح ہم رسول اللہ ﷺ اور ان کی طرف سے آنے والی صحیح احادیث پر رسول اللہ کی مراد کے مطابق ایمان لاتے ہیں۔ تاویلات وتحریفات باطلہ کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی مراد کے مخالف تفسیر نہیں کرتے۔

یہی مطلب ہے رسالت کی گواہی کا۔ یعنی اس کے احکامات کی بجا آوری اور اس کے منع کردہ کاموں سے اجتناب۔ پس جو شخص گواہی دیتا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں

لیکن آپ کی بتلائی ہوئی باتوں کی تصدیق نہیں کرتا، وہ اپنی گواہی میں جھوٹا اور رسول اللہ ﷺ پر تہمت لگانے والا ہے۔ کیونکہ سب سے بڑی چیز جو آپ لائے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات ہیں، اس لیے ہم ان پر ایمان لاتے اور ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کی تردید نہیں کرتے اور آپ کے فرامین کی باطل تاویلات کے ساتھ تحریف نہیں کرتے۔ جن کی وجہ سے بہت سے لوگ گمراہ ہوئے ہیں۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ کا کلام وہی منہج ہے جس پر امت محمدیہ ﷺ گامزن ہے۔

❀❀❀❀❀

وَعَلَى هٰذَا درجَ السلفُ (۱) وَأَئِمَّةُ الْخلفِ رضی اللہ عنہم (۲).

ترجمہ......: اور اسی پر چلے ہیں اسلاف اور ائمہ خلف رضی اللہ عنہم۔

تشریح......: (۱) یعنی اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف سے آنے والی چیز پر اللہ و رسول کی مراد کے مطابق ہی ایمان لانا اسلاف کا طریقہ ہے۔ اسلاف سے مراد: اس امت کے پہلے لوگ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور قرون مُفضّلہ (جن زمانوں کو فضیلت دی گئی بعد میں آنے والے زمانوں پر) کے لوگ ہیں رحمہم اللہ اجمعین۔ اس اصول پر ان میں سے کسی نے ہچکچاہٹ ظاہر نہیں کی۔ اسی پر قرون مُفضّلہ کے لوگ قائم رہے، انھوں نے ان آیات و احادیث پر اعتراض نہیں کیا۔ یہ اعتراضات تو قرون مفضّلہ کے بعد پیدا ہوئے جب فلسفہ اور علم کلام کو جاننے والوں نے دین میں نئی باتیں داخل کیں۔ منطقی قواعد اور نام نہاد عقلی دلائل کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر حاکم بنا دیا۔

(۲)......آئمة الخلف: سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلاف کے بعد آئے اور ان کے منہج پر چلے۔ ان سب نے یہی مذہب اختیار کیا۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ، لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ، وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ۔ تَبَارَكَ و

تَعَالٰی .)) ❶

''میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا ان کو رسوا کرنے والا اوران کی مخالفت کرنے والا، انہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قیامت) آجائے۔''

خلف میں سے یہاں وہ حضرات گرامی قدر مراد ہیں جو سلف کی اتباع کرنے والے ہیں۔ان کے منہج پر چلنے والے ہیں۔ بحمد للہ قیامت تک زمین ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوگی کیونکہ یہ لوگ (سلف کے بعد) اللہ کے دین کی اشاعت وتبلیغ کرنے والے ہیں۔

❀❀❀❀❀

كُلُّهُمْ مُتَّفِقُوْنَ عَلَى الْإِقْرَارِ وَالْإِمْرَارِ وَالْإِثْبَاتِ (١) لِمَا وَرَدَ مِنَ الصِّفَاتِ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ رَسُوْلِهِ مِنْ غَيْرِ تَعَرُّضٍ لِتَأْوِيْلِهِ.

یہ تمام کتاب اللہ اورسنت رسول ﷺ میں وارد صفات الٰہی کو ان کی تاویل کے پیچھے پڑے بغیر ماننے، ثابت کرنے اوراصل معانی پر باقی رکھنے پر متفق ہیں۔

تشریح......: یعنی صفات الٰہی کو تاویل وتحریف کے بغیر اسی طرح ماننا اور جاری کرنا جیسے وہ کتاب وسنت میں مذکور ہیں۔ اسلاف اور ائمہ خلف رضی اللہ عنہم ان کو ان کے الفاظ اور معانی پر برقرار رکھتے ہوئے ویسے ہی بیان کرتے تھے جس طرح یہ وارد ہوئی ہیں۔ یہی سلف اور منہج سلف پر چلنے والے ہدایت یافتہ ائمہ خلف رحمہم اللہ جمیعاً کا طریقہ تھا۔

❀❀❀❀❀

وَقَدْ اُمِرْنَا بِاِقْتِفَاءِ آثَارِهِمْ، وَالْإِهْتِدَاءِ بِمَنَارِهِمْ (١) وَحُذِرْنَا الْمُحْدَثَاتِ، وَأُخْبِرْنَا أَنَّهَا الضَّلَالَاتُ(٢).

ترجمہ......: تحقیق ہمیں حکم دیا گیا ہے ان کے نقش قدم پر چلنے اوران کے نورِ علم وعمل سے ہدایت

❶ أخرجه أحمد في المُسند (٧٨/٣٧، ٢٢٣٩٥)، ومسلم (١٩٢٠، ٢٨٨٩)، وأبوداود (٤٢٥٢)، وغيرهم من حديث ثوبان.

پانے کا اور ہمیں ڈرایا گیا ہے بدعات سے اور ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ گمراہی ہیں۔

تشریح......: (۱) یعنی ہمیں دین کے معاملات میں ان کے نقش قدم پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ (التوبہ: ۱۰۰)

''اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے سب سے پہلے لوگ اور وہ لوگ جو نیکی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہوگئے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي، وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِيْ.)) [1]

''تم لازم پکڑو میرے طریقے کو اور میرے بعد میرے ہدایت یافتہ خلفاء کے طریقے کو۔''

یہ ہے ان کی پیروی کرنے کا حکم۔

قَوْلُه: وَالْاِهْتِدَاءُ بِمَنَارِهِمْ:

منار: ان نشانات راہ کو کہا جاتا ہے جن کی مدد سے مسافر راہ پاتے ہیں۔

(۲) قَوْلُه وَحُذِرْنَا مِنَ الْمُحْدَثَاتِ:

اور اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد پاک ہے:

((إِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ، وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ،

[1] أخرجه أحمد في المسند (۲۸/۳۷۵، ۱۷۱۴۵)، وأبوداود (۴۶۰۷)، والترمذي (۲۶۷۶)، من حديث العرباض بن سارية رضي الله عنه، وهو حديث صحيح.

وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ .)) [1]

''بے شک بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین راہ محمد ﷺ کی راہ اور بدترین کام نئے کام ہیں اور ہر نیا کام بدعت ہے۔ ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے کا سبب ہے۔''

❀❀❀❀❀

فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ : ''عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ (١) وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِيْ (٢) عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ (٣).

ترجمہ......: چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''لازم پکڑو تم میری سنت کو اور میرے بعد میرے ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت کو۔ اسے اپنے دانتوں کے ساتھ مضبوطی سے پکڑ لو۔

تشریح......: (۱) سنت سے مراد ہر وہ قول، فعل اور تقریر ہے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ جو بات بھی آپ ﷺ سے مروی ہے وہ سنت ہے اور اس کو قبول کرنا واجب ہے۔ اس کی دلیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾

''اور رسول تمھیں جو کچھ دے وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے اس سے رک جاؤ۔'' (الحشر: ۷)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

''بلاشبہ یقیناً تمھارے لیے اللہ کے رسول میں ہمیشہ سے اچھا نمونہ ہے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰)

[1] أخرجه أحمد في مسنده (۲۳/۲۳٤، ١٤٩٨٤)، ومسلم (۸٦۷/۳٤) والبيهقي في الأسماء والصفات (ص۸۲) من حديث جابر بن عبد الله. رضي الله عنهما

''جو رسول کی فرماں برداری کرے تو بے شک اس نے اللہ کی فرماں برداری کی۔''

اس جیسے بے شمار دلائل ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و اتباع اور آپؐ کے فرامین پر عمل کا حکم ہے۔ ایسے ہی ہمیں خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ بھی دراصل رسول اللہ ﷺ کی ہی سنت ہے۔ خلفائے راشدین سے مراد درج ذیل چار خلفاء ہیں؛ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے ان چاروں خلفاء کو ''راشدین'' (ہدایت یافتہ) کہا ہے اور ''رشد'' ''غیّ'' کی ضد ہے۔ ''رشد'' کا لفظ ہدایت و اتباع حق پر بولا جاتا ہے۔ جبکہ ''غیی'' حق سے انحراف اور گمراہی کو کہتے ہیں۔ الغرض یہ چاروں خلفاء ہدایت یافتہ ہیں۔

پھر نبی اکرم ﷺ نے ان کی ایک اور صفت بیان فرمائی ہے اور وہ ہے ''المھدیین'' جس کا مطلب ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں اتباع حق کی ہدایت دی۔ سو، جو شخص ہدایت یافتہ لوگوں کی پیروی کرے گا وہ بھی ہدایت پا جائے گا۔

(۳)..... عَضُّوْا عَلَيْهَا: یعنی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت کو اور اس جملے سے مراد شدت تمسک ہے (یعنی مضبوطی سے تھامنا) جب کوئی شخص کسی چیز کو مضبوطی سے تھام لے تو کہا جاتا ہے ''عَضَّ عَلَيْهِ بِالنَّوَاجِذِ'' یعنی اس نے اس چیز کو مضبوطی سے تھام لیا۔ مثال کے طور پر ایک شخص ڈوب رہا ہو، اس کے پاس ایک رسی ہو اور وہ ڈوبنے سے بچنے کے لیے اس کو مضبوطی سے تھام لے گا۔ اور جب وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے تو وہ اس رسی کو تھامنے رکھنے کی خواہش میں اس کو دانتوں میں دبا لے گا کیونکہ یہی اس کے لیے راہ نجات ہوگی۔

الغرض رسول اللہ ﷺ کی سنت اس رسی کی مانند ہے جو ڈوبتے آدمی کے ہاتھ میں ہو۔ اگر اس نے اس رسی کو چھوڑ دیا تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔

❀❀❀❀❀

وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ (١)، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ(٢).

ترجمہ......: اور بچو تم نئے نئے کاموں سے کیونکہ بلاشبہ ہر نیا کام بدعت اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

تشریح......: (۱) جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت کے ساتھ تمسک کی ترغیب دی تو ساتھ ہی ''محدثات'' سے بھی منع فرمایا۔

محدثات: "محدثة" کی جمع ہے۔ اور یہ ہر اس بدعت پر بولا جاتا ہے جسے بدعتیوں نے ایجاد کیا ہو۔ بدعت اور محدثات الامور دونوں سے مراد دین میں کوئی ایسی چیز پیدا کرنا ہے جو اس میں سے نہیں۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ.)) ❶

''جس شخص نے کوئی ایسا کام کیا جس کا ہم نے حکم نہیں دیا تو وہ مردود ہے۔''

ایک روایت میں ہے:

((مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ.)) ❷

''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسا کام ایجاد کیا جو اس میں نہیں تو وہ مردود ہے۔''

چنانچہ دین کے معاملات ایجاد اور اضافے سے قبول نہیں کیے جائیں گے۔ بلکہ ان کے نصوص والفاظ اور ان کی روح کو بغیر کسی کمی بیشی سے تھامے رکھنا واجب ہے۔ "ایّاکُمْ" کا لفظ تنبیہ کے لیے ہے۔

(۲)..... فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ: یہ ایک قاعدہ عامہ ہے کہ دین میں ہر نیا کام بدعت

---

❶ أخرجه أحمد في مسنده (٤٢/٦١، ٢٥١٢٨)، ومسلم (١٨/١٧١٨) من حديث عائشة.

❷ أخرجه أحمد في مسنده (٤٣/١٥٧، ٢٦٠٣٣)، والبخاري (٢٦٩٧)، ومسلم (١٧/١٧١٨)، من حديث عائشة.

ہے۔اور دین میں بدعت حسنہ (اچھی بدعت) کا کوئی تصور نہیں۔جیسا کہ گمراہ لوگ کہتے ہیں۔ یا یہ کہہ کر دھوکہ دیتے ہیں کہ دین میں بدعت حسنہ بھی ہوتی ہے۔حالانکہ دین میں کبھی کوئی بدعت اچھی نہیں ہوسکتی۔

اور کہتے ہیں: ''دین میں بعض ایسی بدعات حسنہ بھی ہیں جو گمراہی نہیں۔'' یہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مخالف بات ہے کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

یہ حدیث ایسی عظیم بنیاد ہے جو ہر ایسے بدعتی کا ردّ کرتی ہے جو لوگوں کے سامنے بدعت کو خوش نما بناتا اور کہتا ہے: ''یہ نیکی ہے، اس کا بہت ثواب ہے، اس سے عبادت میں چستی آئے گی اور اس کا فلاں فائدہ ہے، فلاں فائدہ ہے۔'' وغیرہ۔

ہم کہتے ہیں بدعت میں نہ تو کوئی نیکی ہے اور نہ ہی ثواب بلکہ وہ سراسر گمراہی اور برائی ہے اور یہ تمام بدعات اہل بدعت پر لوٹا دی جائیں گی۔ہمیں وہی کافی ہے جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے اور اسی میں بھلائی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ (المائدہ: ۳)

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا۔''

رسول اللہ ﷺ کی وفات سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے دین کو مکمل کر دیا تھا۔لہٰذا جو شخص رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی اضافہ کرنا چاہتا ہے وہ اپنے رب پر جھوٹ کی تہمت لگاتا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ اور وہ دین میں اپنے پاس سے کسی چیز کا اضافہ کرتا ہے۔ایسا شخص اللہ کو جھٹلانے والا ہے اور رسول اللہ ﷺ پر دین کو چھپانے کی تہمت لگاتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر دین کے وہ اُمور اب نازل کر دیے ہیں جو اس بدعتی کو نظر آ گئے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ نے انھیں چھپا لیا اور امت کو نہیں بتایا تھا۔ (جیسا کہ اس ضمن میں ملاؤں اور صوفیوں کی ایک اصطلاح ''طریقت'' کی ہے۔ (العیاذ باللہ)

❁❁❁❁❁

وَقَالَ عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ "اِتَّبِعُوْا، وَلَا تَبْتَدِعُوْا، فَقَدْ كُفِيْتُمْ" (۱).

ترجمہ......: اور جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''اتباع کرو، بدعات اختیار نہ کرو، پس تحقیق تمہیں یہی سیدھی راہ کفایت کردی جائے گی۔

تشریح......: عبداللہ بن مسعود: آپ رضی اللہ عنہ پہلے پہل ایمان لانے والے مہاجرین میں سے ہیں۔ آپ علم، تقویٰ، عبادت اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ صحابہ کے بہت بڑے علماء اور فقہاء میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: اِتَّبِعُوْا، یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کی اتباع کرو۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (الاعراف: ۳)

''اس کے پیچھے چلو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔''

وَلَا تَبْتَدِعُوْا: یعنی بدعات سے منع فرمایا۔ چنانچہ یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مطابق ہے:

((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَآءِ))۔ ((وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ))

پھر آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

فَقَدْ كُفِيْتُمْ: یعنی تمہیں مشقت سے بچالیا گیا اور تمہیں کسی قسم کے اضافے اور تکلف کی ضرورت نہیں رہے گی۔ تمہیں کتاب اللہ، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور فرامین صحابہ رضی اللہ عنہم پر عمل ہی کفایت کر جائے گا۔

جیسے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی واجب ہے، اسی طرح صحابہ کرام کی اتباع بھی ضروری ہے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد تھے۔ جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ افضل ترین اور کبار صحابہ کرام میں سے ایک ہیں جو ہمیں یہ عظیم وصیت فرمارہے ہیں:

اِتَّبِعُوْا وَلَا تَبْتَدِعُوْا فَقَدْ كُفِيتُمْ: یہ فرما کر آپ رضی اللہ عنہ نے کسی کے لیے دین میں کمی بیشی اور لوگوں کے لیے ایسے کام ایجاد کرنے کی گنجائش نہیں چھوڑی جنہیں وہ نیکی اور قرب الٰہی کا باعث سمجھتے ہوں۔

اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جب کسی طالب علم کے دل میں کوئی ایسا خیال آئے جسے وہ اچھا سمجھتا اور اسے بیان کرنا یا لکھنا چاہتا ہو تو اس پر لازم ہے کہ یہ دیکھے؛ آیا یہ بات کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بیان ہوئی ہے یا اسلاف میں سے کسی کا یہ قول ہے؟

اگر وہ ان مصادر میں یہ چیز پالے تو بہت خوب اور اللہ کا شکر ادا کرے جس نے اسے درست چیز کی توفیق دی۔ اور اگر اسے چیز ان مصادر ثلاثہ نہ ملے تو اسے چاہیے کہ اپنے اس فعل سے باز آجائے۔ اس سے دور ہو جائے اور جان لے کہ یہ بدعت ہے۔

بعض علماء نئی عبارتیں اور نئے الفاظ بیان کرتے ہیں حالانکہ وہ اس میں درست کو غلط کر دیتے ہیں۔ لہٰذا کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی عبارت گھڑ لے یا غور وفکر کر کے کوئی ایسے معانی بیان کرے جو اسلاف نے سمجھے اور بیان نہیں کیے۔ خاص طور پر اسماء و صفات کے باب میں اسے چاہیے کہ کوئی ایسی بات کہنے سے بچے جو اسلاف نے نہیں کہی۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "كُفِيتُم" لہٰذا ہمارے لیے کوئی گنجائش نہیں کہ ہم نصوص میں غور وخوض کر کے ان کی کوئی ایسی تشریح کریں جو اسلاف نے نہیں کی یا ایسی عبارات بیان کریں جو اسلاف نے بیان نہیں کیں۔

یہ ایک عظیم قاعدہ ہے کہ آپ اپنی لگام کبھی کھلی نہ چھوڑیں اور ایسے معانی بیان نہ کریں جو اسلاف نے ذکر نہیں کیے۔ خاص طور پر اسماء وصفات کے باب میں اس سے پرہیز کریں کیونکہ یہ گمراہی ہے۔

ہم نے عصر حاضر کے بہت سے ادباء اور مصنّفین دیکھے ہیں جنھوں نے اپنی من پسند عبارات اور اصطلاحات استعمال کر کے بہت سی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور یہ ایسی غلطیاں ہیں جو اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئیں بالخصوص عقیدے کی کتابوں میں۔ لہٰذا یہ ایک

بہت بڑی خرابی ہے۔

چنانچہ ہر وہ بات جو سلف صالحین نے نہیں کی اس سے رکنا واجب ہے اور یہی راہ نجات ہے کیونکہ ہم سلف کے علم کو نہیں پہنچتے اور نہ ہی علم میں ان کے برابر ہیں کہ عبارات اور فقہ نصوص میں ان سے مقابلہ کرنے لگ جائیں۔ ہم اس مقام تک نہیں پہنچتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلاف علم کی گہرائی اور سمجھ میں ہم سے بہت آگے تھے۔ کیونکہ انھوں نے براہ راست رسول اللہ ﷺ سے علم حاصل کیا۔ اسی لیے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کے صحابہ تمام لوگوں سے زیادہ علم رکھنے والے اور کم تکلف کرنے والے تھے۔ یہ ایسے لوگ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کی صحبت کے لیے چنا تھا۔'' الغرض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تمام لوگوں سے زیادہ علم کی گہرائی میں جانے اور کم تکلف کرنے والے تھے۔ وہ تکلف نہیں کرتے تھے اور الفاظ کے پیچھے نہیں پڑتے تھے۔ بلکہ وہ تو تکلف اور عبارات کے الجھاؤ میں پڑنے کی بجائے صرف کتاب وسنت کے تقاضوں پر توجہ دیتے تھے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ رضی اللہ عنہ (۱) کلامًا معناه: قِفْ حَيْثُ وَقَفَ الْقَوْمُ (۲) فَإِنَّهُمْ عَنْ عِلْمٍ وَقَفُوْا (۳) وَبِبَصرٍ نَافِذٍ كفُوا (۴).

ترجمہ.......: اور جنابِ عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے ایک فرمان کا معنی یہ ہے کہ جہاں قوم رک جائے وہاں رک جاؤ۔ کیونکہ وہ علم کی وجہ سے ٹھہرے اور گہری نگاہ رکھنے کی وجہ سے رکے ہوں گے۔

تشریح.......: (۱)...... آپ عمر بن عبد العزیز بن مروان ہیں رحمہ اللہ۔ جو کہ بنو امیہ کے خلفاء میں سے ایک عادل خلیفہ، بہت بڑے امام اور ربانی عالم تھے۔ آپ کو تجدید دین کرنے والوں کا سرخیل سمجھا جاتا ہے۔ آپ اپنے چچا سلیمان بن عبد الملک کے بعد خلیفہ بنے۔

(۲)...... یہ بھی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے ملتا جلتا قول ہے۔ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ

فرماتے ہیں: "قِفْ حَيْثُ وَقَفَ الْقَوْمُ" یعنی جو بات رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام نے کی اور نہ ہی ان کے شاگردوں تابعین، تبع تابعین میں سے کسی نے کی آپ کے لیے وہ بات کرنا جائز نہیں۔

(۳)...... یعنی اگر اسلاف کسی بات سے خاموش رہے ہیں تو اس کی وجہ جہالت نہیں بلکہ یہ اس لیے تھا کہ وہ اس کو جائز ہی نہیں سمجھتے تھے۔

(۴) بِبَصَرٍ: یہاں آنکھ سے مراد دل کی آنکھ ہے اور دل کی آنکھ علم اور بصیرت ہے۔ الغرض اسلاف نے جب دیکھا کہ فلاں چیز میں خیر نہیں ہے تو انھوں نے اس کے بارے میں توقف کیا، اس سے رک گئے اور اسے چھوڑ دیا۔ اس لیے آپ پر بھی لازم ہے کہ جس چیز کو انھوں نے چھوڑا اسے چھوڑ دیں، اپنے طرف سے نئی نئی عبارات اور الفاظ استعمال نہ کریں۔ کوئی نیا معنی پیش نہ کریں اور کوئی ایسی بات نہ کریں جو انھوں نے نہیں کہی۔

❀❀❀❀❀

وَلَهُم عَلَى كَشْفِهَا كَانُوا أَقْوَى (۱) وَبِالْفَضْلِ لَوْ كَانَ فِيهَا أَحْرَى (۲)، فَلَئِنْ قُلْتُمْ: حَدَثَ بَعْدَهُمْ؛ فَمَا أَحْدَثَهُ إِلَّا مَنْ خَالَفَ هَدْيَهُمْ وَرَغِبَ عَنْ سُنَّتِهِمْ (۳) وَلَقَدْ وَصَفُوا مِنْهُ مَا يَشْفِي، وَتَكَلَّمُوا مِنْهُ بِمَا يَكْفِي (۴).

ترجمہ......: اور ان کے پاس زیادہ علمی قدرت تھی اور ان چیزوں میں کوئی فضیلت ہوتی تو وہ اس فضیلت کے زیادہ لائق تھے۔ اور اگر تم کہو: یہ تو ان کے بعد وجود میں آئی تھیں، تو ہم کہیں گے: ان کو ایجاد تو انہوں نے ہی کیا ہے جنہوں نے ان کی ہدایت کی مخالفت اور ان کی سنت سے انحراف کیا ہے۔ انہوں نے اتنا بیان کر دیا جو کہ شفا دیتا ہے اور جتنا کافی تھا اس کی وضاحت کر دی۔

تشریح......: (۱)...... یعنی ان کے پاس علمی قدرت تھی لیکن وہ سمجھتے تھے کہ اس میں کوئی بھلائی نہیں اور اس میں دخل اندازی درست نہیں۔ اس لیے وہ اس کے بارے میں خاموش

رہے لہٰذا آپ بھی ان کے ساتھ ٹھہر جائیں۔

(۲)......اگر ان چیزوں میں کوئی فضیلت ہوتی جن کے بارہ میں وہ خاموش رہے ہیں تو وہ اس فضیلت کے زیادہ لائق تھے اور وہ ضرور اس میں دخل اندازی کرتے۔ لیکن ان کا ایسا نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں کوئی فضیلت نہیں بلکہ یہ سراسر جہالت اور گمراہی ہے۔

(۳)...... یہ ایک اعتراض کا جواب ہے جو آپؒ کے کلام پر وارد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ کہیں: ''اسلاف کے بعد بہت سی نئی بدعات وجود میں آئی ہیں اس لیے ہم نئی عبادات اور نئے الفاظ بناتے ہیں۔ جبکہ ان کے دور میں یہ واقعات رونما نہیں ہوئے تھے۔''

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی اتباع کے بغیر نجات ممکن نہیں۔ لہٰذا آپ جب بھی ان بدعات کا ردّ کرنا چاہیں تو اس دلیل سے کریں کہ ان کے بعد جو چیزیں پیدا ہوئی ہیں ان میں کوئی نیکی نہیں۔

(۴)...... اسلاف نے دین کے امور بالخصوص اسماء و صفات کے عقیدہ کی وضاحت میں کوئی کوتاہی اور سستی نہیں کی۔ بلکہ اسے بڑی وضاحت سے بیان فرما دیا ہے اور صرف ایسی چیزوں کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے جن کے متعلق بحث کرنا جائز نہیں۔ اس لیے آپ بھی انہی کا کلام نقل کریں اور اس میں اپنی طرف سے تصرف نہ کریں۔ جس مسئلہ میں وہ خاموش رہے تم بھی خاموش رہو اور اس میں دخل اندازی نہ کرو۔ جب آپ کے سامنے کوئی ایسی چیز آئے جسے آپ کلام اسلاف میں نہ پائیں تو جان لیجیے کہ وہ اس بارے میں خاموش رہے ہیں۔ چنانچہ آپ بھی اس مسئلہ میں خاموشی اختیار کریں۔

❀❀❀❀❀

فَمَا فَوْقَهُمْ مُحَسِّرٌ، وَمَا دُوْنَهُمْ مُقَصِّرٌ (۱) لَقَدْ قَصَّرَ عَنْهُمْ قَوْمٌ فَجَفَوْا (۲) وَتَجَاوَزَهُمْ آخَرُوْنَ فَغَلَوْا (۳) وَإِنَّهُمْ فِيمَا بَيْنَ ذَالِكَ لَعَلَى هُدًى مُسْتَقِيمٍ (۴).

ترجمہ......: جو ان سے آگے بڑھے وہ حد سے بڑھنے والا اور جو پیچھے رہے وہ کوتاہی کرنے

والا ہے۔ کچھ لوگوں نے ان سے پیچھے رہ کر ظلم کیا تو کچھ نے ان سے آگے بڑھ کر غلو۔ اور جو لوگ اس کے بین بین رہے وہ سیدھے راستے پر ہیں۔

تشریح......: (۱) فَمَا فَوْقَهُمْ: یعنی جو اُن کی ہدایت سے زیادہ کرے۔ مُحَسِّر: یعنی غلو اور حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔

وَمَا دُوْنَهُمْ مُقَصِّر: یعنی جو ان کی اتباع اور ان کے علم کے حصول میں سستی دکھائے وہ کوتاہ عمل اور سست ہے۔ چنانچہ سلف کے مخالفین دو حالتوں کے درمیان ہیں۔

۱...... یا تو غلو کرنے والے ہیں۔

۲...... یا ظلم کرنے والے۔

پہلی قسم کے لوگوں کو محسر یعنی غلو کرنے والے اور حد سے تجاوز کرنے والے کو کہا جاتا ہے اور جو اسلاف کے طریقے میں کوتاہی کرے اسے مقصر (کوتاہ عمل) کہا جاتا ہے اور وہ بھی اسلاف تک نہیں پہنچتا۔ یہ دونوں کام ہی قابل مذمت ہیں۔ سلامتی نہ تو آگے بڑھنے میں ہے اور نہ ہی پیچھے رہنے میں۔ بلکہ ان کے ساتھ ان کے منہج پر چلنے میں ہے۔

(۲)...... قَصَّرَ عَنْهُمْ قَوْمٌ فَجَفَوْا: یعنی بعض لوگ ان سے پیچھے رہ گئے اور یہ بھی ظلم اور سستی ہے۔

(۳)...... یہ پچھلے جملے "ما فوقهم محسر وما دونهم مقصر" کی ہی تفسیر ہے یعنی ان سے پیچھے رہنے والے نے سستی کی اور ان سے آگے بڑھنے والے نے غلو کیا۔

(۴)...... یعنی جو محسر اور مقصر کے درمیان میں ہے وہ سیدھی راہ پر ہے۔ سلف محسر اور مقصر کے درمیان تھے اور سیدھے راستے پر تھے۔ ہدایت دو گمراہیوں کے درمیان ہے اور حق دو باطلوں کے درمیان ہے۔ سلف کا راستہ اور اللہ کا دین بھی غلو اور کوتاہی کے درمیان میں ہے۔ یہ اعتدال اور استقامت کا دین ہے۔ اسی کی ہدایت مانگنے کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ٥﴾

''اے اللہ! ہمیں سیدھی راہ دکھا۔''

یعنی غلو اور کوتاہی کے درمیان اعتدال کی راہ۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ الْإِمَامُ أَبُوْ عَمْرٍو الْأَوْزَاعِيُّ (۱) عَلَيْكَ بِآثَارِ مَنْ سَلَفَ، وَإِنْ رَفَضَكَ النَّاسُ (۲) وَإِيَّاكَ وَآرَاءَ الرِّجَالِ وَإِنْ زَخْرَفُوْهُ لَكَ بِالْقَوْلِ(۳).

ترجمہ......: اور امام ابوعمرو اوزاعی نے فرمایا: اسلاف کے نقش قدم پر چلو چاہے لوگ تجھ پر تنقید کریں۔ اور لوگوں کی آراء سے بچو، چاہے وہ تجھ سے چکنی چپڑی باتیں ہی کریں۔

تشریح......: (۱) آپ امام ابوعمرو عبد الرحمٰن الاوزاعی رحمہ اللہ ہیں جو کہ اہل شام کے امام تھے۔

(۲)......یعنی فضیلت والے زمانوں کے اسلاف اور صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلو۔

قَوْلُهُ: وَإِنْ رَفَضَكَ النَّاسُ: یعنی اگر لوگ اتباع سلف کی وجہ سے تمہیں تنقید کا نشانہ بنائیں اور ظلم کریں تو تم ان کی طرف توجہ نہ کرنا اور نہ ہی ان کی مذمت سے پریشان ہونا۔ کیونکہ آپ حق پر ہیں، آپ لوگوں کی تعریف اور رضا کے طالب نہیں ہیں۔ بلکہ آپ تو اپنے پروردگار کی رضا اور حق کے متلاشی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حق صرف اتباع سلف میں ہے۔ چنانچہ جب آپ کسی ایسے آدمی کو دیکھیں جو آپ کو جمود، قدامت پرستی اور رجعت پسندی کا طعنہ دیتا ہے تو آپ ہرگز ان پر توجہ نہ دیں کیونکہ آپ حق پر ہیں اور وہ باطل پر۔ لہٰذا آپ وہم میں مبتلا نہ ہوں۔

(۳)...... یہ تنبیہ ہے کہ آپ راہ سلف کو چھوڑ کر لوگوں کی آراء کو اختیار نہ کیجیے جو ان کے بعد کی پیداوار ہیں۔

وَإِنْ زَخْرَفُوْهَا: زخرفة: کا معنی ہے خوبصورت کرنا۔ اصل میں زخرف، سونے کو کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَوْلَا أَنْ يَكُوْنَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِنْ فَضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ○ وَلِبُيُوْتِهِمْ أَبْوَابًا وَسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِئُوْنَ ○ وَزُخْرُفًا ط﴾ (الزخرف : ۳۳-۳۵)

''اور اگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی امت ہو جائیں گے تو یقیناً ہم ان لوگوں کے لیے جو اللہ الرحمٰن کے ساتھ کفر کرتے ہیں، ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں بھی، جن پر وہ چڑھتے ہیں۔ اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت بھی، جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں۔(چاندی کے بنا دیتے)اور سونے کے۔''

الغرض وہ اپنی باتوں کو ملمع کر کے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ حق محسوس ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْإِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ط وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ○﴾ (الانعام : ۱۱۲)

''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیطانوں کو دشمن بنا دیا۔ ان کا بعض بعض کی طرف ملمع کی ہوئی بات دھوکا دینے کے لیے دل میں ڈالتا رہتا ہے اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ پس چھوڑ انھیں اور جو وہ جھوٹ گھڑتے ہیں۔''

یعنی آپ کو ان کا کلام عقلی اور یقینی دلائل سے بھرپور نظر آئے گا۔ حالانکہ وہ صرف اپنی فصاحت و بلاغت کی بنیاد پر سامعین کو مسحور کرتے ہیں جبکہ وہ راہ سلف پر نہیں ہوتے۔ چنانچہ آپ ان کی طرف توجہ نہ دیں اور ان کی باتوں میں نہ الجھیں کیونکہ وہ صرف ملمع کاری ہے۔

شاعر کہتا ہے:

فِیْ زُخْرُفِ الْقَوْلِ تَزْیِیْنٌ لِبَاطِلِهِ
وَالْحَقُّ قَدْ یَعْتَرِیْهِ سُوْءُ تَعْبِیْرِ

''بات کی ملمع کاری سے باطل کو خوشنما بنا دیا جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی برے انداز بیان کی وجہ سے حق بدنما ہو جاتا ہے۔''

ثابت ہوا کہ باتوں کی ملمع کاری لوگوں کے سامنے باطل کو خوشنما بنا دیتی ہے۔ لیکن صاحب بصیرت حقائق پر نگاہ رکھتا ہے ظاہر کی طرف نہیں۔ چنانچہ جو بات بھی اسماء و صفات کے باب میں سلف سے منقول نہ ہو خواہ وہ الفاظ کی مینا کاری اور انداز بیان کی جادوگری سے خوش نما بن جائے آپ سمجھ لیں کہ وہ باطل ہے۔ سو، اس میں نہ الجھیں۔ یہ قاعدہ علم کلام اور علم منطق پر منطبق ہوتا ہے۔ لوگوں نے اسے ملمع کر کے عقلی دلائل اور یقینی قواعد کا نام دے رکھا ہے۔ آپ ہرگز اس کی طرف مڑ کر نہ دیکھیں۔ منطق کے قواعد اور علم کلام، اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور سلف صالحین رضی اللہ عنہم کے کلام کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟

❀❀❀❀❀

قَوْلُ الْإِمَامِ الْأَذْرَمِيِّ فِيْ هٰذَا الْبَابِ: وَقَالَ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْأَذْرَمِيُّ (۱) لِرَجُلٍ تَكَلَّمَ بِبِدْعَةٍ (۲) وَدَعَا النَّاسَ إِلَيْهَا (۳) هَلْ عَلِمَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَأَبُوْبَكْرٍ وَّ عُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ، أَوْلَمْ يَعْلَمُوْهَا؟ فَقَالَ: لَمْ يَعْلَمُوْهَا (۴) قَالَ: فَشَيْئٌ لَمْ يَعْلَمْهُ هٰؤُلَآءِ أَعَلِمْتَهُ أَنْتَ؟! (۵) قَالَ الرَّجُلُ: فَإِنِّيْ أَقُوْلُ: قَدْ عَلِمُوْهَا (۶) قَالَ أَفَوَسِعَهُمْ أَلَّا يَتَكَلَّمُوْا بِهِ وَلَا يَدْعُوا النَّاسَ إِلَيْهِ أَمْ لَمْ يَسْعَهُمْ؟ قَالَ: بَلْ وَسِعَهُمْ، قَالَ: فَشَيْئٌ وَسِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَخُلَفَاءَهُ لَايَسَعُكَ أَنْتَ؟! فَانْقَطَعَ الرَّجُلُ.

ترجمہ......: اس باب میں امام ادرمی رحمہ اللہ کا قول: محمد بن عبد الرحمٰن الادرمی رحمہ اللہ نے ایک آدمی سے، جو ایک بدعت کی بات کرتا اور لوگوں کو اس کی دعوت دیتا تھا، پوچھا، کیا رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے علم میں یہ بات تھی یا نہیں؟ اس نے کہا: انہیں

اس کا علم نہیں تھا۔ تو امام رحمہ اللہ نے فرمایا: کیا تجھے اس کا علم ہو گیا؟ وہ کہنے لگا: اگر میں کہتا ہوں انہیں علم تھا تو؟ امام رحمہ اللہ نے فرمایا: کیا ان کے لیے گنجائش تھی کہ وہ اسے بیان نہ کرتے اور لوگوں کو اس کی دعوت نہ دیتے؟ اس نے کہا: ان کو اجازت تھی۔ تو آپ رحمہ اللہ نے فرمایا جس چیز کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کو اجازت تھی کیا تجھے اس کی اجازت نہیں۔ یہ سن کر وہ شخص لاجواب ہو گیا۔

تشریح ......: (۱) محمد بن عبد الرحمٰن ادرمی رحمہ اللہ سے عباسی خلیفہ واثق بن معتصم کی موجودگی میں ایک شخص کا مناظرہ ہو گیا۔ آپ رحمہ اللہ نے اس سے یہ سوالات کیے تھے۔ کیونکہ مامون کے زمانے میں معتزلہ کے زیر اثر خلق قرآن کا بدعتی قول سامنے آیا تو مامون نے دیگر بہت سے فتنوں کی طرح اس کی بھی سرپرستی کی۔ چنانچہ اس دور کا سب سے بڑا فتنہ خلق قرآن کا مسئلہ اور ایسے ائمہ کو سزا دینا اور قتل کرنا تھا جو اس قول کو قبول نہیں کرتے تھے۔ انہی معتوب ائمہ میں سے محمد بن عبد الرحمٰن ادرمی رحمہ اللہ ہیں۔

امام ذہبی رحمہ اللہ نے "سیر اعلام النبلاء" کی جلد ۱۰ میں ص ۳۰۷ تا ۳۱۰ پر یہ واقعہ بیان فرمایا ہے۔ لیکن انہوں نے شیخ کا نام ذکر نہیں کیا۔ فرماتے ہیں:

أذنـه (جگہ کا نام) کا ایک شیخ واثق کے پاس آیا۔ اس وقت اس فتنہ (خلق قرآن) کا سرخیل احمد بن ابی داؤد بھی موجود تھا جس نے بشر المریسی کے بعد لوگوں کو سب سے زیادہ اس کفر کے ماننے پر مجبور کیا۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے اس شیخ کو بھیجا اور اس نے واثق کے سامنے احمد بن ابی داؤد سے مناظرہ کیا۔ اسی قصے کا ایک حصہ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے یہاں بیان فرمایا ہے۔

(۲)...... یہ شخص احمد بن ابی داؤد واثق باللہ عباسی کے دور میں فتنہ خلق قرآن کا سرخیل تھا۔ کیونکہ اس نے تین عباسی خلفاء مامون، اس کے بھائی معتصم اور واثق بن معتصم کی مدد سے لوگوں کو خلق قرآن کے قائل ہونے پر مجبور کیا۔ بالآخر متوکل باللہ کا دور آیا اور اس نے

سنت رسول اللہ ﷺ کی مدد کی اور اہل بدعت کا قلع قمع کیا۔

(۳)......اس بدعت سے مراد خلق قرآن کا مسئلہ ہے۔

(۴)......یعنی امام ادرمی رحمہ اللہ نے اسے کہا: تم یہ جو خلق قرآن کی بات کر رہے ہو کیا رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم کے علم میں یہ بات تھی یا نہیں؟ اگر وہ کہتا کہ ان کو اس کا علم نہیں تھا تو وہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جاہل کہنے کا مرتکب قرار پاتا اور اگر وہ کہتا کہ انہیں علم تو تھا لیکن انہوں نے لوگوں کے سامنے یہ بات بیان نہیں فرمائی تو یہ ان پر علم کو چھپانے کا الزام ہوتا۔ الغرض آپ رحمہ اللہ نے اسے اس مناظرہ میں لاجواب کر دیا۔

(۵)......یعنی جب رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو اس کا علم نہیں تھا تو تجھے کیسے اس کا علم ہو گیا۔ لہٰذا تو نے ایک ایسا مؤقف اپنایا ہے جو نہ تو رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا اور نہ ہی خلفاء رسول اس کے قائل تھے۔

(۶)......یعنی اس نے رجوع کر لیا اور کہا: ''انہیں اس کا علم تھا۔'' تو امام ادرمی رحمہ اللہ نے فرمایا اگر انہیں اس کا علم تھا تو انہوں نے لوگوں کے سامنے اسے بیان کیوں نہیں کیا؟

❁❁❁❁❁

فَقَالَ الْخَلِيْفَةُ ـ وَكَانَ حَاضِرًا ـ لَا وَسِعَ اللّٰهُ عَلَى مَنْ لَمْ يَسْعَهُ وَمَا وَسِعَهُمْ (١) وَهٰكَذَا (٢) مَنْ لَمْ يَسْعَهُ مَا وَسِعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ (٣) وَأَصْحَابَهُ وَالتَّابِعِيْنَ لَهُمْ بِإِحْسَانٍ، وَالْأَئِمَّةُ مِنْ بَعْدِهِمْ (٤) وَالرَّاسِخِيْنَ فِي الْعِلْمِ، مِنْ تِلَاوَةِ اٰيَاتِ الصِّفَاتِ، وَقِرَاءَةِ أَخْبَارِهَا، وَإِمْرَارِهَا كَمَا جَاءَتْ (٥) فَلَا وَسِعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ.

ترجمہ......: خلیفہ بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ اس شخص پر آسانی نہ کرے جو اسے کافی نہیں سمجھتا اور نہ ہی انہیں کفایت کرے، اسی طرح اس شخص پر بھی آسانی نہ کرے جو اس چیز کو کافی نہیں سمجھتا جیسے رسول اللہ ﷺ، آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام اور

ان کے بعد آنے والے اماموں اور پختہ علم لوگوں نے کافی سمجھا۔ اور وہ ہے آیاتِ صفات کی تلاوت، احادیث کو پڑھنا اور ان کو اسی طرح آگے منتقل کرنا جیسے وہ نازل ہوئی ہیں۔

تشریح......: (۱) اس شیخ محترم رحمہ اللہ نے اُس ملحد سے بحث کی اور اسے خلیفہ کے سامنے اس قدر رسوا کیا کہ خلیفہ وقت نے اس خبیث کی غلطی کا اعتراف کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ واثق باللہ نے تو اس موقف سے پہلے ہی توبہ کرلی تھی لیکن اس شیخ نے پھر بھی اس ملحد کے ساتھ بحث کی۔ کیونکہ اس نے ایک ایسی بات کہی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے بیان نہیں فرمائی تھی۔

(۲)...... یہ مؤلف رحمہ اللہ کا اپنا تبصرہ ہے۔

(۳)...... یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت میں تنگ کردے۔

(۴)...... مثال کے طور پر ائمہ اربعہ، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ اور ائمہ محدثین رحمہم اللہ یعنی وہ لوگ جو صحابہ کے بعد آئے۔

(۵)...... یعنی جو شخص صفات کی آیات اور احادیث کو نہیں پڑھتا اور انہیں اسی طرح جاری نہیں کرتا جیسے وہ نازل ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر دنیا و آخرت کی زندگی تنگ کردے۔

آیاتِ صفات کی مثال ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوری: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

اسی طرح:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ﴾

(آل عمران: ۵)

''بے شک اللہ وہ ہے جس پر کوئی چیز نہ زمین میں چھپی رہتی ہے اور نہ آسمان میں۔''

اس کے علاوہ وہ آیات جن میں اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات مثلاً چہرہ اور ہاتھوں کا ذکر ہے اور وہ آیات جن میں معنوی صفات مثلاً علم، ارادہ اور قدرت کا ذکر ہے اور فضیلت کی صفات جیسے؛ تخلیق، رزق، کلام اور استواء وغیرہ کی آیات۔

قولہ: ((وَقِرَاءَةُ اَخْبَارِهَا))

اس سے مراد احادیث رسول اللہ ﷺ ہیں۔ انہیں آثار بھی کہا جاتا ہے۔ قراءت اخبار سے مراد یہ ہے کہ اسلاف نے ان احادیث کو پڑھا اور جس طرح یہ ان تک پہنچیں اسی طرح انہیں لوگوں تک پہنچایا اور انہیں پڑھایا۔ وہ نہ تو اس کی تاویل کے پیچھے پڑے اور نہ ہی صفات باری تعالیٰ کی کیفیت جاننے کا تکلف کیا۔ بلکہ انہیں اسی حالت پر باقی رکھا جس میں وہ ان تک پہنچی تھیں اور ان کے لیے یہ مشکل نہ تھیں۔ کیونکہ وہ ان کے معانی کو جانتے تھے۔ یہ کلام ان کی زبان میں نازل ہوا تھا اور وہ فصحاء عرب تھے۔ چنانچہ انہوں نے نہ تو اس کے بارے میں سوال کیا اور نہ ہی بحث ومباحثہ کیا۔ کیونکہ وہ ان کے مدلول ومقصود کو جانتے تھے۔ وہ نہ تو ان کے پیچھے پڑے اور نہ ہی ان کے ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ یہ تشبیہ ہے۔ الغرض وہ خالق ومخلوق کی صفات میں فرق کو جانتے تھے۔

انہوں نے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿السمیع البصیر﴾ کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ مخلوق بھی سنتی اور دیکھتی ہے لہٰذا اس سے تشبیہ لازم آتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ خالق کی صفات صرف اسی کے ساتھ خاص ہیں اور مخلوق کی صفات ان کے ساتھ خاص ہیں۔ مخلوق کا سننا اور دیکھنا خالق کے سننے اور دیکھنے کی طرح نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوری: ۱۱)

"اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔"

اس آیت نے نہ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اشکال میں ڈالا اور نہ ہی قرون مفضّلہ میں اہل علم کو۔ بلکہ انہوں نے اس کے مدلول کا اثبات کرتے ہوئے اسے اسی طرح پڑھا اور پڑھایا جیسے یہ نازل ہوئی۔ لیکن جب ایسے لوگ ان کے جانشین بن گئے جو نسل در نسل عجمی تھے، بت

پرستی ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اور کفار کی سوچ ان میں در آئی تھی تو وہ پاگلوں کی طرح مسئلہ صفات میں واہیات بکنے لگے۔

لیکن جو لوگ پختہ علم رکھتے تھے انہوں نے صفات سے تعرض نہ کیا۔ مثال کے طور پر بڑے بڑے ائمہ کرام رحمہم اللہ جمیعاً۔ اگرچہ ان میں سے کچھ عجمی بھی تھے۔ لیکن ان کے پاس چونکہ بصیرت اور پختہ علم تھا، اس لیے وہ اس مسئلہ میں الجھتے نہیں تھے۔

صفات میں تعرض صرف انہی لوگوں نے کیا جن کی کفر اور بت پرستی کی گندگی کی وجہ سے آلودہ اور سوچ پراگندہ ہوچکی تھی۔ وہی لوگ ایسی باتیں کرنے لگے۔

❀❀❀❀❀

فَمَهْمَا جَاءَ مِنْ اٰيَاتِ الصِّفَاتِ (۱) قَوْلُهُ تَعَالٰى: ﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ﴾ (الرحمن: ۲۷) (۲) وَقَوْلُهُ تَعَالٰى ﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ﴾ (المائدہ: ۶۴) (۳).

ترجمہ......: تو جو آیات صفات سے متعلقہ ہیں، ان میں سے اللہ کا یہ فرمان ہے: ''اور باقی رہے گا تیرے رب کا چہرہ'' اور یہ فرمان ہے: ''بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔''

تشریح......: (۱) جب اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے بارے میں منہج سلف بیان ہو چکا تو مصنف کتاب وسنت سے صفات کی نصوص کا بیان شروع کر رہے ہیں۔

(۲)......لہٰذا جب بھی قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے سلسلہ میں چہرے کا ذکر آیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے چہرے کا وجود بیان فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ٥ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ٥﴾

(الرحمن: ۲۶ تا ۲۷)

''ہر ایک جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والا ہے۔ اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا، جو بڑی شان اور عزت والا ہے۔''

اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ کے لیے چہرے کا اثبات ہے۔ سلف نے اس آیت کو پڑھا، جیسے یہ نازل ہوئی ویسے ہی اس کا اثبات کیا۔ اسے ماننے میں ہچکچاہٹ ظاہر نہیں کی اور نہ ہی انہیں اس آیت نے پریشان کیا۔ چنانچہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے لیے ''وجہ'' (چہرے) کے اثبات کے وجوب کی دلیل ہے۔

لیکن جب گمراہ لوگ آئے تو انہوں نے کہا: ''وجہ'' سے مراد ذات ہے۔ کیونکہ اگر ہم خالق کے لیے ''وجہ'' کو ثابت کریں گے جبکہ یہ مخلوق میں بھی موجود ہے تو خالق ومخلوق کے درمیان مشابہت لازم آئے گی۔''

ہم کہتے ہیں: ایسا ہرگز نہیں۔ اللہ کے لیے ''وجہ'' کے اثبات سے مخلوق کے چہرے کے ساتھ اس کی مشابہت لازم نہیں آتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا چہرہ تو ویسا ہے جیسا اس کی عظمت کے لائق ہے۔ ہم اس کی کیفیت کو نہیں جانتے اور مخلوق کا چہرہ ویسا ہے جیسا ان کے لیے مناسب ہے۔

(۳) اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا اثبات ہے۔ یہود کی ایک بات کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾ (المائدہ: ٦٤)

''اور یہود نے کہا اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔''

یعنی وہ اللہ تعالیٰ کو بخیل کہتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ﴾ (المائدہ: ٦٤)

''ان کے ہاتھ باندھے گئے۔''

چنانچہ یہودی تمام لوگوں سے زیادہ بخیل، مال کو جمع کرنے کے حریص اور لالچی ہیں۔ اسی لیے وہ ہر حلال وحرام طریقے سے مال جمع کرتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف مال جمع کرنا ہے خواہ وہ حلال ہو یا حرام۔ یہود کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے سود، جوئے، زنا اور لوٹ کھسوٹ کی کمائی کو جائز کرلیا۔ انہیں جہاں سے بھی مال مل جائے اسے سمیٹ لیتے ہیں لیکن

خرچ نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ سب سے زیادہ بخیل ہیں اور ان پر یہ صفت منطبق ہوتی ہے۔

﴿غُلَّتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ﴾

یعنی ان پر بخل کی چھاپ ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ ان کے ہاتھ حقیقت میں ان کی گردنوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں بلکہ اس سے مراد ان کا بخل ہے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَا تَجۡعَلۡ یَدَكَ مَغۡلُوۡلَةً اِلٰی عُنُقِكَ﴾

''اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ کرلے۔''

یعنی آپ بخل نہ کریں۔ اور

﴿وَ لَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ الۡبَسۡطِ﴾ (الاسراء: ۲۹)

''اور نہ اسے کھول دے، پورا کھول دینا۔''

یعنی اسراف نہ کریں۔

الغرض خرچ نہ کرنا بخل ہے اور بے دریغ خرچ کرنا اسراف ہے۔

﴿وَ لَا تَجۡعَلۡ یَدَكَ مَغۡلُوۡلَةً اِلٰی عُنُقِكَ وَ لَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ الۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُوۡمًا مَّحۡسُوۡرًا﴾ (الاسراء: ۲۹)

''اور نہ اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا کرلے اور نہ اسے کھول دے، پورا کھول دینا، ورنہ ملامت کیا ہوا، تھکا ہارا ہو کر بیٹھ رہے گا۔''

﴿وَالَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ یُسۡرِفُوۡا وَلَمۡ یَقۡتُرُوۡا وَ كَانَ بَیۡنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ (الفرقان: ٦٧)

''اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ خرچ میں تنگی کرتے ہیں اور (ان کا خرچ) اس کے درمیان معتدل ہوتا ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے۔ کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ میں نقص بیان کیا اور لعنت سے مراد اللہ کی رحمت سے دوری ہے۔ لہٰذا یہ اس بات کی خرابی کی دلیل ہے۔ پھر اللہ

تعالیٰ نے فرمایا:

﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ﴾ (المائدہ : ٦٤)

''بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔''

تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کے فضل اور رزق کے سہارے زندہ ہیں۔ چوپائے، انسان، کیڑے مکوڑے اور تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کے رزق کے سہارے زندہ ہیں۔ اس کا ہاتھ دن رات سخاوت کے دریا بہا رہا ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (المنافقون : ٧)

''حالانکہ آسمانوں کے اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں۔''

الغرض تمام مخلوقات کو جو بھی رزق ملتا ہے اسی کے در سے، اسی کے فضل سے ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ﴾ (الملك : ٢١)

''یا وہ کون ہے جو تمھیں رزق دے، اگر وہ اپنا رزق روک لے؟''

پتہ چلا کہ تمام مخلوقات حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے دشمن کفار بھی اسی کے رزق سے زندہ ہیں۔

﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ﴾ (المائدہ : ٦٤)

''بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔''

اس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اس کے دو ہاتھ ہیں اور وہ جیسے چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ کوئی اس کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکتا اور نہ ہی اس کے فضل کو روک سکتا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں دلیل ''یداہ'' کے الفاظ ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اس کے دو ہاتھ ہیں۔ جیسا کہ دوسری آیت میں ہے:

﴿مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (ص : ٧٥)

''تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اس کے لیے سجدہ کرے جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا؟''

یہ اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا تھا۔ اور باقی مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''کُــنْ'' (ہو جا) تو وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ تمام اشیاء اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے وجود میں آتی ہیں۔ لیکن آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کرنے کا شرف عطا فرمایا۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''خَلَقْتُ'' (میں نے پیدا کیا) پھر فرمایا ''بِيَدَيَّ'' یعنی اپنے ہاتھوں سے اور یہ الفاظ اللہ کے ہاتھوں کے اثبات میں صریح اور واضح ہیں۔

گمراہ لوگ کہتے ہیں: ''اللہ کے ہاتھوں سے مراد اس کی قدرت ہے۔ چنانچہ وہ آیت کا معنی یہ کرتے ہیں ''میں نے آدم کو اپنی قدرت سے پیدا کیا۔''

اس کا ردّ یہ ہے کہ: اگر ایسا ہے تو پھر آدم علیہ السلام کی کوئی خصوصیت اور امتیاز باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ تمام مخلوقات ہی اللہ کی قدرت سے پیدا ہوئی ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''بِيَــدَيَّ'' کے الفاظ فرمائے ہیں۔ اگر ہم اس کی تاویل کریں تو کیا ''قُدْرَتَيَّ'' کہیں گے (اللہ نے اپنی دو قدرتوں کے ساتھ)

تو کیا اللہ کی دو قدرتیں ہیں یا ایک ہی قدرت؟

ظاہر ہے اس کی ایک ہی قدرت ہے اور یہ دلیل ہے کہ ''بِيَــدَيَّ'' حقیقی ''يَــدٌ'' کا تثنیہ ہے۔ یہی مفہوم لغوی معنی سے سمجھ میں آتا ہے اور معاشرے میں معروف بھی ہے۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ وہ ہیں جو صرف اسی کے ساتھ خاص ہیں مخلوق کے ہاتھوں کے مشابہ نہیں ہیں۔ وہ اسی کی ذاتِ اقدس کے لائق ہیں، ان کی کیفیت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ اہل بدعات گمراہ لوگ بزعم خویش اسے تشبیہ سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ہاتھوں کی نفی کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں: یہ ہرگز تشبیہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے ہاتھوں کے درمیان کوئی مشابہت نہیں۔ یہ تو صرف اسی کے نزدیک تشبیہ ہے جسے کوئی عقل نہیں اور جو کلام اللہ کو سمجھتا نہیں، اہل علم کے لیے یہ مشکل نہیں۔

❀❀❀❀❀

وَقَوْلُهُ تَعَالَى إِخْبَارًا عَنْ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّه قَالَ "تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَا أَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ" (المائدہ: ۱۱٦) (۱) وَقَوْلُهُ سُبْحَانَه "وَجَاءَ رَبُّكَ" (الفجر: ۲۲) (۲)

ترجمہ......: عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق خبر دیتے ہوئے اللہ کا یہ فرمان کہ انہوں نے فرمایا: "تو جانتا ہے جو میرے نفس میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے نفس میں ہے۔" اور اللہ کا یہ فرمان: "اور آئے گا تیرا ربّ"

تشریح......: (۱) یہ آیت اللہ تعالیٰ کے نفس کے اثبات کے بارے میں ہے جیسا کہ مخلوق کا بھی نفس ہوتا ہے۔

﴿تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ﴾ ......عیسیٰ علیہ السلام مخلوق تھے اور ان کا نفس بھی تھا۔

﴿وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ﴾

"اور میں نہیں جانتا جو تیرے نفس میں ہے۔"

عیسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے عرض کریں گے: اور میں اس بات کو نہیں جانتا جو تیرے دل میں ہے۔ گویا عیسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے مخاطب ہوں گے کہ وہ اس کے دل کی بات نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا انکار نہیں کیا۔ چنانچہ اس میں اللہ تعالیٰ کے نفس (جی) کا اثبات ہے اور دوسری آیت میں ہے:

﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام: ٥٤)

"تمھارے رب نے رحم کرنا اپنے آپ پر لازم کرلیا ہے۔"

اس میں بھی اللہ تعالیٰ کے نفس کا اثبات ہے۔ اور مخلوق کا بھی جی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ اور مخلوق دونوں کا نفس مشابہ ہے۔

(۲)...... یہ صفات افعال کی دلیل ہے۔ جبکہ وجہ (چہرہ)، ید ان (ہاتھ) اور نفس (جی) اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات ہیں۔ اور ارشاد باری تعالیٰ:

﴿وَجَآءَ رَبُّكَ﴾ (الفجر : ٢٢)

''اور تیرا رب آئے گا۔''

میں فعلی صفت بیان ہوئی ہے اور یہ آیت سورۃ الفجر میں یوم قیامت کی ہولناکیوں کے سیاق میں ذکر ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿کلا﴾...... یہ انکار اور ڈانٹ کا کلمہ ہے۔

﴿إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾ (الفجر : ٢١)

''ہرگز نہیں، جب زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی۔''

زمین دہل جائے گی اور اس پر جو بھی پہاڑ اور عمارات وغیرہ ہیں، نابود ہو جائیں گی اور زمین ایک صاف چٹیل میدان ہو جائے گی۔ آپ کو اس میں کوئی اونچ نیچ اور ٹیلہ نظر نہیں آئے گا۔

﴿وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا○ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا○﴾ (طٰہ : ١٠٥۔١٠٦)

''اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں تو کہہ دے: میرا رب انھیں اڑا کر بکھیر دے گا۔ پھر انھیں ایک چٹیل میدان بنا کر چھوڑ دے گا۔''

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے حقیقی طور پر آئے گا۔ لہٰذا اس میں اللہ تعالیٰ کے آنے کی دلیل ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقوله ﴿هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ﴾ (البقرہ:٢١٠) (١) وَقَولُ اللهِ تَعالى ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ﴾ (المائدہ:١١٩) (٢)

ترجمہ......: اور اللہ کا فرمان: ''نہیں وہ انتظار کرتے، مگر اس بات کا کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ آئے۔'' اور اللہ کا یہ فرمان: ''اللہ ان سے راضی ہو گیا۔''

تشریح……: (۱) ﴿هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ﴾ ”یعنی نہیں انتظار کرتے کفار۔“

﴿اِلَّآ اَنۡ يَّاۡتِيَهُمُ اللّٰهُ﴾

”مگر یہ کہ آئے ان کے پاس اللہ تعالیٰ۔“

اللہ تعالیٰ فیصلہ کرنے کے لیے آئیں گے۔

﴿فِيۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ﴾

”بادلوں کے سایوں میں۔“

غمام سے مراد بادل ہیں۔

﴿وَ الۡمَلٰٓئِكَةُ﴾

یعنی فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ آئیں گے۔

﴿وَ قُضِيَ الۡاَمۡرُ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ﴾ (البقرہ: ۲۱۰)

”اور فیصلہ کر دیا جائے گا معاملے کا اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے تمام فیصلے۔“

یعنی اللہ تعالیٰ فیصلہ کرنے کے لیے آئیں گے اور وہ یوں کہ لوگ تقریباً پچاس ہزار سال کا طویل عرصہ ٹکٹکی لگائے کھڑے ہوں گے۔ سورج ان کے قریب ہوگا اور وہ پسینے میں غرق ہوں گے۔ کوئی تو مکمل طور پر غرق ہوگا اور کوئی اپنے اعمال کے مطابق گردن سے نیچے تک۔ جب وہ طویل عرصہ کھڑے رہیں گے تو وہ کسی ایسے شخص کو ڈھونڈیں گے جو رب ذوالجلال کے سامنے ان کے لیے سفارش کرے۔ تمام انبیاء انہیں ایک دوسرے کی طرف بھیجتے رہیں گے حتیٰ کہ سفارش کا معاملہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچے گا۔ آپ اپنے رب کے سامنے سجدے میں گر جائیں گے اور دعا کریں گے کہ وہ اپنے بندوں کا فیصلہ کر دے اور اس انتظار سے نجات بخشے۔ پھر اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے تشریف لائیں گے۔

(۲)…… اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت رضا بیان کی ہے اور بتایا ہے

کہ وہ اپنے مومن بندوں سے راضی ہے اور رضا اللہ تعالیٰ کی فعلی صفات میں سے ہے۔ بہت سی آیات میں اس کا ذکر ہے۔

﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾

(المائدہ:۱۱۹، توبہ:۱۰۰، المجادلہ:۲۲، البینہ:۸) وغیرہ۔ چنانچہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفت رضا کا ذکر ہے جیسے اس کی عظمت کے لائق ہے۔

اور یہ مخلوقات کی رضا کے مشابہ نہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بھی صفت رِضا بیان کی ہے اور مخلوق کی بھی۔ فرمایا ﴿وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ اس میں مخلوق کی صفت رضا کا اثبات ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رِضا (خوشی) اور مخلوق کی رِضا میں کوئی مشابہت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اس کے ساتھ خاص ہے اور مخلوق کی رضا ان کے ساتھ خاص اور ان کے مطابق ہے۔

❀❀❀❀❀

وقوله ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ﴾ (المائدہ: ۵۴)(۱)

ترجمہ……: اور اللہ کا فرمان: ''وہ پسند کرے گا ان کو اور وہ محبت کریں گے اس سے۔''

تشریح……: اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے محبت بھی ہے۔ وہ اپنے بندوں کے اعمال کے مطابق ان سے محبت کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ (المائدة: ٥٤)

''اے ایمان والو! تم میں جو بھی اپنے دین سے پھر جائے تو قریب ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کو لے آئے جن کو اللہ پسند کرے اور وہ بھی اللہ سے محبت کریں۔ جو مومنوں کے حق میں نرم اور کافروں کے حق میں سخت ہوں گے۔ اور وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔''

﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾

’’یعنی وہ مومنوں کے لیے نرم ہیں ان پر رحم اور نرمی کرتے ہیں اور عاجزی سے پیش آتے ہیں جبکہ کفار کے لیے سخت ہیں کیونکہ وہ اللہ کے دشمن ہیں۔‘‘

﴿يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾

’’وہ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں۔‘‘

اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنا ان کی عظیم ترین صفات میں سے ہے۔

﴿وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾

’’اور وہ کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔‘‘

یہ بھی ان کی صفات میں سے ہے کہ اللہ کی خاطر وہ کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (المائدہ : ٥٤)

’’یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اسے دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔‘‘

انہی صفات کی وجہ سے وہ اس عظیم مرتبے کے مستحق بنے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا محبوب بنالیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے درج ذیل ارشادات میں بھی صفت محبت کا اثبات ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ (البقرہ : ٢٢٢)

’’بے شک اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو بہت توبہ کرنے والے ہیں اور ان سے محبت کرتا ہے جو بہت پاک رہنے والے ہیں۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (آل عمران : ٧٦)

’’اللہ ڈرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (البقرہ : ١٩٥)

’’نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔‘‘

الغرض اللہ تعالیٰ نیک اعمال اور پاکیزہ افعال کو پسند کرتا ہے۔ اور جسے اللہ تعالیٰ محبوب بنالے گا وہ دنیا و آخرت میں کامیاب ہو جائے گا اور اللہ کی طرف سے اعزاز کا مستحق ہوگا۔

اسی طرح آیت مبارکہ میں اللہ اور مخلوق کی صفت محبت کا اثبات ہے ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خالق و مخلوق کی صفت میں کوئی مشابہت نہیں۔ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱) ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔'' اگرچہ آپ اس صفت کو مخلوق میں بھی پائیں گے لیکن مخلوق میں یہ ان کے مناسب حال ہوگی اور رب ذوالجلال کی صفت کی مثل نہیں ہوگی۔ تمام اسماء و صفات میں یہی قاعدہ ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَوْلُهُ فِي الْكُفَّارِ: ﴿غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ﴾ (المجادلہ: ١٤) (١)

وَقَوْلُهُ: ﴿اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللَّهَ﴾ (محمد: ٢٨) (٢)

وَقَوْلُهُ: ﴿كَرِهَ اللَّهُ انْبِعَاثَهُمْ﴾ (التوبہ: ٤٦) (٣)

ترجمہ......: اور آیات صفات میں سے کفار کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے درج ذیل فرامین بھی ہیں۔

''جن پر اللہ غصے ہو گیا۔'' (المجادلہ:۱۴)

''انھوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے اللہ کو ناراض کر دیا۔'' (محمد:۲۸)

''لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا ناپسند کیا۔'' (التوبہ:۴۶)

تشریح......: اللہ تعالیٰ کی فعلی صفات میں سے ایک غضب (غصہ) ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کفار پر ناراض ہوتے ہیں۔

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ (الفاتحہ: ٧)

''جن پر نہ غصہ کیا گیا اور نہ وہ گمراہ ہیں۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ کفار پر بھی ناراض ہوتے ہیں اور بعض کبائر کے مرتکب افراد پر بھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی حرام کردہ چیزوں پر غیرت کرتے ہیں اور جب اس کی حرمات کو پامال کیا جاتا ہے تو وہ ناراض ہوجاتا ہے۔

﴿وَ مَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَہَنَّمُ خٰلِدًا فِیۡہَا وَ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَ لَعَنَہٗ وَ اَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیۡمًا﴾ (النساء: ۹۳)

''اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والا ہے اور اللہ اس پر غصے ہوگیا اور اس نے اس پر لعنت کی اور اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ قاتل پر مومن کو جان بوجھ کر قتل کرنے کی وجہ سے ناراض ہوتا ہے۔ لٰہذا ثابت ہوا کہ غضب (ناراضگی) اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوتے ہیں اور مخلوق بھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اور مخلوق کی ناراضگی میں فرق ہے کیونکہ مخلوق اور خالق کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ اگرچہ یہ صفت لفظ اور معنی کے اعتبار سے مشترک ہے لیکن باقی تمام صفات کی طرح یہ بھی کیفیت اور حقیقت میں مشترک نہیں۔

(۲)...... اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ ناراض ہوتا ہے۔ ''سخط'' بھی غضب (غصہ) کی ایک قسم ہے۔

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّہُمُ اتَّبَعُوۡا مَاۤ اَسۡخَطَ اللّٰہَ وَ کَرِہُوۡا رِضۡوَانَہٗ فَاَحۡبَطَ اَعۡمَالَہُمۡ﴾ (محمد: ۲۸)

''یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے اللہ کو ناراض کر دیا اور انہوں نے اس کی خوشنودی کو برا جانا تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔''

اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی چیزیں گناہ اور کفر و شرک ہیں۔ الغرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں، اپنے احکامات کی نافرمانی کرنے والوں

اور اپنے منع کردہ کاموں کا ارتکاب کرنے والوں پر ناراض ہوتا ہے۔

﴿تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ فِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ﴾

(المائدہ: ۸۰)

''تو ان میں سے بہت سوں کو دیکھے گا کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہیں جنھوں نے کفر کیا۔ یقیناً برا ہے جو ان کے نفسوں نے ان کے لیے آگے بھیجا کہ اللہ ان پر غصے ہو گیا اور عذاب ہی میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

مخلوق بھی ناراض ہوتی ہے لیکن خالق ومخلوق کے غصہ میں کوئی مشابہت نہیں۔ اگرچہ یہ صفت لفظ اور معنی میں مشترک ہے لیکن خالق ومخلوق کی صفت کی کیفیت بالکل مختلف ہے۔ تمام صفات میں یہی قاعدہ ہے۔

(۳)...... اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ ''ناپسند کرتا ہے''

﴿وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَ قِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾ (التوبہ: ۴۶ تا ۴۷)

''اور اگر وہ نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لیے کچھ سامان ضرور تیار کرتے۔ اور لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا ناپسند کیا تو انھیں روک دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اگر وہ تم میں نکلتے تو خرابی کے سوا تم میں کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے اور ضرور تمھارے درمیان (گھوڑے) دوڑاتے، اس حال میں کہ تم میں فتنہ تلاش کرتے۔ اور تم میں کچھ ان کی باتیں کان لگا کر سننے والے ہیں اور اللہ ان ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔''

یہ آیت غزوہ تبوک کے موقع پر منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب منافقین جہاد سے پیچھے رہ گئے تو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہی انہیں پیچھے رکھا ہے کیونکہ اگر وہ جنگ میں شریک ہوتے تو مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے۔

﴿وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ﴾

''اگر وہ نکلنے کا ارادہ رکھتے۔''

یعنی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کے لیے۔

﴿لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ﴾

''تو وہ ضرور اس کے لیے تیاری کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کا اٹھنا ناپسند کیا۔''

یعنی ان کا جنگ پر جانا ناپسند کیا۔

﴿فَثَبَّطَهُمْ﴾

''چنانچہ اس نے انہیں نکلنے سے سست کر دیا۔''

﴿وَ قِیْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِیْنَ﴾

''اور کہا گیا تم بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی شرکت کے نقصانات بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿لَوْ خَرَجُوْا فِیْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ یَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَ فِیْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ﴾

(التوبہ: ٤٧)

''اگر وہ تم میں نکلتے تو خرابی کے سوا تم میں کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے اور ضرور تمہارے درمیان (گھوڑے) دوڑاتے، اس حال میں کہ تم میں فتنہ تلاش کرتے۔ اور تم میں کچھ ان کی باتیں کان لگا کر سننے والے ہیں اور اللہ ان ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنگ میں ان کی مسلمانوں کے ساتھ شرکت کے درج

ذیل نقصانات بیان فرمائے ہیں:

۱......وہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے تھے۔

۲......وہ فتنہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔

۳......مسلمانوں میں باہمی ناچاکی پیدا کرنا چاہتے تھے۔

۴......مسلمانوں میں سے بعض لوگ ان کی بات سن کر اوران کی باتوں سے متاثر ہوکر ان کی تصدیق کرتے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حکمت کی بنیاد پر انہیں شرکت سے روک دیا۔

اس آیت میں ﴿كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ﴾ کے الفاظ میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض اشخاص اور اعمال کو ناپسند کرتے ہیں۔ مخلوق بھی ناپسند کرتی ہے لیکن باقی تمام صفات کی طرح اللہ تعالیٰ اور مخلوق کی ناپسندیدگی میں فرق ہے۔

❀❀❀❀❀

وَمِنَ السُّنَّةِ: قَوْلُ النَّبِيِّ "يَنْزِلُ رَبُّنَا كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا." (۱)

ترجمہ......: اور سنت میں بیان کردہ صفات میں سے نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''ہر رات ہمارا ربّ آسمان دنیا پر آتا ہے۔''

تشریح......: یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے نزول کے بارے میں صحیح ہے۔ یہ مشہور حدیث ہے جو کئی طرق (سندوں) سے صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے۔

((يَـنْـزِلُ رَبُّنَا إِلَى سَمَاءِ الدُّنْيَا كُلَّ لَيْلَةٍ ، حِيْنَ يَبْقٰى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْآخِـرُ ، فَيَـقُـوْلُ: هَـلْ مِـنْ سَـائِـلٍ فَأُعْطِيَهُ ، هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَلَهُ ، هَلْ مِنْ تَائِبٍ فَأَتُوْبَ عَلَيْهِ .))

''ہمارا رب ہر رات کو آسمان دنیا پر اترتا ہے جبکہ آخری رات کا تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے اور کہتا ہے: ہے کوئی مانگنے والا میں اسے عطا کردوں، ہے کوئی بخشش کا طالب میں اسے بخش دوں، ہے کوئی توبہ کرنے والا میں اس کی توبہ قبول

کرلوں۔‘‘(صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۹۴۔ صحیح مسلم: ۷۵۸)

اسی لیے مستحب ہے کہ انسان رات کے آخری تہائی حصے میں بیدار ہو، اللہ تعالیٰ سے دعا کرے، تہجد پڑھے اور استغفار کرے تاکہ وہ اس عظیم مقام کا مستحق قرار پائے۔ کیونکہ یہ قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔

((هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَأُعْطِيَهُ......))

چنانچہ جب بندہ اس گھڑی میں اپنے رب کے حضور عجز و نیاز کرتا ہے، اس سے بخشش کا طلبگار ہوتا ہے اور اس سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مطالبات کو پورا کردیتا ہے۔

یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ اس کے ثبوت میں کوئی شک نہیں۔ اس کی سند میں کوئی طعن نہیں اور اس میں اللہ عزوجل کے آسمانِ دنیا پر اترنے کی صفت بیان ہوئی ہے۔ اس لیے یہ ایک عظیم حدیث ہے، ہم اسے اس طرح ثابت مانیں گے جیسے یہ نازل ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے اترنے کا اثبات کرتے ہیں جیسا کہ اس نے اپنی یہ صفت بیان فرمائی ہے۔ لیکن ہم اس کی کیفیت کے درپے نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ جیسے چاہتا ہے، اترتا ہے۔ وہ عرش پر مستوی ہے جیسے چاہتا ہے۔ لہٰذا ہم اترنے کی کیفیت کے بارے میں سوال نہیں کریں گے۔ بلکہ نزول (اترنے) کا اثبات کرتے اور اس کی کیفیت کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔

﴿يَنزِلُ رَبُّنَا﴾

رسول اللہ ﷺ نے اترنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے اور اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو کہتے ہیں: ’’ہمارے رب کا حکم اترتا ہے۔‘‘ یہ ایک باطل تاویل ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اترنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے نہ کہ اللہ کے امر کی طرف۔ دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم تو ہر وقت اترتا ہے رات کے آخری تہائی حصے کے ساتھ خاص نہیں۔

علاوہ ازیں اس تاویل کے باطل ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں:

((هَلْ مِنْ سَائِلٍ ......فَأَتُوبَ عَلَيْهِ .))

کیا اللہ تعالیٰ کا امر یہ صدائیں لگا سکتا ہے۔ کیا امر یہ کہتا ہے ’’هَلْ مِنْ سَائِلٍ

فَأَعْطِیَهُ" کیا امر کچھ دیتا ہے؟ امر گناہوں کو بخشتا اور توبہ قبول کرتا ہے؟ یہ تمام تو اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں نہ کہ اس کے امر کی۔

جو رسول اللہ ﷺ سے ہمیں ملا، اس کا اثبات کرتے اور اس کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس کی کیفیت میں الجھ کر یہ نہیں کہتے کہ وہ کیسے اترتا ہے؟ کیا عرش اس سے خالی ہوتا ہے یا نہیں؟ کیا وہ حرکت کے ساتھ اترتا ہے یا بغیر حرکت کے؟ اور اس جیسے دوسرے سوالات۔ مثلاً یہ کہ رات کا تیسرا حصہ تو مختلف مقامات میں مختلف ہوتا ہے؟ ان سب باتوں میں ہم کوئی دخل اندازی نہیں کرتے۔ کیونکہ جس نے مقامات پیدا کیے اور دن رات کو پیدا فرمایا ہے، وہ اللہ جیسے چاہے اتر سکتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہم ان بکواسات اور باطل باتوں میں نہیں پڑتے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس کا ہمیں علم نہیں۔ ہم اس کے مکلّف نہیں۔ آپ کے لیے صرف یہی جاننا کافی ہے کہ وہ ہر رات کے تیسرے پہر میں آسمان دنیا پر اترتا ہے اور یہ کہ تو ان مبارک لمحات سے محروم نہ رہے۔ ہر رات کے آخری تہائی حصے میں کھڑا ہو جائے۔ اللہ سے مانگے، اس سے بخشش طلب کرے اور اس سے توبہ کرے۔

اگر تو اس قسم کے سوالات کرے گا کہ وہ کیسے نازل ہوتا ہے؟ فلاں کام کیسے ہوتا، فلاں کیسے ہوتا ہے؟ رات تو مختلف مقامات پر مختلف وقت میں ہوتی ہے، تو تم انہیں باتوں میں مشغول رہو گے۔ اجر سے محروم رہ جاؤ گے اور یہ عظیم تحائف تجھ سے کھو جائیں گے۔

آپ کو یہ بات پہنچ گئی لہٰذا آپ جلدی سے عمل کریں تاکہ فرصت کے لمحات کھو نہ جائیں اور بے فائدہ سوالات نہ کر۔ یہ ایک بے فائدہ مصروفیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس گھڑی کے بارے میں اس لیے بتایا ہے کہ ہم ہر رات کو اس فرصت سے فائدہ اٹھائیں، اس کی طرف جلدی کریں اور اسے تلاش کریں۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت اور قیمتی فرصت ہے اور ہم سے مطلوب بھی یہی ہے۔

ہم سے عمل مطلوب ہے نہ کہ اشکالات پیدا کرنا کہ اللہ کے بارے میں جہالت پر مبنی باتیں کریں۔ یہ گمراہی ہے۔

وَقَوْلُهُ يَعْجَبُ رَبُّكَ مِنَ الشَّابّ لَيْسَتْ لَهُ صَبْوَةٌ. [1] (ا)

ترجمہ......: اور نبی ﷺ کا یہ فرمان: ''تمہارا رب اس نوجوان سے خوش ہوتا ہے جس کے اندر میلان نفس نہ ہو۔''

تشریح......: (ا) اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی صفت تعجب (پسندیدگی) کا اثبات ہے اور نوجوان سے تعجب کرنے کا مطلب اسے پسند کرنا ہے۔

عجب کی تعریف:

کسی چیز کا معمول سے ہٹ جانا اور یہی تعجب کا سبب بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ میں بھی صفت عجب پائی جاتی ہے اور مخلوق میں بھی لیکن خالق و مخلوق کے تعجب میں فرق ہے۔

الصبوۃ:

اس سے مراد شہوت اور لذت والی چیزوں کی طرف مائل ہونا ہے۔ کیونکہ عام طور پر نوجوان۔ جوانی اور شہوات کی قوت کی وجہ سے شہوت، غفلت اور فضول کاموں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اس لیے جب کوئی نوجوان اس معمول سے ہٹا ہوا ہوتا ہے اور نفس پرستی اور شہوت کی طرف میلان سے کنارہ کش ہوکر اپنی جوانی میں اللہ کی عبادت میں مگن رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہے ہی تعجب کی بات۔ اور دوسری حدیث میں ہے کہ ان سات لوگوں میں سے، جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنا سایہ نصیب فرمائے گا، ایک وہ نوجوان بھی ہے جو عبادت الٰہی میں شب و روز گزارے۔

((شَابًا نَشَأَ فِيْ عِبَادَةِ اللّٰهِ .)) [2]

---

[1] اسے احمدؒ نے اپنی مسند میں (۲۸/۶۰۰) (۱۷۳۷۱) اور قضاعی نے مسند شہاب میں (۱/۳۳۶، ۵۷۶) میں حضرت عقبہ بن عامر الجہنی رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔ اس کی مکمل تخریج وتنقید مسند میں دیکھئے۔ اس کے الفاظ ہیں: "إن الله ليعجب من الشاب ليست له صبوة .))

[2] یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے اسے امام بخاری (۶۶۰) اور امام مسلم رحمہما اللہ (۱۰۳۱) نے بیان کیا ہے۔

ترجمہ......: ''اور وہ نوجوان جو اللہ کی عبادت میں جوانی گزارتا ہے۔''

اس کا جوانی کی عادتوں اور غلبہ شہوت سے نکل جانا اور عبادت کی محبت تعجب خیز چیزیں ہیں۔ یہ اس کی ایمانی قوت کی دلیل ہے۔

جیسا کہ بہت بوڑھے شخص کا بہک اور پھسل جانا تعجب خیز امر ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی عمر ہوتی ہے جس میں شہوت کی طرف میلان انسان کے شایان شان نہیں ہوتا۔ چنانچہ حرام میں واقع ہونا اس کے ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ کلام نہیں کریں گے، ان کی طرف نظر کرم سے نہیں دیکھیں گے اور انہیں گناہوں سے پاک نہیں کریں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ ان میں ایک ''اَلشَّیْخُ الزَّانِیُّ'' [1] یا ''اُشَیْمِطٌ زَان'' [2] ''بوڑھا زانی'' ہے۔

اُشَیْمِطٌ: أَشْمَطُ کی تصغیر ہے۔ یہ حقارت کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

أَشْمَط: اس شخص کو کہتے ہیں جس کے سر میں بڑھاپے کی وجہ سے کچھ سفید بال آ گئے ہوں۔ اس قسم کا شخص عام طور پر عبادت کی طرف توجہ کرتا ہے اور اگر یہ عبادت کی بجائے شہوت پرستی کی طرف مائل ہو تو گویا وہ معمول سے ہٹ گیا۔ سو، اس کا گناہ نوجوان کے گناہ سے زیادہ ہوگا۔ کیونکہ نوجوان کو تو شہوت کی قوت گناہ پر مجبور کرتی ہے جبکہ اس میں شہوت کی قوت نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ صرف گناہ سے محبت کی وجہ سے اس کی طرف مائل ہوتا ہے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی صفت تعجب کا اثبات ہے۔ اور یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو پسند کرتے ہیں اور بعض اعمال اللہ تعالیٰ کو اچھے لگتے ہیں۔ مخلوق بھی تعجب کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ سے فرماتے ہیں:

﴿وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ﴾

---

[1] دیکھئے: مسند احمد (۱۶/ ۱۶۸) (۱۰۲۲۷) اور مسلم (۱۰۷) میں حضرت ابوہریرہ کی روایت۔

[2] طبرانی نے اسے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے (۶/ ۲۴۶) (۶۱۱۱) اور اس کے راویوں کو صحیح حدیث میں دلیل بنایا جاتا ہے۔

''اور اگر تو تعجب کرے تو ان کا یہ کہنا بہت عجیب ہے؛ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم یقیناً ایک نئی پیدائش میں ہوں گے۔'' (الرعد : ۵)

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے نبی کریم ﷺ کی صفت تعجب بیان کی ہے۔ البتہ خالق ومخلوق کے تعجب میں فرق ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَوْلُه ''يَضْحَكَ اللّٰهُ إِلَى رَجُلَيْنِ، قَتَلَ اَحَدُهُمَا الْآخَرَ ثُمَّ يَدْخُلَانِ الْجَنَّةَ''. [1] (ا)

ترجمہ......: اور نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان: ''اللہ تعالیٰ دو آدمیوں کو دیکھ کر ہنسیں گے جن میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کیا ہوگا پھر وہ دونوں جنت میں چلے جائیں گے۔''

تشریح......: (ا) یہ بھی ایک صحیح حدیث ہے۔

((يَضْحَكَ اللّٰهُ إِلَى رَجُلَيْنِ .))

''اللہ تعالیٰ دو آدمیوں کو دیکھ کر ہنسیں گے۔''

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ ہنستا ہے۔ مخلوق بھی ہنستی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے ہنسنے میں فرق ہے۔

((يَضْحَكُ اللّٰهُ إِلَى رَجُلَيْنِ يَقْتُلُ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ كِلَاهُمَا يَدْخُلَانِ الْجَنَّةَ .))

''اللہ تعالیٰ ایسے دو آدمیوں کو دیکھ کر ہنستے ہیں جن میں سے ایک دوسرے کو قتل کرتا ہے۔ پھر وہ دونوں جنت میں داخل ہوجاتے ہیں۔''

اس کی تفسیر یہ بیان ہوئی ہے کہ قاتل کافر اور مقتول مومن تھا۔ کافر نے مومن کو قتل کیا۔ پھر یہ کافر توبہ کرکے مسلمان ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کرلی اور یہ جنت میں داخل ہوگیا یوں وہ قاتل شخص اور شہید مقتول جنت میں جمع ہوگئے۔ یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عظیم امر سے ہنستا ہے۔

[1] احمدؒ نے اسے مسند میں (۱۲/۲۷۹)، (۳۷۲۶)، بخاری نے (۲۸۲۶) اور مسلم رحمہ اللہ نے اسے بیان کیا ہے۔ (۱۸۹۰/۱۲۸)

فَهٰذَا وَمَا أَشْبَهَهُ مِمَّا صَحّ سَنَدُهُ (١) وَعُدلَتْ رُوَاتُهُ (٢) نُؤْمِنُ بِهِ، وَلَا نَرُدُّهُ وَلَا نَجْحَدُهُ (٣) وَلَا نَتَأَوَّلُهُ بِتَأْوِيلٍ يُخَالِفُ ظَاهِرَهُ. (۴)

ترجمہ......: الغرض یہ اور اس جیسی دوسری روایات جن کی سند صحیح اور راوی عادل ہیں۔ ہم ان پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی تردید اور انکار نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی کوئی ایسی تاویل کرتے ہیں جو اس کے ظاہر کے خلاف ہو۔

تشریح......: (۱) یعنی یہ احادیث جن میں اللہ تعالیٰ کی مذکورہ صفات بیان ہوئی ہیں اور ان جیسی دوسری احادیث جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات بیان ہوئی ہیں ان کی سند کا صحیح ہونا ضروری ہے۔

صحیح حدیث:

وہ روایت ہوتی ہے جس کو عادل اور مکمل ضبط والے راویوں نے سند کے شروع سے آخر تک اپنے جیسے راویوں سے بیان کیا ہو اور وہ علت وشذوذ سے بھی محفوظ ہوں۔ یہ پانچ شروط جس حدیث میں پائی جائیں وہ صحیح حدیث ہوتی ہے اور جب اللہ کے رسول ﷺ کی کسی صحیح حدیث میں اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت بیان ہوئی ہو تو اس پر ایمان لانا اور اس کا عقیدہ رکھنا فرض ہے۔ خواہ وہ حدیث متواتر ہو یا خبر واحد کیونکہ یہ بھی علم اور یقین کا فائدہ دیتی ہے۔

گمراہ لوگوں کا قول:

گمراہ لوگ کہتے ہیں: ''خبر واحد اگرچہ صحیح بھی ہو، ظن کا فائدہ دیتی ہے۔'' یہ بات ان کے انکار میں علم کلام اور علم منطق کی ملاوٹ کا نتیجہ ہے۔ اگر ان کا ایمان اور سمجھ صحیح ہوتے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے بارے میں ایسی بات نہ کرتے۔

لیکن اگر سند صحیح نہ ہو تو وہ حدیث ضعیف ہوتی ہے۔ قدیم علماء کے نزدیک حدیث کی دو ہی قسمیں ہیں: صحیح یا ضعیف۔ ان کے نزدیک ''حسن'' بھی ''صحیح'' کی قسم میں ہی داخل ہے۔

حدیث کی اقسام:

متاخرین اہل حدیث کے نزدیک حدیث کی درج ذیل تین قسمیں ہیں۔

(۱)......صحیح (۲)......حسن (۳)......ضعیف

علماء کے مطابق یہ تقسیم سب سے پہلے امام ترمذی رحمہ اللہ نے ذکر کی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے متقدمین کے نزدیک حدیث کی دو ہی قسمیں ہیں۔

(۱) صحیح:......حسن بھی اسی میں داخل ہے۔

(۲) ضعیف:...... یہ عقیدہ کے مسائل میں داخل نہیں ہوسکتی جب تک اس کے ساتھ دوسری دلیلیں نہ مل جائیں۔

اعتراض:

اگر کوئی کہے: ''مؤلف نے یہ جو احادیث بیان کی ہیں ان میں کچھ ضعیف بھی ہیں۔''
تو اس کا جواب یہ ہے کہ: مؤلف نے ایسی روایات اس لیے ذکر کی ہیں کہ ان کو صحیح حدیث سے تقویت ملتی ہے اور یہ اصل کے تحت ہی داخل ہیں۔ ضعیف روایت جب کسی صحیح اصل کے تحت داخل ہو تو اس کو اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن اگر اس کو کسی صحیح حدیث سے تقویت نہ ملتی ہو تو عقیدہ کے مسائل میں اس کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

(۲)......سند کے صحیح ہونے میں یہ بھی ایک شرط ہے۔ کیونکہ کوئی سند اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتی جب تک اس کے راوی عادل نہ ہوں۔ یہاں اس کو تاکید کے لیے دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔

(۳)......یعنی گمراہ لوگوں کے برعکس ہم اس پر ایمان لاتے اور اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس کی تردید نہیں کرتے، جبکہ گمراہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کو ردّ کرتے ہیں اور اپنے خود ساختہ منطقی اور کلامی قواعد کی بنیاد پر کہتے ہیں: ''یہ احادیث علم کا فائدہ نہیں دیتیں۔'' لیکن ہم ان کی طرح نہیں کرتے بلکہ ان سے اور ان کے اس کام سے براءت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان احادیث پر عمل کرتے اور جس چیز پر یہ دلیل ہیں اس کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

((وَلَا نَجْحَدُہُ .))

''اور ہم اس کا انکار نہیں کرتے۔''

اگر ہم ان سے ثابت اسماء وصفات کی نفی کریں تو یہ ان کا انکار کہلائے گا جبکہ ہم ان کی نفی نہیں کرتے بلکہ ان سے ثابت اسماء وصفات کو اسی طرح مانتے ہیں جیسے اللہ و رسول نے انہیں ثابت کیا ہے۔ مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے صحیح ثابت اسماء وصفات پر ایمان لائے، ان کے سامنے سر تسلیم خم کرے، اپنی عقل و فکر، اعتراضات اور شکوک وشبہات کو ان میں دخل نہ کرے۔ گمراہ کرنے والوں کی گمراہی اور شک میں ڈالنے والوں کے شبہات کو قبول نہ کرے۔

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۝﴾ (الاحزاب : ٣٦)

''اور کبھی بھی نہ کسی مومن مرد کا حق ہے اور نہ کسی مومن عورت کا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں کہ ان کے لیے ان کے معاملے میں اختیار ہو اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے، یقیناً وہ گمراہ ہو گیا، واضح گمراہ ہونا۔''

الغرض بنیاد ثبوت اور صحت پر ہے۔ چنانچہ جو اسماء وصفات ثابت ہوں ان پر ایمان لانا، انہیں قبول کرنا، ان کا اثبات کرنا اور ان پر کسی تردد، توقف اور گمراہوں کی باتوں کی طرف توجہ دیے بغیر عمل کرنا واجب ہے۔

(۴)...... کیونکہ یہ مخالفین کا طریقہ ہے کہ وہ یا تو سرے سے ہی اسماء وصفات کا انکار کر دیتے ہیں اور انہیں قبول ہی نہیں کرتے۔ یا اثبات تو کرتے ہیں لیکن تاویل کے ساتھ۔ کیونکہ جب وہ نصوص کو رد کرنے سے عاجز آ جاتے ہیں تو تاویل کا سہارا لیتے ہیں۔

تاویل:

اس سے مراد کسی لفظ کو اس کے صحیح معنی سے کسی دوسرے غیر صحیح معنی کی طرف پھیرنا ہے۔ لہٰذا گمراہ لوگ نصوص کو ان کے ظاہر سے دوسرے معانی کی طرف پھیرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں۔

''ید'' کا معنی قدرت، ''وجہ'' کا معنی ذات باری تعالیٰ اور ''استواء'' کا معنی عرش پر بلند ہونا ہے۔

یہ نصوص چونکہ قرآن وسنت میں ثابت ہیں اور وہ ان نصوص کو رد نہیں کر سکتے اس لیے وہ ان کی تاویل (غلط معنی بیان کرنے) کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

وَلَا نُشَبِّهُهُ بِصِفَاتِ الْمَخْلُوْقِيْنَ (ا) وَلَا بِسَمَاتِ الْمُحْدَثِين.

ترجمہ......: نہ ہی ہم اسے مخلوق کی صفات کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور نہ ہی مخلوقات کے خصائص سے۔

تشریح......: ہم اس کی تردید و تاویل نہیں کرتے اور نہ ہی انہیں تشبیہ دیتے ہیں جیسا کہ گمراہوں کا دوسرا گروہ ان دلائل کو ثابت کرتا ہے۔ وہ نہ تو ان کے ثبوت کے بارے میں بات کرتے ہیں اور نہ ہی معانی کے بارے میں۔ بلکہ وہ انہیں مخلوق کی صفات سے تشبیہ دیتے ہیں۔ انہیں مشبہہ اور ممثلہ کہا جاتا ہے اور یہ بھی تعطیل کی طرح باطل مذہب ہے۔

صحیح مذہب:

حق مذہب اسماء وصفات کو ان کے الفاظ اور معانی کے ساتھ، کسی تاویل وتشبیہ کے بغیر ثابت کرنا ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيْرُ ۝﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے مثل کی نفی کی ہے اور اپنے لیے سماعت وبصارت کا اثبات کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ مخلوق میں سے کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں۔

اور دوسری آیت میں ہے:

﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ﴾ (النحل : ۷۴)

''پس اللہ کے لیے مثالیں بیان نہ کرو۔''

یعنی کسی کو اللہ تعالیٰ کے مشابہ اور مثل قرار نہ دو۔

ایک آیت میں ہے:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (الاخلاص : ٤)

''اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے۔''

یعنی کوئی اس کے مساوی اور برابر نہیں۔

دوسری آیت میں ہے:

﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا﴾ (مریم : ٦٥)

''کیا تو اس کا کوئی ہم نام جانتا ہے؟''

یعنی آپ کو کوئی ایسی ذات نہیں ملے گی جو حقیقت میں اس کے نام کی مستحق اور اس کی مثل ہو۔

﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ (البقرہ : ٢٢)

''پس اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ۔''

انداد:

اس سے مراد مشابہ اور مماثل ہیں۔ یعنی کسی اعتبار سے بھی کوئی اس کے مشابہ نہیں، نہ تو اس کی معبود ہونے میں اور نہ ہی اس کے اسماء وصفات اور افعال میں۔

جبکہ مشبہہ دلائل کو مانتے بھی ہیں اور ان کی تاویل بھی نہیں کرتے۔ مگر وہ اثبات میں اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے تشبیہ دے دی۔ یہ باطل اور معطّلہ کے مذہب کے برابر ہے۔ دونوں گروہوں کا قول ہی جہالت پر مبنی اور باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا درج ذیل قول مشبہہ کی تردید کرتا ہے۔

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾......''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔''

اور معطلہ کی تردید اللہ تعالیٰ کے درج ذیل فرمان سے ہوتی ہے۔

﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾

''اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

(۱) السمّات:......اس سے مراد صفات اور خصائص ہیں۔

الـمُـحْدَثُون :......اس سے مراد مخلوقات ہیں۔ کیونکہ ہر مخلوق عدم سے وجود میں آئی ہے۔ الغرض ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات اور خصائل سے تشبیہ نہیں دیتے۔ صفات اور سمات کا معنی ایک ہی ہے لیکن اسے تاکید کے لیے دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَنَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ لَا شَبِيْهَ لَهُ وَلَا نَظِيْرٌ (۱) ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ (۲) (الشورى: ۱۱) وَكُلُّ مَا تُخَيَّلُ فِي الذِّهْنِ أَوْ خطرَ بِالْبَالِ، فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ بِخلافِهِ. (۳)

ترجمہ......: اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے مشابہ اور ہم مثل کوئی چیز نہیں۔ اور ذہن میں جس شکل کا بھی خیال آئے یا عقل پر دستک دے بے شک اللہ تعالیٰ اس کے برخلاف ہے۔

تشریح......: (۱) یہی اہل حق کا عقیدہ ہے کہ بلاشبہ کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کے مشابہ اور ہم مثل نہیں۔

نظیر:

اس سے مراد وہ چیز ہے جو کسی چیز کے برابر ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے برابر کوئی چیز نہیں۔ جب آپ کہتے ہیں کہ یہ چیز فلاں چیز کی نظیر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز اُس چیز کے برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسماء وصفات میں کوئی اس کے مشابہ نہیں اور جس عبادت اور عظمت وکمال والی صفات کا مستحق اللہ تعالیٰ ہے، اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس میں مشبہہ کا ردّ ہے جنہوں نے اسماء وصفات کے اثبات میں اس حد تک غلو کیا کہ ان کو

مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دے دیا۔

اور پہلا گروہ معطلہ کا ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے میں اس حد تک غلو کیا کہ اسے اسماء وصفات سے عاری قرار دے دیا۔

چنانچہ ایک گروہ نے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے میں غلو کیا اور یہ معطلہ ہیں۔ جبکہ دوسرے گروہ نے اثبات میں غلو کیا اور یہ مشبہہ ہیں۔

لیکن ہم اہل سنت والجماعت والے سلفی لوگوں کا عقیدہ درمیانہ ہے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے اسماء کو معطل نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ کو نقائص سے اس طرح پاک قرار دیا کہ تعطیل نہیں کی۔ اس کے لیے تشبیہ وتمثیل کے بغیر اسماء وصفات کا اثبات کیا۔ چنانچہ ہم ''منزہ'' ''مشبہہ'' اور ''ممثلہ'' کے غلو سے بچ گئے۔ مشبہہ اور ممثلہ میں سے ہر ایک اپنے مذہب میں غلو کرتا ہے۔

لیکن الحمد للہ اہل سنت جماعت حقہ وطائفہ منصورہ والے سلفی لوگ کتاب وسنت کے تقاضوں کے مطابق اعتدال پر ہیں۔ اور حق ہمیشہ دو گمراہیوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

(۲)...... یہ آیت کریمہ اہل حق کے لیے میزان ہے۔ یہ معطلہ اور مشبہہ کا رد کرتی اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا تعطیل وتشبیہ کے بغیر اثبات کرتی ہے۔

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾

کے الفاظ سے مشبہہ کا ردّ ہوتا ہے۔ جنہوں نے اثبات میں غلو کیا اور ﴿وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ کے الفاظ سے معطلہ کا رد ہوتا ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ (پاکی بیان کرنے) میں اس حد تک غلو کیا کہ بزعم خویش تشبیہ سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی نفی ہی کردی۔ چنانچہ وہ اس سے بری تشبیہ میں مبتلا ہوگئے جس سے بچنا چاہتے تھے۔ اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو معدومات اور ممتنعات سے تشبیہ دے دی۔

(۳)...... ذہن وفکر میں اللہ تعالیٰ کی تصویر نہیں بنائی جاسکتی۔ کیونکہ وہ تو ہر چیز سے بلند و برتر ہے۔ لہٰذا کسی کے لیے جائز نہیں کہ اس کی ذات وصفات کی کیفیت کے بارے میں سوچے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا﴾

(طٰہٰ: ۱۱۰)

”وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔“

مخلوقات علم کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ اس کی ذات اور اسماء و صفات کا اُس کے علاوہ کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ تو مخلوقات کا احاطہ کر سکتا ہے مگر مخلوقات اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔

اللہ تعالیٰ کا نہ تو احاطہ کیا جا سکتا ہے، نہ اس کی حقیقت کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تصویر کشی کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ ہر چیز سے عظیم تر ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ذات اور حقیقت کے بارے میں تیرے ذہن میں جو بھی خیال آئے، اللہ تعالیٰ اس کے برخلاف ہے۔ کیونکہ افکار و خیالات اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

❀❀❀❀❀

وَمِنْ ذٰلِكَ قَوْلُهُ ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰہٰ: ٥) (١)

ترجمہ......: اور صفات کے اثبات پر دلالت کرنے والی آیت میں سے ایک یہ بھی ہے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ ......”وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا۔“

تشریح......: (۱) اللہ عزوجل کی صفات کے اثبات پر دلالت کرنے والی آیات میں درج ذیل سات آیات بھی ہیں۔

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ ......”وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا۔“

﴿الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَاسْاَلْ بِهِ خَبِيْرًا﴾ (الفرقان: ٥٩)

''وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر بلند ہوا، بے حد رحم والا ہے۔ سو اس کے متعلق کسی پورے باخبر سے پوچھ۔''

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (الاعراف : ٥٤)

''بے شک تمھارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر بلند ہوا، رات کو دن پر اوڑھا دیتا ہے، جو تیز چلتا ہوا اس کے پیچھے چلا آتا ہے۔ اور سورج اور چاند اور ستارے (پیدا کیے) اس حال میں کہ اس کے حکم سے تابع کیے ہوئے ہیں۔ سن لو! پیدا کرنا اور حکم دینا اسی کا کام ہے۔ بہت برکت والا ہے اللہ جو سارے جہانوں کا رب ہے۔''

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۝﴾ (یونس : ٣)

''بے شک تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔ ہر کام کی تدبیر (وہیں سے) کرتا ہے۔ کوئی سفارش کرنے والا نہیں مگر اس کی اجازت کے بعد۔ وہی اللہ تمھارا رب ہے، سو اس کی عبادت کرو۔ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔''

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ۝﴾ (الرعد : ٢)

''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے، جنھیں تم دیکھتے ہو۔ پھر وہ عرش پر بلند ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ہر ایک، ایک مقرر وقت کے لیے چل رہا ہے، وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے، کھول کھول کر آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرلو۔''

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ط مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا شَفِیْعٍ ط اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ۝﴾ (السجدہ : ٤)

''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔ اس کے سوا تمھارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔''

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ط یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ط وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۝﴾ (الحدید : ٤)

''وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔ وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے۔ اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے۔ اور وہ تمھارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو اور اللہ اسے جو تم کرتے ہو، خوب دیکھنے والا ہے۔''

ان تمام آیات سے اللہ تعالیٰ کا عرش پر ''استواء'' ثابت ہوتا ہے۔

عرش:

یہ مخلوقات کی چھت اور سب سے بڑی مخلوق ہے، تمام مخلوقات اس کی نسبت بہت چھوٹی ہیں۔

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ﴾ (البقرہ: ۲۵۵)

''اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو سمائے ہوئے ہے۔''

کرسی اور عرش مختلف ہیں:

کرسی کی حالت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ عرش کی نسبت ایک ایسے کڑے کی طرح ہے جسے چٹیل میدان میں پھینک دیا گیا ہو۔ کرسی نے اگرچہ آسمان وزمین کو گھیر رکھا ہے لیکن اس کے باوجود وہ عرش کی نسبت ایک چٹیل میدان میں پڑی ہوئی انگوٹھی کی طرح ہے اور ایک انگوٹھی بہت بڑے میدان کی بھلا کتنی جگہ گھیر سکتی ہے؟

لہٰذا عرش ایک عظیم مخلوق ہے اور یہ تمام مخلوقات سے اوپر اور جنت الفردوس اس کے نیچے ہے کیونکہ جنت الفردوس کی چھت اللہ تعالیٰ کا عرش ہے۔

عرش کی لغوی تعریف:

لغت میں عرش اس تخت کو کہتے ہیں جس پر بادشاہ بیٹھتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے عرش کی عظمت اور لمبائی چوڑائی تصور وعقل کے احاطے سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں اس کو ذکر کیا اور اس کی عظمت بیان فرمائی ہے:

۱ .... ﴿رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ (التوبہ: ۱۲۹)

''وہی عرش عظیم کا رب ہے۔''

۲ .... ﴿رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ﴾ (المؤمنون: ۱۱۶)

''عزت والے عرش کا رب ہے۔''

۳ .... ﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ﴾ (البروج: ۱۵)

''عرش کا مالک ہے، بڑی شان والا۔''

یہ تمام آیات اس عظیم مخلوق عرش کی عظمت کی دلیل ہیں۔

استواء سے کیا مراد ہے:

اسلاف نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ اس سے مراد بلندی، ٹھہرنا، چڑھنا اور بلند ہونا ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ کا قول:

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فَلَهُمْ عِبَارَاتٌ عَلَيْهَا أَرْبَعٌ قَدْ حُصِلَتْ لِلْفَارِسِ الطَّعَّانِ وَهِيَ اسْتَقَرَّ وَقَدْ عَلَا وَكَذٰلِكَ ارْتَفَعَ الَّذِيْ مَا فِيْهِ مِنْ نُكْرَانٍ وَكَذَاكَ قَدْ صَعِدَ الَّذِيْ هُوْ رَابِعٌ وَأَبُوْ عُبَيْدَةَ صَاحِبُ الشَّيْبَانِيْ يَخْتَارُ هٰذَا الْقَوْلَ فِيْ تَفْسِيْرِهٖ أَدْرٰى مِنَ الْجَهْمِيِّ بِالْقُرْآنِ.

''اس مسئلہ میں ان (اسلاف) کی کئی عبارتیں ہیں۔ ان میں سے چار فارس الطعان نے بیان کی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں ''استقر''، ''علا''، اسی طرح ''ارتفع'' جس کے بارے میں کوئی تعجب وانکار نہیں۔ اسی طرح چوتھا معنی ''صعد'' ہے۔ اور امام محمد بن حسن شیبانی کے شاگرد ابوعبیدہ نے اپنی تفسیر میں اسی قول کو اختیار کیا ہے جو کہ قرآن کے (معانی وتفسیر کے) متعلق جہمی (صفات باری تعالیٰ سے متعلق ایک گمراہ فرقے کا قائد) سے زیادہ علم دروایت رکھتے ہیں۔''

سلف نے ''استواء علی العرش'' کی یہی تفسیریں کی ہیں لیکن گمراہ لوگ استواء کی تفسیر ''استیلاء'' کے ساتھ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''استوی علی العرش'' کا معنی ہے ''استولیٰ علیه'' (اس نے اس پر قبضہ کرلیا)۔ یہ تفسیر نہ تو عربوں میں معروف ہے اور نہ ہی لغت میں اس کی کوئی دلیل ہے، سوائے ایک شعر کے جسے انہوں نے اخطل کی طرف منسوب کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

قَدِ اسْتَوَى بِشْرٌ عَلَى الْعِرَاقِ مِنْ غَيْرِ سَيْفٍ وَلَا دَمٍ مُهْرَاقِ

''بشر نے عراق پر بغیر کسی تلوار کے اور خون بہانے کے قبضہ کرلیا۔''

لیکن اخطل تو عیسائی تھا۔ اس کے کلام سے دلیل اس لیے نہیں پکڑی جاسکتی کہ عیسائی ونصرانی تو خود گمراہ ہیں۔

علاوہ ازیں یہ شعر اخطل سے ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اس کے مشہور دیوان میں نہیں ہے۔

لہٰذا لغت عرب میں استواء کی تفسیر ''استیلاء'' کے ساتھ قطعاً نہیں جا سکتی۔ یہ ایک بدعتی تفسیر ہے۔ اور یہ شعر خود ساختہ ہے، اسے لغت عرب میں داخل کرنا جھوٹ ہے۔ یہ تو ایک دلیل ہوئی جبکہ دوسری دلیل:

دوسری دلیل یہ ہے کہ اس سے ایک باطل نتیجہ لازم آئے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ جب ہم ''استوی'' کی تفسیر ''استولی علی العرش''(عرش پر قبضہ کرلیا) کے ساتھ کریں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ عرش پہلے اللہ تعالیٰ کے پاس نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کے پہلے مالک سے چھینا اور اس پر غالب آ کر اس کا مالک بن گیا۔ (العیاذ باللہ) حالانکہ یہ عقیدہ کفر اور گمراہی ہے۔

علاوہ ازیں اگر ''استواء'' کی تفسیر ''استیلاء'' (قبضہ کرنا) کی جائے تو یہ صرف عرش تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات پر بعد میں قبضہ کیا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس تفسیر کا بیس (۲۰) وجوہات کے ذریعے ردّ کیا ہے۔ یہ آپ کو فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ میں مل سکتی ہیں۔

مزید برآں ''استواء'' کا ذکر سات آیات میں آیا ہے اور سب میں یہی لفظ ہے:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ (الاعراف: ٥٤)، (طٰہ: ٥)

اور ان میں سے کسی میں بھی ''استولی'' کے الفاظ نہیں ہیں جن کی بنیاد پر ''استوی'' کی تفسیر یہ کی جاسکے۔ لہٰذا جب تمام آیات میں ایک ہی طرح کے الفاظ ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا معنی بھی ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے ''علوّ''(بلندی) اور ''ارتفاع'' (بلند ہونا)۔ اور استواء چونکہ فعلی صفات میں سے ہے، اس لیے اس کا عطف ''ثم'' کے ساتھ ''خلق السموات والارض'' پر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ (الحدید: ٤)

''وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر

بلند ہوا۔‘‘

الغرض یہ اللہ تعالیٰ کی صفات افعال میں سے ہے۔ وہ جب چاہے یہ کام کرتا ہے۔

علوّ (بلندی):

یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ذاتی ہے جو اس سے کبھی الگ نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہی بلند رہتا ہے۔ لیکن ’’استواء‘‘ اللہ تعالیٰ کی فعلی صفت ہے جسے وہ جب چاہتا ہے سرانجام دیتا ہے۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ:

اہل سنت والجماعت سلفی جماعت حقہ وطائفہ منصورہ، اللہ تعالیٰ کے عرش پر قائم ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں: قرآن کریم میں استواء کئی معانی میں آتا ہے۔ یہ لازم غیر متعدی نہیں آتا۔ جیسے اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰی﴾ (القصص: ۱۴)

’’اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا اور پورا طاقتور ہوگیا۔‘‘

اس کا معنی ہے: مکمل اور پورا ہونا۔ اور جب اسے ’’الی‘‘ کے ساتھ متعدی کیا جاتا ہے تو اس کا معنی ہوتا ہے قصد کرنا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ﴾ (البقرہ: ۲۹)

’’پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔‘‘

اور جب اس کو ’’واؤ‘‘ کے ساتھ متعدی کیا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے برابری۔ مثلاً آپ کہتے ہیں۔

((اِسْتَوَی الْمَاءُ وَالْخَشَبَةُ .)) ...... ’’یعنی پانی اور لکڑی برابر ہوگئے۔‘‘

((اِسْتَوٰی فُـلَانٌ وَفُـلَانٌ .)) ...... ’’یعنی فلاں اور فلاں برابر ہوگئے۔‘‘

اور جب اسے ’’علیٰ‘‘ کے ساتھ متعدی کیا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے: بلند ہونا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا

تَرۡکَبُوۡنَ o لِتَسۡتَوٗا عَلٰی ظُهُوۡرِهٖ﴾ (الزخرف : ۱۲ تا ۱۳)

''اور وہ جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے اور تمھارے لیے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ تا کہ تم ان کی پیٹھوں پر جم کر بیٹھو۔''

یعنی تم ان پر چڑھتے ہو اور سفر میں کشتیوں اور جانوروں کی پشت پر ٹھہرتے ہو۔ اسی سے ہے اللہ تعالیٰ کا درج ذیل فرمان:

﴿ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ﴾ (الاعراف : ٥٤)

''پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔''

اس میں اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ وہ ''بلند ہوا اور چڑھا'' لیکن یہ سب اسی طرح ہوتا ہے جیسے اس کی عظمت کے لائق ہے۔ یہ مخلوق کے چڑھنے یا مخلوق کے مخلوق پر بیٹھنے یا قائم ہونے کی طرح نہیں بلکہ خالق و مخلوق کے ''استواء'' (قائم ہونے) میں فرق ہے۔

❁❁❁❁❁

وَقَوۡلُهٗ تَعَالٰی: ﴿ءَاَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ﴾ (الملك : ١٦) (١)

ترجمہ......: اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے۔''

تشریح......: (۱) مکمل آیت یوں ہے:

﴿ءَاَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمُ الۡاَرۡضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوۡرُ o اَمۡ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یُّرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا فَسَتَعۡلَمُوۡنَ کَیۡفَ نَذِیۡرِ o﴾ (الملك : ١٦ تا ١٧)

''کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمھیں زمین میں دھنسا دے۔ چنانچہ زمین تو اچانک حرکت کرنے لگے؟ یا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھراؤ والی آندھی بھیج دے، پھر عنقریب تم

جان لو گے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے؟''

السماء:

اس سے مراد ''علوٗ'' (بلندی) ہے۔ چنانچہ ﴿مَنۡ فِی السَّمَآءِ﴾ سے مراد: ''من فی العلو'' ہے۔ یعنی اس کا ظاہری معنی ہے ''بلندی میں''۔ لیکن اگر ''سماء'' سے مراد وہ آسمان لیا جائے جس کی سات تہیں (سات طبق) ہیں تو ''فی السماء'' کا معنی ہوگا: آسماں پر۔ کیونکہ ''فی'' ''علیٰ'' کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ﴾ ...... ''پس زمین میں چلو پھرو۔''

یعنی زمین پر چلو پھرو۔ اور:

﴿وَ لَاُصَلِّبَنَّکُمۡ فِیۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ﴾ (طٰہٰ : ۷۱)

''اور ضرور ہر صورت تمھیں کھجور کے تنوں پر بری طرح سولی دوں گا۔''

لہٰذا جب آسمان سے مطلق بلندی مراد لی جائے تو ''فی'' اپنے ظاہری معنی (ظرفیت) میں استعمال ہوگا۔ اور مراد ہوگا ''بلندی میں''۔ اور اگر وجودی آسمان مراد لیا جائے تو ''فی السماء'' کا معنی ''علی السماء'' کریں گے۔ اور ''فی السماء'' سے مراد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں میں داخل ہے۔ کیونکہ آسمان مخلوق ہیں اور اللہ عزوجل اپنی مخلوقات میں سے کسی چیز میں داخل نہیں ہوتا۔ اس کی ذات میں کوئی مخلوق شامل ہے اور نہ ہی اس کی ذات کا کوئی حصہ مخلوقات میں ہے۔ بلکہ وہ اپنی مخلوقات سے جدا ہے۔

اس میں جہمیہ اور معطلہ کا بھی رد ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفت بیان نہیں کی جائے گی کہ وہ بلندی میں ہے اور جہاں میں داخل یا جہاں سے خارج ہے۔ حالانکہ اس سے مراد عدم ہے۔ کیونکہ جو چیز نہ کائنات کے اندر ہو نہ اس سے باہر وہ معدوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بلند ہے اس سے جو وہ کہتے ہیں۔

ایسے ہی اس آیت مبارکہ میں ''حلولیہ'' کا بھی ردّ ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز میں داخل ہے۔

وَقَوْلُ النَّبِيِّ ﷺ ((رَبُّنَا اللّٰهُ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ تَقَدَّسَ اسْمُكَ)) (۱) وَقَالَ لِلْجَارِيَةِ ((أَيْنَ اللّٰهُ؟ قَالَتْ: فِي السَّمَآءِ قَالَ: اَعْتِقْهَا فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ.)) [1] (۲)

ترجمہ......: اور نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''اے آسمان میں رہنے والے ہمارے پروردگار اللہ! پاک (مقدس) ہیں تیرے نام''۔ اور آپ ﷺ نے ایک لونڈی سے پوچھا: ''اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا: آسمان میں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اسے آزاد کردو کیونکہ یہ مومنہ ہے۔''

تشریح......: (۱) جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ آسمان میں ہے، ایسے ہی نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنے رب کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ آسمان میں ہے۔ چنانچہ ''رقیہ'' کی (دم والی) مشہور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((رَبُّنَا اللّٰهُ الَّذِيْ فِي السَّمَاءِ، تَقَدَّسَ اسْمُكَ، أَمْرُكَ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، كَمَا رَحْمَتُكَ فِي السَّمَاءِ، فَاجْعَلْ رَحْمَتَكَ فِي الْأَرْضِ، اِغْفِرْلَنَا حُوْبَنَا وَخَطَايَانَا، أَنْتَ رَبُّ الطَّيِّبِيْنَ، أَنْزِلْ رَحْمَةً مِّنْ رَّحْمَتِكَ، وَشِفَاءً مِنْ شِفَائِكَ عَلٰى هٰذَا الْوَجْعِ.))

''اے ہمارے رب اللہ! جو آسمان و زمین میں رہنے والا ہے، پاک ہیں تیرے نام۔ تیرا حکم آسمان و زمین میں چلتا ہے۔ جیسے تیری رحمت آسمان میں ہے اسی طرح اسے زمین میں بھی (عام) کردے۔ ہمارے گناہ اور غلطیاں معاف فرما

---

[1] امام مالکؒ نے اسے مؤطا میں (۲/۲۹۲) (۱۵۳۴)، امام احمد نے مسند میں (۳۹/۱۷۵) (۲۳۷۶۲)، امام مسلم نے (۵۳۷) اور ابوداؤد رحمہم اللہ جمیعاً نے (۹۳۰) بیان کیا ہے۔ امام مالکؒ کے علاوہ سب نے اسے معاویہ بن حکم السلمی سے بیان کیا ہے۔ امام مالکؒ نے یحییٰ بن یحییٰ اللیثی کی روایت کے مطابق عمر بن حکم سے بیان کیا ہے اور یہ تمام اہل علم کے نزدیک وہم ہے۔ کیونکہ صحابہ میں عمر بن حکم نامی کوئی شخص نہیں بلکہ معاویہ بن حکم ہے۔ دیکھئے: جامع الاصول لابن اثیر (۱/۲۲۹۔ ۲۳۰، ۱۲).

دے، اپنی رحمتوں میں سے رحمت بھیج اور اپنی طرف سے اس درد کی شفا عطا فرما۔'' ❶

اس میں محل شاہد ''الذی فی السماء'' کے الفاظ ہیں۔جن میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے رب کی صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ آسمان میں ہے۔

اس حدیث میں اگرچہ ضعف ہے لیکن اس سے پہلے جو آیت گزری ہے۔﴿ءَ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَآءِ﴾ وہ اس کی تائید کرتی ہے۔اس کتاب کے مصنف اور دوسرے مصنّفین بعض اوقات عقائد کے باب میں ضعیف احادیث بیان کر دیتے ہیں، لیکن ان پر کلی طور پر اعتماد نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ صحیح احادیث کے تحت بیان کی جاتی ہیں اور یہ ان کے معنی کی تائید کرتی ہیں۔الغرض یہ صرف تقویت دینے کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔

❀❀❀❀❀

رَوَاهُ مَالِكُ بْنُ اَنَسٍ وَمُسْلِمٌ وَغَيْرُهُما مِنَ الْأَئِمَّةِ. (۱)

ترجمہ......: اسے ائمہ کرام میں سے مالک بن انس اور مسلم رحمہما اللہ وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

تشریح......: (۱) یہ حدیث صحیح مسلم میں ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ معاویہ بن حکم السلمی رضی اللہ عنہ کی ایک لونڈی تھی۔ ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ کو اس پر غصہ آ گیا اور آپ نے اس کے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔ پھر شرمندہ ہوئے، نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور اس کو آزاد کرنے کے بارے میں پوچھا۔ کیونکہ آپ اسے اپنے اس فعل کے کفارہ کے طور پر آزاد کرنا چاہتے تھے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس لونڈی سے پوچھا: ''اللہ کہاں ہے؟'' اس نے کہا: ''آسمان میں''۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''میں کون ہو؟'' اس نے کہا: اللہ کے رسول۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے آزاد کر دو کیونکہ یہ مومنہ ہے۔'' ❷

---

❶ ابوداؤد رحمہ اللہ نے اسے ابودرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے۔

❷ امام مالک رحمہ اللہ نے اسے موطا میں (۲/۲۹۲) (۱۵۳۴)، احمد نے مسند میں (۳۹/۱۷۵) (۲۳۷۶۲)، امام مسلم نے (۵۳۷) اور ابوداؤد رحمہم اللہ جمیعاً نے (۹۳۰) میں بیان کیا ہے۔

جب اس لونڈی نے کہا ''اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو نبی اکرم ﷺ نے اس کے ایمان کی گواہی دی۔ اس کی بات کا اثبات کیا اور یہ درج ذیل آیت والا ہی مفہوم ہے۔

﴿ءَ أَمِنتُم مَّن فِى السَّمَآءِ﴾

اس حدیث سے یہ سوال کرنے کا جواز ملتا ہے کہ ''اللہ کہاں ہے؟'' اور یہ معطلہ کے خلاف سخت ترین دلیل ہے۔ ان کے نزدیک یہ سوال ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ ''اللہ کہاں ہے؟'' کیونکہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کسی جہت میں نہیں۔ اور جو کسی طرف میں بھی نہ ہو اس کے بارے میں یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کہاں ہے۔

لہٰذا یہ حدیث ان کی آنکھوں میں چبھتی ہے اور ان کے اوپر سب سے سخت حدیث یہی ہے۔ ان میں سے بعض کہتے ہیں: یہاں ''أين'' کا معنی ہے ''مَن'' ۔ لہٰذا ''أين اللّٰه'' کا معنی ہے: ''مَنِ اللّٰهُ '' ......اللہ کون ہے؟ کیا عرب و عجم کی لُغت میں کسی جگہ ''أين'' ''مَنْ'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے؟ مگر یہ جھوٹے لوگ ہیں اور جھوٹ سے نہیں بچتے۔ جبکہ حدیث بھی آیت کی طرح صریح اور بالکل واضح ہے۔ اور اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے آسمان میں ہونے کا انکار کرتا ہے وہ مومن نہیں۔ اور جو شخص اللہ کی بلندی کا منکر ہے وہ بھی ایماندار نہیں۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لِحُصَيْنٍ ''كَمْ إِلٰهًا تَعْبُدُ؟ قَالَ سَبْعَةٌ، سِتَّةٌ فِي الْأَرْضِ وَوَاحِدًا فِي السَّمَاءِ. قَالَ وَمَنْ لِرَهْبَتِكَ وَرَغْبَتِكَ؟ قَالَ: الَّذِىْ فِى السَّمَآءِ. قَالَ فَاتْرُكِ السِّتَّةَ، وَاعْبُدِ الَّذِىْ فِى السَّمَآءِ، وَأَنَا أُعَلِّمُكَ دَعْوَتَيْنِ. فَأَسْلَمَ وَعَلَّمَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَقُوْلَ: اَللّٰهُمَّ أَلْهِمْنِىْ رُشْدِىْ وَقِنِىْ شَرَّ نَفْسِىْ.'' (۱)

ترجمہ......: اور نبی کریم ﷺ نے حصین رضی اللہ عنہ سے پوچھا: تو کتنے معبودوں کو پوجتا ہے؟ اس نے کہا سات کو۔ چھ زمین میں ہیں اور ایک آسمان میں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تو اپنی خوشی

اور ڈر کے وقت کسے پکارتا ہے؟ اس نے کہا: اس ذات کو جو آسمان میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم چھ کو چھوڑ دو اور صرف اسی کی عبادت کرو جو آسمان میں ہے اور میں تمہیں دو دعائیں سکھاتا ہوں۔'' چنانچہ وہ مسلمان ہوگئے اور نبی کریم ﷺ نے انہیں یہ دعائیں سکھائیں: ''اے اللہ! مجھے سمجھداری عطا فرما اور میرے نفس کے شر سے مجھے بچالے۔'' (جامع الترمذی، حدیث: ۳۴۸۳۔ رواہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہما)

تشریح......: (ا) یہ حدیث صفت علو (بلندی) کے دلائل میں سے ہے۔ حدیث یوں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جناب عمران رضی اللہ عنہ کے والد سیّدنا حصین رضی اللہ عنہ سے سوال کیا: تو کتنے معبودوں کو پوجتا ہے؟ نبی اکرم ﷺ دراصل اس سے توحید کا اقرار اور شرک کا ابطال کرانا چاہتے تھے۔ اور یہ صرف ایسی دلیل سے ہی ممکن تھا جسے مدمقابل بھی مانتا ہو۔ انھوں نے جواب دیا: میں سات معبودوں کو پوجتا ہوں۔ ان میں سے چھ زمین میں ہیں اور ایک آسمان میں۔ یعنی ''اللہ تعالیٰ''۔ آپ ﷺ نے سوال کیا: تو خوف اور امید کے وقت کسے پکارتا ہے؟ انہوں نے کہا: اس ذات کو جو آسمان میں ہے۔''

اس سے مشرکین کی حالت کا علم ہوتا ہے کہ وہ عبادت کے معاملے میں کس پاگل پن کا شکار تھے۔ جب انہوں نے توحید کو چھوڑا تو بہت سے معبودان باطلہ کے پجاری بن گئے۔ اللہ تعالیٰ جناب یوسف بن یعقوب علیہما السلام فرماتے ہیں:

﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۳۹ تا ۴۰)

''اے قید خانے کے دو ساتھیو! کیا الگ الگ رب بہتر ہیں یا اللہ، جو اکیلا ہے،

نہایت زبردست ہے؟ تم اس کے سوا عبادت نہیں کرتے مگر چند ناموں کی، جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حکم (شریعت وفیصلہ) اللہ کے سوا کسی کا نہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت مت کرو۔ یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ط اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ط بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

(الزمر: ۲۹)

''اللہ نے ایک آدمی کی مثال بیان کی جس میں ایک دوسرے سے جھگڑنے والے کئی شریک (حصے دار) ہیں۔ اور ایک دوسرے آدمی کی جو سالم ایک ہی آدمی کا ہے۔ کیا دونوں مثال میں برابر ہیں؟ سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ بلکہ ان کے اکثر نہیں جانتے۔''

یہ ایک توحید پرست اور مشرک کی مثال ہے۔ چنانچہ مشرک کی مثال اس غلام کی سی ہے جس کے بہت سے آقا ہوں۔ اسے سمجھ نہیں آتی کہ وہ ان میں سے کسے راضی کرے؟ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا شوق مختلف ہے۔ ہر ایک کی پسند دوسرے سے مختلف ہے اور وہ غلام ان کے مختلف مطالبات کی وجہ سے پریشان ہوجاتا ہے۔ اسے سمجھ نہیں آتی کہ ان میں سے کس کو راضی کرے؟ وہ ساری زندگی ان مختلف آقاؤں کی وجہ سے بے چینی میں رہتا ہے۔

لیکن توحید پرست کی مثال اس غلام کی سی ہے جس کا ایک ہی آقا ہو۔ وہ اس کی پسند اور مطالبات کو جانتا ہے۔ اس لیے وہ اس کے ساتھ سکون سے رہتا ہے۔ ایسے ہی جو شخص ایک معبود کی عبادت کرتا ہے، مطمئن رہتا ہے اور جو زیادہ معبودوں کی پوجا کرتا ہے وہ بے چین اور پریشان رہتا ہے کہ کون سے کام کے ذریعے ان میں سے ہر ایک کی قربت حاصل

کرسکتا ہے؟

جناب حصین رضی اللہ عنہ نے بھی یہی بتلایا کہ وہ سات معبودوں کی پوجا کرتے ہیں۔ چھ زمین میں اور ایک آسمان میں ہے جو اللہ ربّ العالمین ہے۔ چنانچہ اس میں اس بات کا اثبات ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے۔ حتیٰ کہ مشرکین بھی اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حصین رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''تو خوف اور امید کے وقت کسے پکارتا ہے؟'' یعنی جب تجھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو تو کس کی طرف رجوع کرتا اور اپنی ضروریات مانگتا ہے؟ اور جب تجھے کسی چیز کا ڈر ہو تو کس سے امن مانگتا ہے؟ تو انہوں نے کہا: اس ذات سے جو آسمان میں ہے۔

توحید اس دلیل کے ساتھ مزید پختہ ہوگئی کہ یہ متعدد معبودان باطلہ آسانی اور تنگی میں کوئی فائدہ نہیں دیتے۔ آسانی وتنگی میں فائدہ دینے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور یہ بات مشرکین کے نزدیک بھی ثابت شدہ ہے کہ جب وہ مشکل میں پھنستے ہیں تو صرف ایک اللہ سے ہی دعا کرتے ہیں، اپنے معبودان باطلہ کو بھول جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مصائب اور پریشانیوں سے اللہ کے سوا کوئی نجات نہیں دے سکتا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چھ کو چھوڑ دے اور صرف اسی کی عبادت کر جو آسمان میں ہے اور اس میں تجھے دو جملے سکھلاتا ہوں۔'' چنانچہ حضرت حصین رضی اللہ عنہ مسلمان ہوگئے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں درج ذیل کلمات سکھلائے:

((اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِی رُشْدِیْ ، وَأَعِذْنِیْ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ .))

''اے اللہ! مجھے میری ہدایت عطا فرما اور میرے نفس کے شر سے مجھے محفوظ رکھ۔''

جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو ہدایت عطا فرمادیتا ہے تو اسے دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں مل جاتی ہیں۔

ہدایت دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ہر معاملے میں صحیح اور حق کو اختیار کرنے کی توفیق دے اور جب اللہ تعالیٰ اسے نفس کے شر اور بخل سے بچالے تو وہ حق تلفی، لوگوں پر ظلم اور ہر طرح سے لوگوں کے مال لوٹنے سے بچ جاتا ہے۔ صرف حلال اور جائز چیزوں پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ مزید برآں اس کا دل اللہ کے راستے میں خرچ کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ پھر یہ چیز اللہ کے پاس اس کے لیے ذخیرہ ہوجاتی ہے۔ لہٰذا جب انسان کو ان دو عادتوں کی توفیق مل جائے تو گویا اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے دنیا وآخرت دونوں کی بھلائیاں جمع کردیں۔

محل شاہد:

اس حدیث میں محل شاہد صفت ''علو'' کا اثبات ہے۔ کیونکہ حضرت حصین رضی اللہ عنہ نے اعتراف کیا کہ اللہ بلندی میں ہے اور یہ کہ وہ صرف اسی کو خوف ورجاء کے وقت پکارتا ہے۔ چنانچہ اس میں توحید اور اللہ تعالیٰ کے عبادت اور خوف ورجاء کے تنہا مستحق ہونے کا اثبات ہے۔

❀❀❀❀❀

وَفِيمَا نُقِلَ مِنْ عَلَامَاتِ النَّبِيِّ ﷺ وَاَصْحَابِهٖ فِي الْكُتُبِ الْمُتَقَدِّمَةِ، أَنَّهُمْ يَسْجُدُوْنَ بِالْأَرْضِ، وَيَزْعُمُوْنَ أَنَّ إِلٰهَهُمْ فِي السَّمَاءِ. (ا)

ترجمہ......: اور گزشتہ کتب میں نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جو علامات بیان ہوئی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ سجدہ تو زمین پر کریں گے لیکن یقین یہ رکھیں گے کہ ان کا معبود آسمان میں ہے۔

تشریح......: (ا) یہ اثر اسرائیلیات میں سے ہے۔ اس میں اس امت کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ سجدہ تو زمین پر کرتے ہیں لیکن عقیدہ یہ رکھتے ہیں کہ ان کا معبود آسمان میں ہے۔ اور یہ کہ اس امت کا عقیدہ صفت علو کا اثبات اور اللہ تعالیٰ کو آسمان میں ماننا ہے۔ یہ روایت اگرچہ اسرائیلیات میں سے ہے جن سے ہمیں ہمارے پروردگار کی کتاب اور پیارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت نے بے نیاز کردیا ہے۔ لیکن مؤلف نے اسے یہاں صرف

تائید کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس سے وہ صحیح دلائل زیادہ پایہ ثبوت کو پہنچ جاتے ہیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے۔

❀❀❀❀❀

وَرَوَي ابُوْدَاوُدَ فِیْ سُنَنِهِ؛ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: "إِنَّ مَا بَیْنَ سَمَاءٍ إِلَی سَمَاءٍ مَسِیْرَةُ کَذَا وَکَذَا. وَذَکَرَ الْخَبَرَ إِلَی قَوْلِهِ: وَفَوْقَ ذَالِكَ الْعَرْشُ، وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ فَوْقَ ذَالِكَ. (ا) [1]

ترجمہ......: اور ابوداؤد رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے کہ: بے شک نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان اتنا اتنا فاصلہ ہے۔'' اور آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''اور اس کے اوپر عرش ہے اور عرش سے اوپر اللہ تعالیٰ ہے۔''

تشریح......: (ا) یہ حدیث شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی کتاب ''کتاب التوحید'' کے آخر میں بیان ہوئی ہے اور یہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کئی احادیث میں آسمان و زمین کے درمیانی فاصلے کا ذکر ہے۔ بالتحقیق یہ ۵۰۰ سال کا فاصلہ ہے۔ اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان کا فاصلہ بھی ۵۰۰ سال بیان ہوا ہے۔ ہر آسمان کی موٹائی ۵۰۰ سال ہے۔ اور آسمانوں سے اوپر ایک سمندر ہے اس کی تہہ سے اس کی اوپر والی سطح تک کا فاصلہ ۵۰۰ برس ہے۔ اس سے اوپر کرسی ہے۔ کرسی کے اوپر اللہ ذوالجلال کا عرش ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے اوپر ہے۔

اس میں اللہ تعالیٰ کے تمام مخلوقات سے بلند ہونے کا اور عرش پر قائم ہونے کا اثبات ہے جیسا کہ اس پر کتاب وسنت کے بہت سے دلائل دلالت کرتے ہیں۔

جو تمام مخلوقات سے بلند اور بڑا ہے۔ مزید برآں اس میں مخلوقات اور اس کائنات کی عظمت اور اس کی وسعت اور عظیم فاصلوں کا ذکر ہے۔

---

[1] مسند احمد (۳/۲۹۲۔ ۲۹٤)، (۱۷۷۰، ۱۷۷۱)، ابوداؤد (٤۷۲۳۔ ٤۷۲۵)، ترمذی (۳۳۲۰)، ابن ماجه (۱۹۳) یہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

فَهٰذَا وَمَا اَشْبَهَهُ مِمَّا أُجْمَعَ السَّلَفُ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ عَلَى نَقْلِهِ وَقَبُوْلِهِ، وَلَمْ يَتعَرَّضْ لِرَدِّهِ وَلَا تَأْوِيْلِهِ وَلَا تَشْبِيْهِهِ وَلَا تَمْثِيْلِهِ.(۱)

ترجمہ......: پس یہ اور اس جیسی دوسری صفات کو نقل وقبول کرنے پر اسلاف رحمہم اللہ کا اجماع ہے۔ انہوں نے ان کو ردّ کرنے اور ان کی تاویل وتشبیہ اور تمثیل کی کوشش نہیں کی۔

تشریح......: مؤلف رحمہ اللہ نے جو قرآنی آیات اور احادیث نبویہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے اثبات کے لیے پیش کی ہیں ان کے نقل وقبول پر امت کا اجماع ہے۔ امت نے اس کی تاویل وتشبیہ کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یہ جس طرح اللہ ورسول نے بیان کی ہیں اسی طرح انہیں قبول کیا ہے۔ ان میں شک نہیں کیا اور اپنی عقل وفہم کو اس میں دخل نہیں دیا۔ نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق پر قیاس کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بڑا ہے۔ اس کو اس کی مخلوق پر قیاس کرتے ہوئے معطلہ کی طرح نہیں کہیں گے کہ یہ صفات تو مخلوق میں بھی موجود ہیں۔ اگر ہم انہیں اللہ تعالیٰ میں مانیں گے تو یہ مخلوق کے ساتھ تشبیہ ہو جائے گی۔

بلکہ ہم کہیں گے: یہ ایک عظیم قاعدہ ہے کہ خالق ومخلوق کی صفات میں بھی کوئی مشابہت نہیں جیسا کہ خالق ومخلوق کی ذات میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔ صرف الفاظ اور معانی میں مشترک ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ حقیقت اور کیفیت میں بھی مشابہت ہے۔

جو شخص اس قاعدہ کو جانتا اور سمجھتا ہے، اس کے لیے اسماء وصفات کی کوئی آیت مشکل نہیں۔ یہ مشکل تو اسے پیش آتی ہے جو اس قاعدہ کو پہچانتا اور سمجھتا نہیں۔ اسی وجہ سے اس کے دل میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔

جو شخص خالق ومخلوق کی ذات اور صفات کے فرق کا یہ قاعدہ جانتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات کے لیے ثابت کردہ صفات کے اثبات اور اس کی نفی کردہ صفات کی نفی میں ادنیٰ سے شک میں بھی مبتلا نہیں ہوتا۔ اور یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نمائندے تھے جو

اپنی خواہش سے نہیں بولتے تھے۔ بلکہ ان کی زبان اطہر سے نکلنے والا ہر لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی پر مبنی ہوتا تھا۔

اسلاف نے ان دلائل کو بیان کیا، پڑھا، یاد کیا اور ایک دوسرے سے نقل کیا، لیکن انہیں ان کے ظاہر اور مفہوم کے بارے میں کوئی اشکال پیدا نہیں ہوا۔ نہ ہی انہوں نے اس میں شک کیا کہ ان دلائل کے معانی کی تاویل کی کوشش کے بغیر ان کا اقرار اور اجراء واجب ہے۔ ان تمام شکوک وشبہات سے بچنا واجب ہے جو دل میں کھٹکتے ہیں یا جو انسانوں اور جنوں میں سے شیطان لوگ اللہ کے بندوں کو گمراہ کرنے اور قرآن وسنت سے دور کرنے کے لیے ان کے ذہنوں میں ڈالتے ہیں۔

قرآن وسنت انتہائی واضح اور فصیح ہیں۔ ان سے کوئی ایسا معنی مراد نہیں لیا جاسکتا جو اس کے ظاہر کے مخالف ہو، اگر قرآن وسنت کے دلائل سے الفاظ کے ظاہر سے ہٹ کر کوئی مراد ہوتی تو لوگ قرآن وسنت سے گمراہ ہوجاتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن وسنت کو لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے اور انہیں لوگوں کو گمراہ کرنے اور ان کی نصوص کے مدلولات کے مخالف عقیدے پر مجبور کرنے کے لیے نازل نہیں کیا۔ اگر ایسا عقیدہ ہوتو یہ قرآن وسنت کو فہم ودانش کی گمراہی سے متصف کرنے کے مترادف ہوگا۔ اسی لیے ان لوگوں کو تاویل وتحریف کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حالانکہ یہ اللہ عزوجل کے کلام اور اس کے رسول ﷺ کے فرمان پر غیر واضح اور گمراہ کن ہونے کا الزام ہے۔

سو، علماء کا اجماع اس دعوے کی دلیل ہے کہ کتاب وسنت کو اپنے ظاہر پر محمول کیا جائے گا۔ اور جس چیز پر یہ دلالت کریں اس کا عقیدہ رکھنا واجب ہے۔ ورنہ کتاب وسنت ہدایت کے لیے نہیں بلکہ ان لوگوں کے گمان کے اعتبار سے گمراہی کا سبب بن جاتے، کہ جنہوں نے ان دلائل کو مشکوک قرار دیا، ان کی تاویل کرنے لگے اور ان کو ان کے مدلولات سے پھیر کر اپنی خواہشات اور عقل کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔

حالانکہ ان پر واجب تھا: ''اپنی عقل وسمجھ کو تو الزام دے دیتے لیکن کتاب وسنت پر

الزام نہ دھرتے۔ کیونکہ ان کی عقل و سمجھ ہی نقص اور تہمت کا محل ہیں۔ جبکہ کتاب وسنت تو دانا وبزرگ ربّ العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ (فصلت : ٤٢)

''اس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، ایک کمال حکمت والے، تمام خوبیوں والے کی طرف سے اتاری ہوئی ہے۔''

اور کتاب وسنت سے بڑھ کر کون سی تشریح اور دلالت واضح ہے۔ کاش! وہ عقل سے کام لیتے۔

بعض گمراہ لوگ کہتے ہیں: ''قرآن وسنت لفظی چیزیں ہیں۔ یہ یقین کا فائدہ نہیں دیتیں، بلکہ یقین کا فائدہ تو عقلی اور منطقی قواعد دیتے ہیں۔''

یہ حق سے انحراف ہے۔ اگر کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے ہدایت نہیں ملتی تو اور کس چیز سے ملے گی۔

❀❀❀❀❀

سُئِلَ مَالِكُ بْنُ اَنَسٍ الْاِمَامُ رحمہ اللہ، **فَقِيلَ: يَا أَبَا عَبْدِ اللّٰهِ ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَي الْعَرْشِ اسْتَوَي﴾** (طه : ٥) **كَيْفَ اسْتَوَى؟ فَقَالَ الْاِسْتِوَاءُ غَيْرُ مَجْهُولٍ، وَالْكَيْفُ غَيْرُ مَعْقُولٍ، وَالْإِيمَانُ بِهِ وَاجِبٌ، وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ، ثُمَّ أَمَرَ بِالرَّجُلِ فَأُخْرِجَ** (ا). ❶

ترجمہ......: امام مالک بن انس رحمہ اللہ سے پوچھا گیا ''اے ابو عبداللہ آیت ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ میں استواء کی کیفیت کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''استواء معلوم ہے اس کی کیفیت سمجھ میں نہیں آ سکتی، اس پر ایمان لانا واجب اور اس کے بارہ میں سوال کرنا بدعت ہے۔'' پھر آپ نے اس آدمی کو نکالنے کا حکم دیا اور اس کو (مجلس سے) نکال دیا گیا۔

---

❶ دیکھئے: اللالکائی کی ''شرح أصول اعتقاد اهل السنة والجماعة'' جلد نمبر:۱، ص:۲۴ (۶۶۴)۔

تشریح......: (۱) امام مالک بن انس رحمہ اللہ امام دارالہجرہ اور ائمہ اربعہ میں سے ایک بڑے امام ہیں۔ آپ ہی وہ مشہور عالم ہیں جن کی طرف مدینہ منورہ کے لیے اونٹوں کو تیز دوڑایا جاتا تھا۔ جن کے متعلق کہا گیا ہے: جب امام مالک رحمہ اللہ مدینہ میں موجود ہوتے تو کوئی دوسرا عالم فتویٰ نہیں دیتا تھا۔ جب آپ رحمہ اللہ سے دوران درس ایک آدمی نے سوال کیا: اے ابوعبداللہ!

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰہ: ۵) ''وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا۔''

وہ کیسے عرش پر قائم ہے؟

تو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

''اَلْاِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ .''

''استواء معلوم ہے۔ دوسری روایت میں ہے۔ ''اَلْاِسْتِوَاءُ غَيْرُ مَجْهُوْلٍ''

''استواء کا معنی معلوم ہے۔''

حالانکہ اس آدمی نے معنی کے بارے میں نہیں بلکہ کیفیت کے بارے میں سوال کیا تھا۔ لیکن امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: ہمیں صرف معنی سے غرض ہے اور معنی معلوم ہے۔ جب معنی معلوم ہے تو لفظ سے بھی یہی مقصود ہوگا۔ اور آپ اس کے بارے میں سوال کر سکتے ہیں۔

فرض کریں آپ کو معنی کا علم نہیں تو ہم آپ کو اس کی وضاحت کر دیں گے۔ کیونکہ اسے ہم جانتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اللہ ربّ العرش الکریم کے متعلق اس کیفیت کے بارے میں پوچھیں تو یہ سوال ہی غیر معقول ہے۔ یہ سوال کرنا جائز نہیں، کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی کیفیت کو نہیں جانتے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا﴾

(طٰہ: ۱۱۰)

''وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

ہم اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسماء وصفات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ انہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ مخلوق میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسماء وصفات کی کیفیت کو نہیں جانتا کیونکہ اللہ بہت عظیم ہے۔

((اَلْکَیْفُ غَیْرُ مَعْقُوْلٍ لَنَا .))

یعنی ہماری عقل اسماء وصفاتِ باری تعالیٰ کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتی اور آپ کو کیفیت کے بارے میں ہم سے سوال کرنے کا حق نہیں۔ کیونکہ اسے ہماری عقل نہیں سمجھ سکتی اور نہ ہی ہمارے لیے اس کا جواب دینا ممکن ہے۔

پھر آپ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اَلْاِیْمَانُ بِهِ وَاجِبٌ'' یعنی استواء کو اس کے حقیقی معنی کے ساتھ ماننا، اس کی کیفیت کو جاننے کی کوشش نہ کرنا اور بسر وچشم اسے تسلیم کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

''وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ''

یعنی کیفیت کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔ یہ آپ نے اس لیے فرمایا کیونکہ سائل نے کیفیت کے بارے میں سوال کیا تھا۔

گمراہ لوگ کہتے ہیں: ''معنی کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا واجب ہے۔'' لیکن یہ باطل عقیدہ ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا۔ امام مالک رحمہ اللہ پر یہ الزام لگاتے ہیں۔ آپ رحمہ اللہ نے تو اس کی وضاحت کی اور فرمایا ''اَلْاِسْتِوَاءُ غَیْرُ مَجْهُوْلٍ'' یعنی معنی معلوم ہے۔ لہٰذا اس کے بارے میں سوال کیا جا سکتا ہے۔

''وَالْکَیْفُ غَیْرُ مَعْقُوْلٍ''

کیفیت سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ لہٰذا اس کے بارے میں سوال کرنا جائز نہیں۔

''وَالْاِیْمَانُ بِهِ وَاجِبٌ .''

یعنی استواء پر لفظی ومعنوی طور پر ایمان لانا واجب ہے۔

''وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ .''

یعنی کیفیت کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔ کیونکہ آدمی نے کیفیت کے بارے میں سوال کیا تھا معنی کے بارے میں نہیں۔

پھر آپ رحمہ اللہ نے اس آدمی سے کہا:

"مَا أَرَاكَ إِلَّا رَجُلَ سُوْءٍ ."

"میرے خیال میں تو ایک برا آدمی ہے۔"

پھر آپ نے لوگوں کو حکم دیا اور اسے آپ کی مجلس سے نکال دیا گیا۔ تمام علماء پر اسی طرح واجب ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو دور کریں جو لوگوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں نکال باہر کریں تاکہ وہ ادب سیکھیں اور لوگوں کے سامنے رسوا ہوں۔ آپ نے اس کو اپنے حلقہ سے نکالنے کا حکم اس لیے دیا تھا کیونکہ وہ علم حاصل کرنے نہیں آیا تھا بلکہ مغالطے پیدا کرنے کے لیے آیا تھا۔

سوال کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔ ہر چیز کے بارے میں سوال نہیں کیا جاتا بلکہ صرف ایسے امور کے بارے میں سوال کرنا چاہیے جو مشکل ہوں اور لوگوں کو ان کی ضرورت ہو مثلاً عبادات اور معاملات وغیرہ تو ان چیزوں کے بارے میں سوال کرنا قابل تعریف ہے۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ٤٣)

"اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجے مگر مرد، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ سو علم والوں سے پوچھ لو، اگر تم شروع سے نہیں جانتے۔"

جبکہ غلط قسم کے سوالات کرنا اور ایسے سوالات کرنا جو محض تکلف، وقت ضائع کرنے اور لوگوں کو پریشان کرنے والے ہوں اور لوگوں کو ان کی ضرورت نہ ہو، حرام ہے۔ اس سے رکنا اور ایسا کرنے والے کو سزا دینا واجب ہے۔ جیسا کہ امیر المومنین سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایسے رنگ ساز کو سزا دی اور اسے مدینہ سے نکال دیا جو قرآن کے ان متشابہ مقامات کے بارے میں سوال کرتا تھا جن کی لوگوں کو ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ (دیکھئے: سنن الدارمی: ۱۴۶، ۱۵۰) لہٰذا

ایسے سوالات کرنے والوں کو ان کی حد میں روکنا واجب ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے بھی اس آدمی کو اپنے حلقہ سے ادب سکھانے کے لیے اور طلباء علم کو شکوک وشبہات سے بچانے کے لیے باہر نکالا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے تدریجا بڑھنے اور پھر کم ہونے کے بارے میں سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال سے ہٹ کر جواب دیا اور فرمایا:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝﴾ (البقرہ: ۱۸۹)

''وہ تجھ سے نئے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دے وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے وقت معلوم کرنے کے ذریعے ہیں۔ اور نیکی ہرگز یہ نہیں کہ گھروں میں ان کی پچھلی طرفوں سے آؤ، بلکہ نیکی اس کی ہے جو بچے (تقویٰ اختیار کرے) اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔''

یعنی انہوں نے اس کی حقیقت کے بارے میں پوچھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے فوائد بیان کردیے۔ کیونکہ سوال ان کے بارے میں کرنا چاہیے تھا۔ جبکہ کسی چیز کی حقیقت اور کیفیت کے بارے میں سوال کرنے میں لوگوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب سے اعراض کیا اور انہیں دوسرا جواب دیا۔

﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝﴾ (البقرہ: ۱۸۹)

''کہہ دے وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے وقت معلوم کرنے کے ذریعے ہیں اور نیکی ہرگز یہ نہیں کہ گھروں میں ان کی پچھلی طرفوں سے آؤ، بلکہ نیکی اس کی

ہے جو (تقویٰ کے ساتھ) بچے۔ اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔''

علماء کہتے ہیں: اس میں اشارہ ہے کہ صرف انہی چیزوں کے بارے میں سوال کرنا چاہیے جن کی لوگوں کو ضرورت ہو۔ اور یہ ایسے دروازے ہیں جن میں سے طالب علم کو گزرنا چاہیے اور گھروں میں ان کے پیچھے سے داخل نہیں ہونا چاہیے۔ ایسے شخص کی مثال جو غیر ضروری، تکلف اور شکوک وشبہات پر مبنی سوالات کرتا ہے اس شخص کی طرح ہے جو گھر میں پیچھے سے یا چھت سے تکلیف اٹھاتے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ جبکہ وہ شخص جو دروازہ کھول کر اور اجازت لے کر گھر میں داخل ہوتا ہے یہی درست راستے سے اندر آنے والا ہے۔ اسی طرح علم کے بھی دروازے ہیں۔ ایک طالب علم کو چاہیے کہ انہی دروازوں میں سے داخل ہو۔ اور آیت کی تفسیر کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ جاہلیت میں لوگ جب قسم کھا لیتے تھے کہ وہ احرام کی حالت میں دروازے سے گھر میں داخل نہیں ہوں گے تو وہ دروازے سے داخل ہونا حرام سمجھتے تھے اور گھر کی پچھلی جانب سے داخل ہوتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کام سے منع کر دیا اور واضح کر دیا کہ احرام کی حالت میں دروازے سے گھر میں داخل ہونا ممنوع نہیں اور نہ ہی یہ احرام کے منافی ہے۔ بلکہ یہ تو محض ایک ایسا تکلف ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔

بعض بدعتی لوگ آج کے دور میں بھی احرام کی حالت میں چھت کے نیچے داخل نہیں ہوتے۔ چھت والی گاڑی پر سوار نہیں ہوتے اور گاڑی کی چھت اتار دیتے ہیں۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ احرام کی حالت میں اور جمرہ کو کنکریاں مارتے ہوئے اپنے اوپر کپڑوں سے سایہ کر لیتے تھے۔ نمرہ کے مقام پر آپ کے لیے خیمہ لگایا جاتا، آپ اس میں احرام کی حالت میں داخل ہوتے اور خیمے اور کپڑے سے اپنے اوپر سایہ کرنے سے نہیں رکتے تھے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسانی ہے۔

حاصل کلام:

یہ ہے کہ اس آدمی نے امام مالک رحمہ اللہ سے اللہ عزوجل کی استواء والی کیفیت کے بارے میں سوال کیا تھا حالانکہ اس سوال کا کوئی فائدہ اور ضرورت نہ تھی۔ اور نہ ہی یہ عقل کے احاطہ میں آ سکتا تھا۔ لوگوں کو چاہیے کہ اس سے رک جائیں۔ اُس پر واجب تھا کہ آیت ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ میں استواء کے معنی کے بارے میں سوال کرتا۔ تب اسے اس کے بارے میں بتا دیا جاتا کہ اس کا معنی اللہ کا اپنے عرش پر بلند ہونا ہے۔

❁❁❁❁❁

فصل دوم:

اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت کلام کا اثبات

مصنف رحمہ اللہ بعض صفات پر گفتگو کرنے کے بعد ایک مستقل فصل میں صفت کلام کا تذکرہ فرما رہے ہیں۔ کیونکہ اس مسئلہ کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور اس میں بہت سے لوگ گمراہ اور منحرف ہوئے ہیں۔

یہ صفت کلام بھی اللہ تعالیٰ کی باقی تمام صفات کی طرح ہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفت ہے کہ وہ جیسے اور جب چاہتا ہے کلام فرماتا ہے۔ کلام، اللہ تعالیٰ کی فعلی صفات میں سے ہے۔ وہ جب چاہتا ہے کلام فرماتا ہے۔ اس نے ماضی میں بھی کلام فرمایا۔ مستقبل میں اور قیامت کے دن بھی کلام کرے گا۔

ربّ کریم کی صفت کلام اپنی نوع کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ میں تمام صفات کی طرح قدیم ہے، اس کی کوئی ابتداء نہیں۔ اسی طرح اس کے اسماء وصفات اور اُس کے افعال کی کوئی ابتداء نہیں۔ البتہ الگ الگ ہر بات حادث ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے جب چاہتا ہے کلام فرماتا ہے۔لیکن الگ الگ ہر بات موقع بہ موقع پیدا ہوتی ہے اور وجود میں آتی ہے۔

یہی اہل سنت والجماعت سلفی اہل حق کا عقیدہ ہے۔ اس بارے میں بہت سی آیات و احادیث ہیں جنہیں مصنف رحمہ اللہ نے مختصراً بیان فرمایا ہے۔صفت کلام میں جہمیہ اور ان کے ہم خیال گمراہ لوگوں کے علاوہ کسی نے مخالفت نہیں کی۔

جہمیہ کا قول:

جہمیہ کہتے ہیں: ’’اللہ تعالیٰ کلام نہیں فرماتا بلکہ اس نے اپنا کلام جناب جبریل علیہ السلام یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پیدا کر دیا ہے۔ اور اللہ کی طرف کلام کی نسبت کرنا ایسے ہی ہے جیسے مخلوق کو خالق کے درجے تک پہنچا دینا۔‘‘ لہٰذا ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو قطعاً صفت کلام سے متصف

نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو بھی کلام کرتا ہے وہ مخلوق ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے کلام کو پیدا فرمایا ہے۔ وہ یا تو جبریل ہیں یا محمد ﷺ اور یہ (قرآن کریم) ان کا کلام ہے۔ یہی معتزلہ کا مذہب ہے گویا معتزلہ اور جہمیہ کا مذہب برابر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کلام کی نفی کرتے اور کہتے ہیں کہ اللہ کا کلام مخلوق ہے۔

اشاعرہ:

انہوں نے باہم مخالف دونوں مذاہب کو جمع کرنا چاہا۔ چنانچہ انہوں نے کہا: ''اللہ تعالیٰ صرف نفسی کلام کے ساتھ متصف ہے۔'' یعنی اس کا کلام صرف اس کے دل میں ہوتا ہے اور وہ کسی حرف یا آواز کے ساتھ کلام نہیں کرتا کہ جسے سنا جا سکے۔ بلکہ یہ تو اللہ کے دل کا کلام ہے جسے جبریل علیہ السلام یا محمد ﷺ نے اپنے لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

لہٰذا اشاعرہ کے نزدیک قرآن کریم اللہ کا ایسا کلام ہے جسے جبریل علیہ السلام یا محمد ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے مقصود کو اپنے لفظوں میں بیان کر دیا۔ الغرض قرآن کے معانی اللہ کی طرف سے ہیں جبکہ اس کے الفاظ مخلوق کی طرف سے ہیں۔

یوں انہوں نے دو متناقض باتوں کو جمع کر دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک قرآن مخلوق بھی ہے اور غیر مخلوق بھی۔ یہ الفاظ وحروف کے اعتبار سے تو مخلوق ہے لیکن معنی کے اعتبار سے مخلوق نہیں۔ لیکن یہ مؤقف باطل اور متناقض ہے۔

اہل سنت والجماعت کا مؤقف:

اہل سنت والجماعت سلفی اہل حق کا مؤقف یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں اللہ کا کلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حقیقی طور پر ان کو بولا، جبریل نے ان کو سنا اور محمد ﷺ کو پہنچایا۔ نہ تو معانی کے بغیر محض الفاظ کلام اللہ ہیں اور نہ ہی الفاظ کے بغیر محض معانی اللہ کا کلام ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے بغیر واسطے کے کلام کیا اور انہوں نے کلام اللہ کو سنا۔ اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خاص طور پر کلیم اللہ کہا جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ﴾

(البقرہ: ۲۵۳)

''یہ رسول، ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا۔''

اس آیت مبارکہ میں ''مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ'' سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بغیر واسطے کے کلام کیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو سنا، اس لیے انہیں تمام رسولوں میں سے ''کلیم اللہ'' کا خصوصی لقب عطا کیا گیا۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں سے کلام فرمائیں گے۔ اہل جنت سے کلام فرمائیں گے، انہیں سلام کہیں گے اور ان کے سلام کا جواب دیں گے جسے وہ سنیں گے۔ اور اہل جنت اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے واضح طور پر اس طرح دیکھیں گے جیسے لوگ چودھویں کے چاند کو یا صاف آسمان پر روشن آفتاب کو دیکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کلام کرتا رہا ہے اور جب چاہتا ہے حقیقی طور پر لفظی اور معنوی کلام کرتا ہے۔ لیکن اس کی کیفیت تکلم سے ہم واقف نہیں۔ اسے اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اللہ کا کلام مخلوق کے کلام کی طرح نہیں۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہتے کہ اللہ بھی مخلوق کی طرح کلام کرتا ہے۔ بلکہ ہم کہتے ہیں: وہ جیسے چاہتا ہے کلام کرتا ہے۔ باقی تمام صفات کی طرح اس کی کیفیت کو بھی اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

❀❀❀❀❀

وَمِنْ صِفَاتِ اللّٰهِ تَعَالَى أَنَّهُ مُتَكَلِّمٌ بِكَلَامٍ قَدِيمٍ (١) يَسْمَعُهُ مِنْهُ مَنْ شَاءَ مِنْ خَلْقِهِ (٢) سَمِعَهُ مُوسٰى مِنْهُ مِنْ غَيْرِ وَاسِطَةٍ (٣) وَسَمِعَهُ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ (٤) وَمَنْ أَذِنَ لَهُ مِنْ مَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ.

ترجمہ......: اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ ازل سے کلام کرنے والا ہے اور وہ اپنا کلام اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے سناتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے براہ راست اللہ کا کلام

سنا۔ جبریل علیہ السلام، دیگر فرشتوں اور رسولوں نے بھی، جن کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی، اس کا کلام سنا۔

تشریح......:

(۱)...... بکلام قدیم:

یعنی اس کا کلام نوع کے اعتبار سے قدیم اور انفرادی طور پر حادث ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کو مطلقاً قدیم نہیں کہا جائے گا بلکہ یوں کہا جائے گا کہ جنس کلام اللہ تعالیٰ کی قدیم صفت ہے۔ لیکن اس کی انواع اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔

(۲)...... اللہ تعالیٰ کے کلام کو اس کی مخلوق میں سے وہی سنتا ہے جسے اللہ تعالیٰ سنانا چاہتا ہے، مثلاً جبریل علیہ السلام اسے سن کر انبیاء کرام تک پہنچاتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تھا۔

(۳)...... اس میں کوئی شک نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے کلام کو اس طرح سنا تھا کہ ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اسی لیے جناب موسیٰ علیہ السلام کو اپنے تمام انبیاء بھائیوں میں سے ''کلیم اللہ'' کا لقب خاص عنایت کیا گیا۔

(۴)...... ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو یہ خصوصیت بخشی کہ انہیں اپنا کلام سناتے ہیں اور ان سے پھر تمام آسمان والوں کو سناتے ہیں۔ جب وہ کلام الٰہی کو سنتے ہیں تو (مارے ہیبت کے) بے ہوش ہوکر گر پڑتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت نواس بن سمعان وغیرہ رضی اللہ عنہم کی حدیث میں وارد ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

((إِذَا تَـكَلَّمَ اللّٰهُ بِالْوَحِي اَخَذَتِ السَّمٰوَاتُ مِنْهُ رَجْفَةً أَوْ رَعْدَةً شَـدِيْدَةً، فَـإِذَا سَـمِـعَهَـا أَهْـلُ السَّـمَـاءِ صَعِقُوْا، وَخَرُّوْا لِلّٰهِ سُجَّدًا .))

''جب اللہ عزوجل اپنے کلام کے ذریعے وحی فرماتے ہیں تو آسمانوں پر اس کی (ہیبت کی) وجہ سے کپکپی طاری ہوجاتی ہے۔ جب اہل آسمان اسے سنتے ہیں تو

وہ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اور (پھر جب ہوش میں آتے ہیں تو) اللہ کے حضور سجدے میں گر جاتے ہیں۔'' (اخرجه الطبری فی التفسیر: ۳۷۳/۱۰ (۲۸۸٤۹) وابن کثیر فی التفسیر: ٥١٦/٦ فی تفسیر قوله تعالیٰ: حَتّٰٓی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ (سبا: ۲۳))

❁❁❁❁❁

وَأَنَّـهُ سُبْحَانَهُ يُكَلِّمُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الْآخِرَةِ وَيُكَلِّمُوْنَهُ (۱) وَيَأْذَنُ لَهُمْ فَيَزُوْرُوْنَهُ (۲) قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ (النساء:۱۶۴)(۳)

ترجمہ......: نیز اللہ تعالیٰ آخرت میں اپنے مومن بندوں سے کلام فرمائیں گے اور وہ اللہ تعالیٰ سے کلام کریں گے اور اس کی اجازت سے اس کی زیارت کریں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًاo﴾ (النساء: ١٦٤)

''اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔''

تشریح......: (۱) یعنی مومنین اللہ تعالیٰ کو جنت میں دیکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے بلاواسطہ کلام کریں گے، وہ اس کے کلام کو سنیں گے، اس کا دیدار کریں گے اور یہ سب کچھ جنت میں ہوگا۔

(۲)...... وہ ایک خاص وقت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ وہ جنت کے ایک مقام پر جمع ہوں گے، پھر اللہ تعالیٰ ان کے سامنے اپنی ذات سے تمام پردے اٹھا دیں گے۔ تب وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے اور اللہ سے ہم کلام ہوں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن یہ قوت اور قدرت بخشیں گے کہ وہ دیدار الٰہی کو برداشت کر سکیں اور اس کے کلام کو سن سکیں۔ لیکن اس دنیا میں کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اللہ ربّ العالمین فرماتے ہیں:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُo﴾

(الانعام: ۱۰۳)

''اسے نگاہیں نہیں پاتیں اور وہ سب نگاہوں کو پاتا ہے اور وہی نہایت باریک بین، سب خبر رکھنے والا ہے۔''

(۳)..... ﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًاo﴾ (النساء: ۱٦٤)

''اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بلاواسطہ کلام کیا۔ پھر اس میں تاکید کرتے ہوئے ''تَكْلِيْمًا'' مصدر استعمال کیا چنانچہ یہ یہاں پر تکلم ظاہری معنی کے علاوہ کوئی اور معنی مراد لینے کی نفی کرتا ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بالواسطہ کلام کیا ہے بلکہ اس شبہ کو ''تَكْلِيْمًا'' کے لفظ سے دور کردیا۔

❁❁❁❁❁

وَقَالَ سُبْحَانَهُ ﴿يٰمُوْسٰى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَ بِكَلَامِىْ﴾ (الاعراف: ۱٤٤) (۱) وَقَالَ سُبْحَانَهُ: ﴿مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ﴾ (البقرہ: ۲۵۳) (۲) وَقَالَ سُبْحَانَهُ ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ﴾ (الشوریٰ: ۵۱) (۳)

ترجمہ......: اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے موسیٰ! بے شک میں نے تجھے اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے ساتھ لوگوں پر چن لیا ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''(یہ رسول) ان میں سے کچھ وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا۔'' اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اور کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے، یا پردے کے پیچھے سے۔''

تشریح......: (۱) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک پکار ہے کہ اے موسیٰ! میں نے تجھے لوگوں میں سے اپنی رسالت اور اپنے ساتھ کلام کرنے کے لیے پسند کرلیا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں محل شاہد ''وبکلامی'' کے الفاظ ہیں۔ یعنی ''تیرے ساتھ بلا واسطہ میرا کلام کرنا۔''

(۲).... ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ﴾ (البقرہ: ۲۵۳)

''یہ رسول، ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا۔''

اور وہ رسول جن سے اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ کلام کیا ہے، موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

(۳)......اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ﴾ (الشوری: ۵۱)

''اور کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے، یا پردے کے پیچھے سے۔''

یعنی کسی نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بغیر کسی رکاوٹ کے بات نہیں کی اور یہ دنیا کا معاملہ ہے۔ چنانچہ دنیا میں کبھی کسی نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ اسی لیے جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اس کے دیدار کی درخواست کی:

﴿قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا﴾ (الاعراف: ۱۴۳)

''اس نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا کہ میں تجھے دیکھوں۔ فرمایا: تو مجھے ہرگز نہ دیکھے گا۔ اور لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھ، سو اگر وہ اپنی جگہ پر برقرار رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا۔ تو جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔''

پہاڑ اللہ تعالیٰ کی عظمت کی وجہ سے پھٹ گیا، ثابت نہ رہ سکا اور مٹی بن گیا۔ لہٰذا گوشت پوست کا بنا ہوا ایک انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے کیسے دیکھ سکتا ہے؟

﴿وَّ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا﴾ ...... ''اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔''

یعنی شدت خوف سے آپ علیہ السلام پر غشی طاری ہوگئی۔

﴿فَلَمَّآ اَفَاقَ﴾

''پھر جب اسے ہوش آیا۔''

یعنی موسیٰ علیہ السلام سے جب غشی اور خوف جاتا رہا۔

﴿قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الاعراف : ۱۴۳)

''تو اس نے کہا تو پاک ہے، میں نے تیری طرف توبہ کی اور میں ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہوں۔''

یہ موسیٰ علیہ السلام ہیں جنہوں نے اپنے رب سے دیدار کی درخواست کی لیکن اس کی تاب نہ لا سکے۔ لہٰذا آپ کو کوئی ایسا انسان نہیں ملے گا جس نے اللہ تعالیٰ کو بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی آنکھوں سے آخرت سے پہلے دیکھا ہو۔

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ .... إِلَّا وَحْيًا﴾

وحیاً سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے الہام کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو اس کام کا الہام کیا تھا جو انہوں نے اپنے بچے کے ساتھ کیا۔ اور جیسا کہ ہمارے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بعض اوقات الہام کے ذریعے وحی آتی تھی۔ یہ فرشتہ کے واسطے کے بغیر ہوتا ہے۔ یہ ایک خیال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا عطا کرتا ہے۔

﴿اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ (الشوریٰ : ۵۱)

''یا پردے کے پیچھے سے۔''

جیسا کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا کہ ان کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ کلام

کیا لیکن پردے کے پیچھے سے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورۃ الاعراف میں بیان کرتے ہیں:

﴿قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ﴾

''اس نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا کہ میں تجھے دیکھوں۔ فرمایا: تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔''

تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے پردے کے پیچھے سے کلام کرتے ہیں یا فرشتہ کے ذریعہ پیغام پہنچاتے ہیں۔ الغرض! اللہ تعالیٰ یا تو الہام کے طریقے سے کلام کرتے ہیں، یا پردے کے پیچھے سے یا فرشتے کے ذریعے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے کسی کے ساتھ دنیا میں پردے کے بغیر کلام کیا اور نہ ہی کسی نے اپنی آنکھوں سے اس کا دیدار کیا۔ البتہ آخرت میں صرف مومنوں کو دیدار نصیب ہوگا۔ اس آیت مبارکہ میں محل شاید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کا اثبات کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ جس کے ساتھ چاہتا ہے پردے کے پیچھے سے، یا وحی کے ذریعے یا فرشتے کے ذریعے کلام کرتا ہے۔

❁❁❁❁❁

كَلَامُ اللّٰهِ بِحَرْفٍ وَصَوْتٍ مَسْمُوْعٍ، وَقَالَ تَعَالَي: ﴿فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی o اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ﴾ (۱) (طه: ۱۱۔۱۲)

ترجمہ......: اللہ تعالیٰ کا کلام الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے اور سنا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''چنانچہ جب وہ اس کے پاس آیا تو اسے آواز دی گئی؛ اے موسیٰ! بے شک میں ہی تیرا رب ہوں۔''

تشریح......: (۱) (ان آیات مبارکہ میں) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا ہے کہ جب انہوں نے ایک قبطی آدمی کو قتل کر دیا اور فرعونی آپس میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قتل کا

مشورہ کرنے لگے تو ایک شخص نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اطلاع دی۔ چنانچہ آپ فرعون اور اس کی قوم سے ڈر کر بھاگے اور مدین کا رخ کیا، وہاں آپ دس سال تک ٹھہرے اور اس شرط پر ایک بوڑھے آدمی کی بکریاں چراتے رہے کہ اس کی بیٹی سے شادی کریں گے۔ آپ نے آٹھ یا دس سال بکریاں چرانے کے بدلے اس سے شادی کی تھی اور یہی اس کا مہر تھا۔

﴿فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا﴾ (القصص : ۲۹)

''پھر جب موسیٰ نے وہ مدت پوری کر دی اور اپنے گھر والوں کو لے کر چلا تو اس نے پہاڑ کی طرف سے ایک آگ دیکھی، اپنے گھر والوں سے کہا تم ٹھہرو۔ بے شک میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔''

جب یہ مدت پوری ہوئی تو آپ اپنی بیوی کو لے کر مصر کی طرف لوٹے جہاں آپ کے گھر والے تھے۔ آپ راستہ بھول گئے، سخت ٹھنڈی رات تھی، آپ کو آگ نظر آئی، آپ خوش ہوگئے جیسا کہ ایک بھٹکا ہوا مسافر آگ کو دیکھ کر خوش آتا ہے۔ بالخصوص اس وقت کہ جب وہ بھوکا اور ضرورت مند ہو۔ آپؑ نے اپنے اہل خانہ کو وہیں بٹھایا کہ ان کے واپس آنے کا انتظار کریں۔ آپ نے سمجھا یہ ایک عام آگ ہے۔ چنانچہ آگ کے پاس آئے تا کہ وہاں موجود لوگوں سے راستہ پوچھیں یا آگ کا کوئی شعلہ لے آئیں تا کہ اسے سینک کر سردی کی شدت سے نجات پائیں۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقصد تو یہ تھا جبکہ اللہ تعالیٰ کچھ اور چاہتے تھے۔

﴿فَلَمَّآ اَتٰهَا﴾ یعنی جب آپ آگ تک پہنچے ﴿نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى﴾ آواز دی گئی؛ اے موسیٰ! کس نے آواز دی تھی؟ پکارنے والا اللہ تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ﴾ یہ بلا واسطہ خطاب تھا کہ: ﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ (طٰه : ۱۱ تا ۱۲) سو اپنی دونوں جوتیاں اتار دے، بے شک تو پاک وادی طویٰ میں ہے۔ اس سیاق میں آنے والی آیات کے آخر تک اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے۔

اور دوسری آیت میں ہے:

﴿فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰۤى اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ o وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ط فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ ط يٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَ لَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ o﴾ (القصص : ۳۰ تا ۳۱)

''چنانچہ جب وہ اس کے پاس آیا تو اسے اس بابرکت قطعہ میں وادی کے دائیں کنارے سے ایک درخت سے آواز دی گئی: اے موسیٰ! بلاشبہ میں ہی اللہ ہوں، جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ اور یہ کہ اپنی لاٹھی پھینک۔ جب اس نے اسے دیکھا کہ حرکت کر رہی ہے، جیسے وہ ایک سانپ ہے تو پیٹھ پھیر کر چل دیا اور پیچھے نہیں مڑا۔ اے موسیٰ! آگے آ اور خوف نہ کر، یقیناً تو امن والوں سے ہے۔''

یہ آیات اس مسئلہ میں صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بلاواسطہ کلام کیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو حقیقی طور پر سنا تھا نہ کہ مجازی طور پر۔ اور ان میں اس بارے میں کوئی پیچیدگی نہیں کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا تھا اور حقیقی کلام۔ یہ کلام الفاظ اور آواز کا مجموعہ تھا اور موسیٰ علیہ السلام نے اسے سنا تھا۔

گمراہ لوگوں کا عقیدہ:

گمراہ لوگ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے درخت میں صفت کلام پیدا کر دی تھی اور درخت بول رہا تھا۔

سوال یہ ہے؛ کیا درخت یہ کہہ رہا تھا: اے موسیٰ! میں تیرا رب ہوں تو جوتے اتار دے۔ کیونکہ تو مقدس وادی طوی میں ہے اور میں نے تجھے پسند کیا ہے؟

کیا درخت یہ کہہ رہا تھا: ''میں نے تجھے چن لیا ہے لہٰذا جو تیری طرف وحی کی جا رہی ہے اسے غور سے سن، میں اللہ تعالیٰ ہوں؟

کیا درخت یہ کہہ رہا تھا ''میں اللہ ہوں، میرے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو؟

نہیں! بلکہ یہ تو رب العالمین کا کلام ہے اور اللہ اس سے بلند تر ہے جو یہ کہتے ہیں۔

الغرض آیات اس قدر واضح ہیں کہ ان میں ذرہ بھر بھی شک نہیں کہ کلام کرنے والی ذات اللہ کی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا ہی کلام سنا تھا۔ چنانچہ ان آیات سے ثابت ہوا کہ:

۱......اللہ تعالیٰ کلام کرتا ہے۔

۲......اللہ تعالیٰ کا کلام سنا جا سکتا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ سُبْحَانَهُ: ﴿إِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ﴾ (طٰه: ١٤) (ا) وَغَيْرُ جَائِزٍ أَنْ يَّقُوْلَ هٰذَا أَحَدٌ غَيْرُ اللّٰهِ (٢)

ترجمہ......: اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کر۔'' اور یہ کہنا جائز نہیں کہ یہ باتیں اللہ کے علاوہ کوئی اور کہہ رہا تھا۔

تشریح......: (ا) کیا درخت یہ کہہ رہا تھا:

﴿إِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ﴾ (طٰه: ١٤)

''بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کر۔''

(۲)...... یہ جہمیہ کا رد ہے کہ یہ باتیں درخت نہیں کہہ رہا تھا:

﴿اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ○ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى○﴾

(طٰه: ١٤، ١٥)

''بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کر اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کر۔ بے شک قیامت آنے والی ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے جو اس نے کوشش کی ہو۔''

یہ کلام مخلوق کے مناسب حال نہیں بلکہ یہ تو خالق کا کلام ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ ''إِذَا تَكَلَّمَ اللّٰهُ بِالْوَحْيِ سَمِعَ صَوْتَهُ أَهْلُ السَّمَاءِ'' وَرُوِیَ ذَالِكَ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم .'' (۱)

ترجمہ......: اور جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے کلام کرتے ہیں تو اس کی آواز آسمان والے سنتے ہیں۔'' اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے۔

تشریح......: (۱) جب اللہ تعالیٰ وحی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا کلام آسمان والے سنتے ہیں اور آسمان میں فرشتے ہوتے ہیں۔ یہ حدیث جناب عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مروی ہے۔ ❶ لیکن یہ بات حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً بھی مروی ہے۔

((إِذَا تَكَلَّمَ اللّٰهُ بِالْوَحْيِ أَخَذَتِ السَّمٰوَاتُ مِنْهُ رَدْعَةً أَوْ رَجْفَةً شَدِيْدَةً، فَإِذَا سَمِعَ ذٰلِكَ أَهْلُ السَّمَاءِ صُعِقُوْا، وَخَرُّوْا لِلّٰهِ سُجَّدًا، فَيَكُوْنُ أَوَّلَ مَنْ يَرْفَعُ رَأْسَهٗ جِبْرِيْلُ، فَيُكَلِّمُهُ اللّٰهُ مِنْ وَحْيِهٖ بِمَا شَاءَ، ثُمَّ يَمُرُّ جِبْرِيْلُ كُلَّمَا مَرَّ بِأَهْلِ سَمَاءٍ سَأَلَهٗ أَهْلُهَا: مَاذَا قَالَ رَبُّنَا يَا جِبْرِيْلُ؟ فَيَقُوْلُ: قَالَ الْحَقَّ، وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ.)) (تفسیر الطبری: ۱۰/۳۷۳۔ تفسیر ابن کثیر: ۶/۵۱۶)

''جب اللہ تعالیٰ وحی کے طور پر کلام کرتا ہے تو آسمان اس (کی ہیبت) سے کانپنے لگتے ہیں۔ جب آسمان والے اسے سنتے ہیں تو مدہوش ہوجاتے ہیں اور

---

❶ امام طبری رحمہ اللہ نے اسے اپنی تفسیر میں اسی طرح بیان کیا ہے: (۱۰/۳۷۲۔۳۷۳) (۲۸۸۴۱۔۲۸۸۴۴) اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اسے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مرفوع بیان کیا ہے۔ ۴۷۳۸) اور یہ حدیث صحیح ہے۔

اللہ کے آگے سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ سب سے پہلے جو فرشتہ اپنا سر اٹھاتا ہے وہ جبریل علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی وحی میں سے جو چاہتے ہیں اسے بتاتے ہیں۔ پھر جبریل جب بھی کسی آسمان سے گزرتے ہیں تو اس آسمان کے فرشتے ان سے پوچھتے ہیں ''اے جبریل! ہمارے پروردگار نے کیا فرمایا ہے؟ جبریل فرماتے ہیں: اس نے حق کہا اور وہ بہت بلند اور بڑا ہے۔''

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کوئی بات کرتے ہیں تو آسمان اس کی ہیبت سے کانپنے اور لرزنے لگتے ہیں، فرشتے مدہوش ہو کر اللہ کے سامنے گر پڑتے ہیں۔ جب وہ ہوش میں آتے ہیں، تو پوچھتے ہیں: ''اے جبریل! ہمارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ جبریل جواب دیتے ہیں: ''اس نے حق فرمایا اور وہ بہت بلند اور بڑا ہے۔''

لہٰذا اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا اثبات ہے اور اس کا بھی اثبات ہے کہ اسے تمام آسمان اور اہل آسمان سنتے ہیں۔ پھر جبریل اسے اللہ تعالیٰ سے لے کر انسانوں میں سے جس پیغمبر تک اللہ نے پہنچانے کا حکم دیا ہوتا ہے اسے پہنچاتے ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَرَوَى عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أُنَيْسٍ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ "يَحْشُرُ اللّٰهُ الْخَلَائِقَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا بُهمًا، فَيُنَادِيهِمْ بِصَوْتٍ يَسْمَعُهُ مَنْ بَعُدَ، كَمَا يَسْمَعُهُ مَنْ قَرُبَ: أَنَا الْمَلِكُ، أَنَا الدَّيَّانُ" رَوَاهُ الْأَئِمَّةُ، وَاسْتَشْهَدَ بِهِ الْبُخَارِيُّ." (ا) [1]

ترجمہ……: اور عبداللہ بن انیس نبی اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مخلوق کو ننگے پاؤں، ننگے بدن، غیر مختون اور خالی ہاتھ جمع کریں گے پھر اتنی بلند آواز سے پکار کر کہیں گے: ''میں ہی بادشاہ ہوں، میں ہی بدلہ دینے

---

[1] امام احمد رحمہ اللہ نے اسے اپنی مسند میں بیان کیا ہے (۲۵/۴۳۱) (۱۶۰۴۲) بخاری رحمہ اللہ نے الادب المفرد میں (۹۷۰) ذکر کیا ہے اور اپنی صحیح میں حدیث نمبر ۷۴۸۱ اور (۷۴۸۱) سے پہلے معلق بیان کیا ہے۔ اس حدیث کی سند حسن ہے۔ اس کی مکمل تخریج اور تنقید مسند امام احمد میں دیکھیں۔ یہ تخریج فضیلۃ الشیخ عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی حفظہ اللہ کے اشراف میں علماء کی کمیٹی نے کی ہے۔

والا ہوں'' کہ اس آواز کو دور والے بھی ویسے ہی سنیں گے جس طرح یہ قریب والوں کو سنائی دے گی۔''

تشریح......: (۱) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی باتیں انفرادی اعتبار سے نئی وجود میں آتی ہیں اور وہ جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے۔ یہ کلام اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پیدا فرمائیں گے اور یہ آواز کے ساتھ ہوگا۔ مزید برآں "یَسْمَعَهُ مَنْ قَرُبَ وَمَن بَعُدَ" کے الفاظ سے مجاز کی نفی ہوتی ہے۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کلام حقیقی، آواز کے ساتھ اور سنا جانے والا ہوگا۔ یہ کلام حشر کے دن اس وقت اللہ تعالیٰ کریں گے جب وہ تمام مخلوقات کو جمع کریں گے اور باآواز بلند پکاریں گے ''میں ہی بادشاہ ہوں، میں ہی بدلہ دینے والا ہوں۔''

کیا اس وضاحت اور تفصیل کے بعد بھی کسی وضاحت و تفصیل کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقی طور پر اور جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کلام نیا وجود میں آتا ہے۔ جب بھی وہ کوئی حکم دیتا ہے، یا کسی کام سے روکتا ہے۔ تخلیق کرتا اور رزق دیتا ہے تو یہ سب کام کلام کے ذریعے کرتا ہے۔

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۝﴾ (یٰس: ۸۲)

''اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے: ''ہو جا''۔ تو وہ ہو جاتی ہے۔''

❀❀❀❀❀

وَفِي بَعْضِ الْآثَارِ: أَنَّ مُوسٰى عَلَيْهِ السَّلَام لَيْلَةَ رَأَى النَّارَ فَهَالَتْهُ وَفَزِعَ مِنْهَا، نَادَاهُ رَبُّهُ: يَا مُوسٰى. فَأَجَابَ سَرِيعًا اِسْتِئْنَاساً بِالصَّوْتِ. فَقَالَ: لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ أَسْمَعُ صَوْتَكَ، وَلَا أَرَى مَكَانَكَ، فَأَيْنَ أَنْتَ؟ فَقَالَ: أَنَا فَوْقَكَ، وَوَرَاءَكَ، وَعَنْ يَمِينِكَ، وَعَنْ شِمَالِكَ. فَعَلِمَ أَنَّ هٰذِهِ صِفَةٌ لَا تَنْبَغِي إِلَّا لِلّٰهِ تَعَالٰى، قَالَ: كَذٰلِكَ أَنْتَ يَا إِلٰهِي فَكَلَامُكَ أَسْمَعُ أَمْ كَلَامَ رَسُولِكَ؟ قَالَ: بَلْ

كَلَامِيُ يَا مُوُسٰى. (۱)

ترجمہ......: اور بعض آثار میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے رات کے وقت آگ دیکھی تو آپ اس سے خوفزدہ ہوگئے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام کو آپ کے رب نے پکارا: اے موسیٰ! آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آواز کو پہچان کر جلدی سے جواب دیا ''میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں۔ مجھے آپ کی آواز سنائی دے رہی ہیں لیکن آپ کی جگہ نظر نہیں آرہی۔ آپ کہاں ہیں؟'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں تیرے اوپر، تیرے پیچھے، تیرے دائیں اور بائیں ہوں۔'' آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام جان گئے کہ یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ کے ہی لائق ہے۔ اور پھر عرض کیا: ''اے میرے معبود تو ایسا ہی ہے۔ لیکن کیا میں تیرا کلام سن رہا ہوں یا تیرے قاصد کا؟'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے موسیٰ! یہ میرا کلام ہے۔'' ❶

تشریح......: (۱) اللہ تعالیٰ کا موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرنے کا جو واقعہ پیچھے گزر چکا ہے اس حدیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ اُس رات جب موسیٰ علیہ السلام اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنے وطن کی طرف سفر کر رہے تھے، آپ راستہ کھو گئے اور آپ کو سردی محسوس ہوئی۔ چنانچہ آپ اس آگ کی طرف گئے جو آپ کو دکھائی دے رہی تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ وہاں سے راستہ پوچھ آئیں اور کوئی چنگاری لے آئیں تا کہ آپ علیہ السلام کے گھر والے اسے سینک سکیں۔

مگر جب آپ اس آگ کے پاس پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو آواز دی اور اس طرح کلام کیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو سنائی دے رہا تھا۔ آپ علیہ السلام نے عرض کیا: اے ربّ کریم! ''مجھے تیری آواز تو سنائی دے رہی ہے لیکن تیری جگہ نظر نہیں آرہی۔'' کیونکہ اللہ تعالیٰ کو دنیا میں نہیں دیکھا جاسکتا۔ وہ اپنی مخلوق سے دنیا میں چھپا ہوا ہے۔ سب مخلوق والے اس کی عظمت و کبریائی کی وجہ سے اسے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ البتہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مومنوں کو عزت بخشتے ہوئے اپنا دیدار کرائیں گے۔ آپ علیہ السلام نے عرض کیا: ''میں حاضر ہوں۔

❶ بتلاش بسیار یہ عبارت ہمیں کتب حدیث میں نہیں مل سکی۔ اگلی تحقیق میں مل گئی تو تخریج کر دی جائے گی۔ ان شاء اللہ (ابو یحییٰ)

اے اللہ! میں حاضر ہوں، میں آپ کی آواز سن رہا ہوں لیکن آپ دکھائی نہیں دے رہے۔ آپ کہاں ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((أَنَا فَوْقَكَ)) ......''میں تیرے اوپر ہوں۔''

اوراس میں اللہ تعالیٰ کی صفت علو کا اثبات ہے۔

((وَعَنْ يَمِينِكَ ، وَعَنْ شِمَالِكَ))

یعنی اللہ تعالیٰ اگرچہ بلندی میں ہے لیکن وہ اپنی مخلوق کو ہر طرف سے اس طرح محیط ہے کہ ان کا کوئی بھی کام اس سے مخفی نہیں۔ بلکہ اسے ان کی اطلاع ہے اور وہ انہیں دیکھ رہا ہے۔

اس حدیث میں محل شاہد یہ ہے کہ: اس میں اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا اثبات ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کی فوقیت اور محیط ہونے کا بھی اثبات ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا بلندی میں ہونا اس کے مخلوق کا احاطہ کرنے کے منافی نہیں ہے۔

❀❀❀❀❀

فصل سوم:

قرآن کا اللہ تعالیٰ کے کلامِ حقیقی ہونے کا بیان

وَمِنْ كَلَامِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ الْقُرْآنُ الْعَظِيمُ. (۱)

ترجمہ......: کلام الٰہی کا ایک حصہ قرآن عظیم بھی ہے۔

تشریح......: (۱) پہلے مؤلف رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت کلام بھی ہے جو کہ ایک فعلی صفت ہے۔ وہ جو چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے اس طرح کلام کرتا ہے کہ اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جیسا کہ جبریل علیہ السلام اس کو سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام نے اسے بلا واسطہ سنا تھا۔ مؤلف رحمہ اللہ نے اس بحث کو تفصیل سے بیان کیا اور کتاب اللہ سے اس پر دلالت کرنے والی آیات ذکر کیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ حقیقی طور پر کلام کرتے ہیں جو کہ الفاظ اور آواز کا مجموعہ ہوتا ہے۔ سنائی دیتا ہے، تلاوت کیا جاتا ہے، لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے۔

اس کا کلام نوع کے اعتبار سے تو قدیم ہے لیکن اگر ہر بات کو الگ الگ دیکھا جائے تو وہ حادث ہے [1] لہٰذا یہ کہنا قطعاً درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام مطلق طور پر قدیم ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے گا کہ: اللہ تعالیٰ کا کلام نوع کے اعتبار سے تو قدیم ہے لیکن انفرادی طور پر حادث ہے، اس اعتبار سے کہ اس کا تعلق مشیت کے ساتھ ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، جب چاہتا ہے بولتا ہے۔ چنانچہ کلام کی اسی قسم میں سے قرآن کریم بھی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے افراد میں سے ایک فرد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو اس کے علاوہ کوئی شمار نہیں کرسکتا۔

[1] یعنی اللہ تعالیٰ کے اندر کلام فرمانے کی صفت تو ہمیشہ سے ہی ہے لیکن اس کی ہر بات کو وجود تب ہی ملتا ہے جب وہ اسے بولتا ہے۔ واللہ اعلم (مترجم ومحقق)

وہ کلام کے ساتھ ہی پیدا کرتا، رزق دیتا اور معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔

﴿اِنَّمَآ اَمۡرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيۡـًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ۝﴾ (یس : ۸۲)

''اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے: ''ہو جا۔'' تو وہ ہو جاتی ہے۔''

اس کے کلام کو اس کے علاوہ کوئی شمار نہیں کر سکتا۔

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۝﴾ (الکھف : ۱۰۹)

''کہہ دے کہ اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لیے سیاہی بن جائے تو یقیناً سمندر ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ میرے رب کی باتیں ختم ہوں۔ اگرچہ ہم اس کے برابر اور سیاہی لے آئیں۔''

﴿وَ لَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝﴾

(لقمان : ۲۷)

''اور اگر واقعی ایسا ہو کہ زمین میں جو بھی درخت ہیں قلمیں ہوں اور سمندر اس کی سیاہی ہو، جس کے بعد سات سمندر اور ہوں تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔ یقیناً اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کلام کرتا ہے، پیدا کرتا ہے، رزق دیتا ہے، زندگی اور موت دیتا ہے اور تدبیر کرتا ہے۔ جس کی کوئی ابتدا نہیں اور کوئی انتہا نہیں۔ اور اس کے کلام کو اس کے علاوہ کوئی شمار نہیں کر سکتا۔

اس کے عظیم کلام میں سے ایک کلام قرآن عظیم بھی ہے جو کہ ہمارے پیارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۝

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾ (الشعراء: ۱۹۳ تا ۱۹۵)

''جسے امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ تیرے دل پر، تاکہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو جائے۔ واضح عربی زبان میں۔''

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ: یعنی الروح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔

الأَمِیْنُ: حضرت جبریل علیہ السلام کی صفت امین ہونا اس لیے بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے امین ہیں۔ وہ اس میں کمی بیشی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اسی طرح اسے پہنچاتے تھے جیسے اللہ تعالیٰ کا حکم تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو امانت داری سے متصف قرار دیا۔ اس سے قرآن کریم کی سند میں پختگی آتی ہے کہ اسے جبریل امین نے اپنے رب سے روایت کرتے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی امت کو پہنچایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت نے اسے آپ سے روایت کیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد باری ہے۔

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ط قَلِيْلًا مَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝﴾ (الحاقه: ٤٠ تا ٤٦)

''بلاشبہ یہ (قرآن) یقیناً ایک معزز پیغام لانے والے کا قول ہے۔ اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔ اور نہ کسی کاہن کا قول ہے، تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو۔ (یہ) جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ اور اگر وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم پر کوئی بات بنا کر لگا دیتا۔ تو یقیناً ہم اس کو دائیں ہاتھ سے (قوت سے) پکڑتے۔ پھر یقیناً ہم اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے۔''

(اور اسے ہلاک کر دیتے۔)

ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ:

الْوَتِيْن سے مراد رگِ جان ہے۔ یعنی اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بارے میں کوئی

جھوٹی بات کہتے تو اللہ تعالیٰ آپ ﷺ سے سخت ترین انتقام لیتا۔

لہٰذا یہ قرآن کی سند کی توثیق ہے کہ یہ محمد ﷺ کی جبریل علیہ السلام سے اور جبریل علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے:

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍo﴾ (حم السجده: ٤٢)

''اس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ ایک کمال حکمت والے، تمام خوبیوں والے کی طرف سے اتاری ہوئی ہے۔''

چنانچہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اسی سے شروع ہوا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے بولا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ سے شروع ہوا ہے نہ کہ جہمیہ کے قول کے مطابق لوح محفوظ سے۔ اللہ سے ہی اس کا آغاز ہوا اور پھر جب بالآخر قرآن پر عمل چھوڑ دیا جائے گا تو یہ اسی کی طرف لوٹ جائے گا۔ یہ مصاحف اور لوگوں کے دلوں سے اٹھالیا جائے گا۔ زمین پر اس کا کوئی حصہ باقی نہیں بچے گا۔ یہ کام قرب قیامت ہوگا جب کہ اس پر عمل چھوڑ دیا جائے گا۔

❀❀❀❀❀

وَهُوَ كِتَابُ اللّٰهِ الْمُبِينُ (١) وَحَبْلُهُ الْمَتِينُ (٢) وَصِرَاطُهُ الْمُسْتَقِيمُ (٣) وَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ (٤) نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلٰى قَلْبِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ (٥) بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ (٦).

ترجمہ......: اور یہ اللہ تعالیٰ کی واضح کتاب، اس کی مضبوط رسی، اس کا سیدھا راستہ اور رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ روح الامین نے اسے سیّد المرسلین ﷺ وبارک وسلم تسلیما کبیراً کے دل پر اتارا ہے۔ یہ واضح عربی میں ہے۔

تشریح......: یہ کتاب اللہ اور اللہ کا کلام ہے۔ اور یہی قرآن ہے اس کے بہت سے نام ہیں۔ اسے کتاب اللہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ لوح محفوظ اور مصاحف میں لکھا ہوا ہے۔ کلام

اللہ اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ کلام فرمایا ہے۔ یہ کسی اور کا کلام نہیں ہے۔ یہ قرآن ہے، حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب ہے، حکمت بھری نصیحت ہے، یہ ہدایت اور وضاحت ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کے تمام نام اس کی عظمت کی دلیل ہیں۔ کیونکہ کسی چیز کے اسماء وصفات کا زیادہ ہونا اس کی عظمت کی دلیل ہوتی ہے۔

كِتَابُ اللّٰهِ الْمُبِيْنُ:

یعنی یہ اللہ کی ایسی کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ضرورت کی باتیں بیان کی ہیں۔ لہٰذا ''مبین'' بمعنی واضح، فصیح اور بیّن ہے۔ "مُبَیّـــــن" کے معنی میں بھی ہے کیونکہ یہ لوگوں کی ضرورت کے دینی اور دنیاوی امور بیان کرتی ہے۔ الغرض! یہ ایک عظیم اور جامع کتاب ہے جس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے اور نہ اس کے علوم کم ہوں گے۔

(۲)......الحبل:

رسی کو کہتے ہیں اور یہ نہایت معروف ہے۔ یعنی ایسی چیز کہ خطرے سے نجات اور بچاؤ کے لیے جس کے ساتھ چمٹا جاتا ہے۔ قرآن اللہ کی رسی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۠ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۝﴾ (آل عمران: ۱۰۳)

''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب تم دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی۔ چنانچہ تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمھیں اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔''

حبل سے مراد قرآن یا اسلام ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ .))[1]

''یعنی یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے۔''

جس کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا ہمارے ہاتھوں میں۔ کیونکہ جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا اور نجات پا جاتا ہے۔

(۳)......اور یہ سیدھا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دعا سکھاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ یوں کہا کریں:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (الفاتحہ : ٦)

''ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (الانعام: ۱۵۳)

''اور یہ کہ بے شک یہی میرا راستہ ہے سیدھا، پس اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے، تاکہ تم بچ جاؤ۔''

اَلصِّرَاطُ: لغت میں راستے کو کہا جاتا ہے۔ یہاں اس سے مراد کیا ہے؟ اس بارے میں کئی اقوال ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

۱......اس سے مراد قرآن ہے۔

۲......اس سے مراد اللہ کا رسول ہے۔

۳......اس سے مراد اسلام ہے۔

یہ سبھی معانی درست ہیں۔ کیونکہ قرآن بھی اللہ کا راستہ ہے، اسلام بھی اللہ کا راستہ ہے اور رسول بھی اللہ کا راستہ ہے۔ یہ سبھی راستے اللہ کی طرف لے کر جاتے ہیں۔

[1] ترمذی نے اسے جناب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ (۲۹۰۶)

(۴)...... یہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَإِنَّهُ'' اور بے شک یہ (یعنی قرآن)

﴿لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَلَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝﴾

(الشعراء: ۱۹۲ تا ۱۹۵)

''یہ یقیناً رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے۔ جسے امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ تیرے دل پر، تاکہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو جائے۔ واضح عربی زبان میں۔''

یہ قرآن کے اوصاف ہیں۔ یہ رب العالمین کا نازل کردہ کلام ہے۔ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ بزرگ و دانا ہستی کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ اور غیر مخلوق ہے نہ کہ جہمیہ کے قول کے مطابق کسی اور کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ (اللہ انہیں تباہ کرے)، یہ اللہ کا نازل کردہ کلام ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ارشاد فرمایا ہے اور جبریل علیہ السلام کے ذریعے اپنے رسول ﷺ پر نازل کیا ہے۔

(۵)...... اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿عَلَىٰ قَلْبِكَ﴾ ''تیرے دل پر نازل کیا ہے۔''

یہ رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے۔

﴿لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ﴾

''تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں۔''

تاکہ تو لوگوں کو اس قرآن عظیم کے ذریعے ڈرائے۔ چنانچہ قرآن اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر حجت ہے۔ لہٰذا جس کو قرآن پہنچ جائے اور وہ اسے سمجھتا بھی ہو تو اس پر حجت قائم ہوگئی اور اس کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔

(۶)...... یہ لغت عرب میں نازل ہوا ہے جو کہ فصیح ترین لغت ہے۔ بلکہ یہ لغت قریش میں نازل ہوا ہے جو کہ عرب کی زبانوں میں سے بھی فصیح ترین زبان ہے۔ لہٰذا یہ ایک فصیح

کتاب ہے۔ چونکہ فصیح ترین لغت عرب کی زبان ہے اور عرب کی زبانوں میں سے بھی فصیح ترین زبان لغت قریش ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا، لہٰذا الفاظ وکلمات اور معانی کے اعتبار سے قرآنِ عظیم سے بڑھ کر فصیح کوئی کلام نہیں۔

❀❀❀❀❀

مُنَزَّلٌ غَيْرُ مَخْلُوقٍ (۱) مِنْهُ بَدَأَ وَإِلَيْهِ يَعُوْدُ (۲) وَهُوَ سُوَرٌ مُحْكَمَاتٌ (۳) وَاٰيَاتٌ بَيِّنَاتٌ (۴) وَحُرُوْفٌ وَّكَلِمَاتٌ (۵)

ترجمہ......: (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) نازل کردہ ہے مخلوق نہیں ہے۔ اسی سے یہ شروع ہوا اور اسی کی طرف لوٹے گا۔ اور یہ محکم سورتیں ہیں، حروف وکلمات (کا مجموعہ) ہے اور واضح آیات ہیں۔

تشریح......: (۱) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے نہ کہ لوح محفوظ سے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بہت سی آیات میں بیان کی ہے۔

﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (السجدہ: ۲)

"اس کتاب کا نازل کرنا جس میں کوئی شک نہیں، جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔"

﴿لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾ (حم السجدہ: ٤٢)

"اس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ ایک کمال حکمت والے، تمام خوبیوں والے کی طرف سے اتاری ہوئی ہے۔"

﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۝﴾ (غافر: ۲)

"اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے، جو سب پر غالب، ہر چیز کو جاننے والا ہے۔"

جبریل نے اسے لوح محفوظ سے نہیں حاصل کیا جیسا کہ بدعتیوں کا کہنا ہے۔ بلکہ انہوں نے اسے اللہ تعالیٰ سے حاصل کیا ہے۔

(۲)......"مِنْهُ بَدَأَ" اسی سے شروع ہوا یعنی اللہ تعالیٰ سے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ کلام فرمایا ہے۔ نہ تو یہ لوح محفوظ سے آیا ہے، محمد ﷺ کا کلام ہے اور نہ ہی جبریل کا۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اسی سے یہ شروع ہوا اور آخری زمانے میں اسی کی طرف لوٹ جائے گا۔

(۳)......قرآن کریم، سورتوں، آیات اور الفاظ وکلمات کا مجموعہ ہے۔ "السور" جمع ہے "سورۃ" کی۔ اور یہ قرآن کے ایک ٹکڑے کو کہتے ہیں جو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے شروع ہوتا ہے۔ اور بسم اللہ قرآن کی ایک آیت ہے جو سورتوں کے درمیان فرق کرنے کے لیے اتری ہے۔ سوائے سورۃ براءت کے۔ ان سورتوں میں سے سب سے پہلی سورت "فاتحہ" ہے یعنی "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" اور آخری سورت "سورۃ الناس" ہے۔ قرآن کریم میں کل ۱۱۴ سورتیں ہیں جن میں سے کچھ لمبی، کچھ درمیانی اور کچھ چھوٹی ہیں۔

سورۃ:

سورت اصل میں ایک گرم اور بلند چیز کو کہتے ہیں۔ نابغہ ذبیانی، نعمان بن منذر کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَعْطَاكَ سُوْرَةً
تَرَى كُلَّ مَلِكٍ دُوْنَهَا يَتَذَبْذَبُ

"کیا تو دیکھتا نہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے تجھے بلندی عطا کی ہے۔ ہر بادشاہ کو تم دیکھو گے کہ وہ اس بلندی سے ورے (نیچے ہی) متردد سا ہے۔"

سورۃ بلند مقام کو کہتے ہیں اور قرآن کی سورتوں کو بھی سورتیں ان کی عظمت کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ اس لیے بھی کہ کوئی ان میں زیادتی، کمی یا تحریف نہیں کرسکتا۔

چنانچہ قرآن اسی طرح محفوظ ہے جیسا کہ یہ نازل ہوا تھا، اس میں کسی قسم کا تغیر وتبدل

نہیں ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اٹھائی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ (الحجر: ۹)

''بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔''

لہٰذا بے شمار لوگ بغض اور دشمنی رکھنے کے باوجود کلام اللہ میں تبدیلی یا کمی بیشی کی جرأت نہیں کر سکتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے اپنی کتاب کو عبث سے محفوظ رکھا اور وہ اس وقت تک اس کی حفاظت کرے گا جب تک وہ دوبارہ زمین اور اس کے باسیوں کو اپنے پاس نہیں بلا لیتا۔ بہت سے دشمن ہونے کے باوجود کوئی اس پر دست درازی نہیں کر سکتے۔

اور اگر کوئی ایسا کرنے کی کوشش کرے گا تو اللہ اسے ذلیل و رسوا کر دے گا جیسا کہ اس نے نبوت کے جھوٹے دعویدار مسیلمہ کذاب کو ذلیل و رسوا کیا جو زعم باطل رکھتا تھا کہ اس پر قرآن نازل ہوتا ہے۔ وہ دنیا بھر کے لیے تماشا بن گیا۔

اسی طرح جو بھی اس قسم کا کام کرنے کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ذلیل و رسوا کرے گا اور تمام دنیا کے لیے تماشا بنا دے گا۔ بلکہ اسے ہلاک کر دے گا جیسا کہ مسیلمہ وغیرہ کے ساتھ ہوا۔

محکمات:

اِحکام (باب افعال سے ہے) جس کا معنی ہے مضبوط اور پختہ۔

اس معنی میں پورا قرآن ہی محکم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الٓرٰ كِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ خَبِيۡرٍۙ﴾ (هود: ۱)

''الٓـرٰ۔ ایک کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں۔ پھر انھیں کھول کر بیان کیا

گیا ایک کمال حکمت والے کی طرف سے جو پوری خبر رکھنے والا ہے۔''

چنانچہ اس معنی میں پورا قرآن ہی محکم ہے کہ یہ متقن ہے۔ اور پورا قرآن اس معنی میں متشابہ ہے کہ اس کے اجزاء حسن وصدق اور لفظی شیرینی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا﴾ (الزمر: ۲۳)

''اللہ نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی۔ ایسی کتاب جو آپس میں ملتی جلتی ہے۔''

قرآن کا کچھ حصہ محکم ہے اور کچھ حصہ متشابہ۔ اس سے مراد جزوی طور پر محکم اور جزوی طور پر مشابہ ہونا ہے۔

اور محکم سے مراد جیسا کہ ہم پہلے جان چکے ہیں، وہ آیت ہے جو اپنی تفسیر میں اپنے غیر کی محتاج نہ ہو کیونکہ وہ بذات خود ہی واضح ہوتی ہے۔

مشابہ: اس سے مراد وہ مجمل لفظ ہے جو اپنی تفسیر میں اپنے غیر کا محتاج ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ﴾ (آل عمران: ۱۰۷)

''وہی ہے جس نے تجھ پر یہ کتاب اتاری، جس میں سے کچھ آیات محکم ہیں۔ وہی کتاب کی اصل ہیں اور کچھ دوسری کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں۔''

پس ہم جان چکے ہیں کہ مکمل قرآن کو مطلق طور پر محکم بھی کہا جاسکتا ہے اور مطلق طور پر مکمل قرآن کو متشابہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح اس کے کسی حصے پر ''محکم'' کا اطلاق بھی کیا جاسکتا ہے اور کسی حصے پر متشابہ کا۔ اسی کو محکم اور متشابہ عام، یا محکم اور متشابہ خاص بھی کہا جاتا ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کا مخصوص معنی ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ﴾ (العنکبوت : ٤٩)

''بلکہ یہ تو واضح آیات ہیں۔''

اٰیــــات: آیۃ کی جمع ہے اور اس کا لغوی معنی علامت ہوتا ہے۔ قرآن کی آیت کو بھی آیت اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کی دلیل اور علامت ہیں۔ چنانچہ آیت لغت میں دلالت اور علامت کو کہتے ہیں۔ آیت کی دو قسمیں ہیں۔

ا...... آیات متلوۃ (تلاوت کی جاسکنے والی قرآن کی آیات)

۲...... آیات مخلوقہ (اللہ ربّ العالمین کی مخلوقات میں اس کی نشانیاں)

آیت متلوۃ......: اس سے مراد قرآن کی آیات ہیں۔

آیات مخلوقہ ......: مثال کے طور پر سورج، چاند، رات، دن، درخت، انسان، سمندر، دریا وغیرہ یہ سب آیات الٰہی ہیں۔ ان کو آیات اس لیے کہا جاتا ہے کہ: یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل اور علامات ہیں۔

لیکن جو آیات متلوہ ہیں وہ وحی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ ان سب کو آیات اس لیے کہتے ہیں کہ یہ آیات اللہ تعالیٰ کی عظمت، اس کے احکام اور قوانین پر دلالت کرتی ہیں۔

(۵)...... قرآن کریم حروف وکلمات اور آیات کا مجموعہ ہے۔

حروف: اس سے مراد معروف ۲۹ حروف تہجی (ا، ب، ت) ہیں۔ ان کو حروف اس لیے کہتے ہیں کہ حرف کا معنی ہوتا ہے: کنارہ۔ چونکہ یہ کلام سے الگ تھلگ ہوتے ہیں اور یہ اپنے ذاتی معنی پر اس وقت تک دلالت نہیں کرتے جب تک ان کو دوسرے الفاظ سے نہ جوڑا جائے۔ جب ان کو باہم جوڑا جائے تو کلمہ بن جاتا ہے۔ اور جب کلمات کو باہم جوڑا جائے تو جملہ بن جاتا ہے۔ کبھی جملہ اسمیہ، کبھی جملہ فعلیہ۔

الغرض قرآن کریم ان عربی حروف سے بنا ہے۔ ان حروف سے کلمات القرآن، کلمات القرآن سے آیات القرآن، آیات القرآن سے قرآن کی سورتیں اور ان سورتوں کا مجموعہ

قرآن عظیم اور کتاب مبین کہلاتا ہے۔

❁❁❁❁❁

مَنْ قَرَأَهُ فَأَعْرَبَهُ فَلَهُ بِكُلِّ حَرْفٍ عَشْرُ حَسَنَاتٍ. (۱)

ترجمہ......: جس نے اس کو بغیر غلطی کے صحیح انداز میں پڑھا، اسے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ملتی ہیں۔

تشریح......: (۱) جس نے قرآن کریم پڑھا اور اس کی صحیح قراءت کی، یعنی اس میں غلطی نہ کی تو اس کو ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ملتی ہیں۔

اعربه : اس کا معنی غلطی سے بچاؤ ہے۔ چنانچہ جو شخص قرآن کریم غلطی سے بچتے ہوئے پڑھے اس کے لیے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ملتی ہیں۔ کیونکہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا ملتا ہے۔ اور جو شخص قرآن کو بغیر غلطی کے پڑھنے سے عاجز آ جائے اس کو بھی اجر ملے گا۔ لیکن اسے اچھی قراءت کرنے والے سے کم اجر ملے گا۔ اسی لیے حدیث میں ہے:

اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ، وَالَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهُ أَجْرَانِ . (۱)

ترجمہ......: ''قرآنِ کریم کا ماہر (قیامت والے دن) بزرگ، نیکوکار فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو قرآن اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور اس کے پڑھنے میں اسے مشقت ہوتی ہے، اس کے لیے دگنا اجر ہے۔'' [1]

پس رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی اچھی طرح قراءت کرنے والے کا مقام باعزت، نیک اور بلند مقام فرشتوں کے ساتھ بتایا ہے اور اس کو اس شخص سے زیادہ اجر ملتا ہے جو قرآن کی قراءت میں تکلیف برداشت کرتا ہے۔

❁❁❁❁❁

---

[1] اسے امام احمدؒ نے اپنی مسند میں (۱۴/۲۰۶، ۲۴۶۶۷) اور امام مسلمؒ نے (۷۹۸) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا ہے۔

لَـهُ أَوَّلٌ وَّاٰخَـرٌ (١) وَأَجْـزَاءٌ وَّأَبْـعَـاضٌ (٢) مَتْـلُـوٌّ بِـالْأَلْسِنَةِ، مَحْفُوْظٌ فِي الصُّـدُوْرِ، مَسْـمُـوْعٌ بِـالْآذَانِ، مَـكْـتُـوْبٌ فِـي الْمَصَاحِفِ (٣) فِيْـهِ مُحْكَمٌ وَّمُتَشَابِهٌ (٤) وَنَاسِخٌ وَّمَنْسُوْخٌ (٥) وَخَاصٌ وَّعَامٌ (٦) وَاَمْرٌ وَنَهْيٌ (٧).

ترجمہ......: اس کا آغاز واختتام ہے، پارے اور اجزاء ہیں۔ زبانوں سے اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ سینوں میں محفوظ ہے، کانوں سے سنا جاتا ہے، مصاحف میں لکھا ہوا ہے۔ اس میں محکم بھی ہیں اور متشابہ بھی۔ ناسخ ومنسوخ، خاص وعام اور امر ونہی بھی۔

تشریح......: (١) قرآن کا اوّل وآخر بھی ہے یعنی ابتداء وانتہا۔ اس مصحف کے مطابق جس پر صحابہ کرام کا اجماع ہوا تھا، اس کی ابتداء سورۃ الفاتحہ سے ہوتی ہے اور اختتام سورۃ الناس پر۔

(٢)......قرآن کے پارے ہیں۔ جیسا کہ معروف ہے اس کے ٣٠ پارے ہیں۔ ہر پارے کے ١٠، ١٠ اوراق ہیں۔ اس میں احزاب بھی ہیں۔ احزاب سے مراد قرآن کا اتنا حصہ ہے جو قاری صلوٰۃ اللیل (تہجد کی نماز) میں پڑھتا ہے۔ خواہ وہ کسی بھی اعتبار سے ہو یعنی پڑھا جاتا ہو یا مصاحف میں لکھا گیا ہو یا سینوں میں محفوظ ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس میں اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔

چنانچہ جب قاری قرآن کو پڑھتا ہے تو بھی وہ کلام اللہ کو ہی پڑھ رہا ہوتا ہے۔ آواز قاری کی ہوتی ہے جو مخلوق ہے لیکن جس چیز کو پڑھا جارہا ہو یا تلاوت کیا جارہا ہو وہ اللہ کا کلام ہوتا ہے وہ مخلوق نہیں۔

اگر قرآن کریم لکھا ہوا ہو تو اس کے الفاظ و معانی اللہ کا کلام ہوتے ہیں۔ لیکن ورق، سیاہی اور لکھنا یہ انسان کے کام ہیں۔ لہٰذا یہ مخلوق ہیں۔

الغرض یہ ہر حالت میں اللہ کا کلام رہتا ہے خواہ زبان سے اس کی تلاوت کی جارہی ہو، سینوں میں محفوظ ہو یا تختیوں، اوراق اور مصاحف میں لکھا ہوا ہو۔ یا ان سے بلند کسی چیز میں لکھا ہوا ہو یعنی لوح محفوظ میں۔ کیونکہ قرآن کریم لوح محفوظ پر بھی لکھا ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴾ (الزخرف : ٤)

''اور بے شک وہ ہمارے پاس اصل کتاب میں یقیناً بہت بلند، کمال حکمت والا ہے۔''

اصل کتاب تو لوح محفوظ ہے:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ o فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ o﴾ (البروج : ٢١ تا ٢٢)

''بلکہ وہ ایک بڑی شان والا قرآن ہے۔ اس تختی میں (لکھا ہوا) ہے جس کی حفاظت کی گئی ہے۔''

یعنی وہ لوح محفوظ جس میں اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تقدیریں لکھی ہیں۔

(۴)......مکمل قرآن کریم پر لفظ محکم کا اطلاق بھی کیا جاسکتا ہے اور ''متشابہ'' کا بھی۔ اسی طرح قرآن کے کسی حصے کو محکم کہا جاسکتا ہے اور کسی کو متشابہ۔ ہر ایک کا خاص معنی ہے۔

(۵)......قرآن کریم میں ناسخ ومنسوخ بھی ہے۔ مؤلف رحمہ اللہ کے اس جملے سے ان لوگوں کا رد ہوتا ہے جو نسخ کا انکار کرتے ہیں۔ جیسے یہودی اور ان جیسے دوسرے لوگ۔ قرآن میں ناسخ ومنسوخ کا ہونا اللہ کی حکمت ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی وقت میں انسانوں کی بہتری کے لیے کوئی کام جائز کرتے، پھر ان کی حالت بدل جاتی اور ان کی ضرورت پوری ہوجاتی تھی تو اللہ تعالیٰ اس حکم کو نئے حکم کے ساتھ منسوخ کردیتے تھے۔

نسخ: اصولیین کے نزدیک نسخ سے مراد کسی دلیل سے ثابت شدہ حکم کا کسی دوسرے بعد میں آنے والے حکم کی وجہ سے اٹھ جانا ہے کسی ایسی دلیل کی بنیاد پر جو پہلے والے حکم کے بعد آئی ہو۔

چنانچہ ناسخ ومنسوخ قرآن میں ثابت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر رحمت، شفقت اور احسان کی دلیل ہے کہ وہ ہر حال میں ان کے لیے مناسب حکم دیتا تھا۔

اس کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْ مَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ۝﴾ (البقرہ: ۲۴۰)

''اور جو لوگ تم میں سے فوت کیے جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں وہ اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک نکالے بغیر سامان دینے کی وصیت کریں۔ پھر اگر وہ نکل جائیں تو تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو وہ معروف طریقے سے اپنی جانوں کے بارے میں کریں۔ اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔''

ابتداء میں وفات کی عدت پورا سال تھی پھر اللہ تعالیٰ نے اسے درج ذیل آیت کے ساتھ منسوخ کر دیا۔

﴿وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۝﴾ (البقرہ: ۲۳۴)

''اور جو لوگ تم میں سے فوت کیے جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ (بیویاں) اپنے آپ کو چار مہینے اور دس راتیں انتظار میں رکھیں، پھر جب اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو تم پر اس میں کچھ گناہ نہیں جو وہ اپنی جانوں کے بارے میں معروف طریقے سے کریں اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو پوری طرح باخبر ہے۔''

چنانچہ سال کی عدت ۴ ماہ دس دن کی عدت کے ساتھ منسوخ ہوگئی۔ یہ قرآن کریم میں ناسخ و منسوخ کی مثال ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۝﴾ (البقرہ: ۱۰۶)

''جو بھی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں، یا اسے بھلا دیتے ہیں، اس سے بہتر، یا اس جیسی (اور) لے آتے ہیں، کیا تو نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ ہر چیز پر

پوری طرح قادر ہے۔''

اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اپنے کلام، احکام اور تشریعات میں سے بندوں کی بہتری اور ضرورت کے لیے منسوخ کر دیتا ہے اور ہر وقت میں انہیں وہی حکم دیتا ہے جو ان کے لیے مناسب ہوتا ہے۔ جب اس حکم کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں دوسرا حکم دے دیتے ہیں جو لوگوں کی ضرورت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور نسخ قرآن میں واقع ہوا ہے جیسا کہ قبلہ کے بارہ میں۔

لوگ ابتداء اسلام میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ پھر اسے منسوخ کر کے کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ یہ بھی قرآن عظیم میں نسخ کی مثال ہے اور یہی مؤلف رحمہ اللہ کے قول ''مِنْهُ نَاسِخٌ وَ مَنْسُوْخٌ'' کا معنی ہے۔

قرآن کریم اور احکام شرعیہ میں نسخ کا انکار صرف گمراہ لوگ ہی کرتے ہیں۔

(٦)......قرآن کریم میں خاص اور عام بھی ہیں۔

عام: وہ لفظ جس میں تمام افراد شامل ہوں۔

خاص: وہ لفظ جو کسی گروہ کے ساتھ خاص ہو۔

مثال کے طور پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ﴾ (العصر: ٢)

''بے شک تمام انسان نقصان میں ہیں۔''

یہ لفظ تمام انسانوں کے لیے عام ہے۔

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (العصر: ٣)

''سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے۔''

یہ خاص ہے۔ کیونکہ مخصصات کی کئی قسمیں ہیں۔

(١)......بعض مخصصات متصلہ ہوتی ہیں۔

(٢)......بعض مخصصات منفصلہ ہوتی ہیں۔

جیسا کہ یہ کتب اصول میں معلوم ہے۔ عام کو خاص پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔

(۷)......اور اس میں امر و نہی بھی ہے۔

امر: طلب فعل کو کہتے ہیں۔ مثلاً:

﴿وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ﴾

(البقرہ: ۴۳)

''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ کا مطالبہ کیا ہے۔

نھی: رکنے کا مطالبہ نہی کہلاتا ہے۔

مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤی﴾ (الاسراء: ۳۲)

''اور زنا کے قریب نہ جاؤ۔''

اور صرف یہ نہیں کہا:

”لا تزنوا .“

''تم زنا نہ کرو۔''

بلکہ فرمایا: ”لا تقربوا“

یعنی تم زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ جب کسی چیز اور اس کے اسباب سے منع کر دیا جائے تو یہ صرف اس چیز کی ممانعت سے زیادہ بلیغ ہوتی ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۠﴾

(البقرہ: ۱۸۸)

''اور اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے مت کھاؤ اور نہ انھیں حاکموں کی

طرف لے جاؤ، تا کہ لوگوں کے مالوں میں سے ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ، حالانکہ تم جانتے ہو۔''

یہ نہی ہے۔ یعنی تم ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ۔ (نہ حاصل کرو) یعنی غیر شرعی طریقے اور مال کے مالک کی اجازت کے بغیر نہ کھاؤ۔

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (النساء: ۲۹)

''مگر یہ کہ تمھاری آپس کی رضا مندی سے تجارت کی کوئی صورت ہو۔''

ان کے علاوہ بھی قرآن کریم میں بہت سے اوامر ونواہی ہیں۔ ہر بھلائی (نیکی) کا حکم ہے اور ہر برائی سے نہی (ممانعت) ہے۔

❀❀❀❀❀

﴿لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾ (فصلت: ٤٢) (۱) وَقَوْلُهٗ تَعَالٰی: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ (الاسراء: ۸۸) (۲)

ترجمہ......: ''اس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ ایک کمال حکمت والے، تمام خوبیوں والے کی طرف سے اتاری ہوئی ہے۔'' اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہہ دے! اگر سب انسان اور جن جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہیں لائیں گے، اگرچہ ان کا بعض بعض کا مددگار ہو۔''

تشریح......: (۱) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ﴾

(حم السجدہ: ٤١)

''بے شک وہ لوگ جنھوں نے اس نصیحت کے ساتھ کفر کیا، جب وہ ان کے

پاس آئی (وہ بھی ہم پر مخفی نہیں ہیں)۔ اور بلاشبہ یہ یقیناً ایک باعزت کتاب ہے۔''

عــزیــز: کا معنی ہے کہ: یہ کتاب اپنے اوپر ہونے والے حملوں کو روکنے والی ہے اس لیے کوئی بھی اس میں تبدیلی کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾ (حم السجدہ: ٤٢)

''اس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔''

یعنی نہ تو اس سے پہلے والی کوئی آسمانی کتاب اس کی تکذیب کرتی اور جھٹلاتی ہے اور نہ ہی اس کے بعد کوئی کتاب آسمان سے اس کی تکذیب کرنے والی آئے گی۔

﴿تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ (حم السجدہ: ٤٢)

''تمام خوبیوں والے کی طرف سے اتاری ہوئی ہے۔''

اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے اسے نازل کیا ہے۔ لہٰذا یہ مخلوق نہیں ہے۔

(۲)...... جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم نازل فرمایا تو دشمنوں اور کافروں نے اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کیں۔ انہوں نے کہا: ''یہ قرآن صرف پچھلے لوگوں کے قصے کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ محمد ﷺ نے اسے خود لکھا ہے اور تمہیں پڑھ کر سنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔ یہ جھوٹے قصے ہیں۔ اور بعض نے کہا: یہ قرآن شاعری ہے۔ بعض نے کہا: جادو ہے۔ بعض نے کہا: اگر میں چاہوں تو میں بھی ایسا نازل کردوں جیسا اللہ نے کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا: قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ نہیں ہے۔ غرضیکہ: اسی طرح کی دیگر باتیں انہوں نے قرآن کے بارے میں کیں۔ کبھی وہ کہتے:

﴿إِنْ هَٰذَآ إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ﴾ (المدثر: ٢٥)

''یہ تو محض ایک انسان کا کلام ہے۔''

یعنی محمد ﷺ کا۔

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِنْ هَٰذَآ إِلَّآ إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ

آخَرُوْنَ فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَّزُوْرًاo وَقَالُوْا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًاo﴾ (الفرقان: ٤ تا ٥)

''اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا؛ یہ نہیں ہے مگر ایک جھوٹ، جو اس نے گھڑ لیا ہے۔ اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس پر اس کی مدد کی۔ سو بلا شبہ وہ ایک ظلم اور جھوٹ پر اتر آئے ہیں۔ اور انھوں نے کہا یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں، جو اس نے لکھوا لی ہیں، تو وہ پہلے اور پچھلے پہر اس پر پڑھی جاتی ہیں۔''

اللہ نے انہیں چیلنج کرتے ہوئے فرمایا: تم کہتے ہو: یہ محمد ﷺ کا کلام ہے، یہ بشر کا کلام ہے۔ محمد ﷺ تمہارے جیسے بشر ہیں، یہ قرآن الفاظ وکلمات کا مجموعہ ہے اور تمہاری زبان میں اس کی آیات اتری ہیں؟ اگر ایسا ہے تو تم بھی بشر ہو بلکہ تم اپنے دور کے فصیح ترین انسان ہو، تو اس قرآن جیسی کوئی کتاب لا کر دکھاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ چیلنج کیا لیکن وہ عاجز آ گئے۔

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًاo﴾ (الاسراء: ۸۸)

''کہہ دے اگر سب انسان اور جن جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہیں لائیں گے، اگرچہ ان کا بعض بعض کا مددگار ہو۔''

یہ آیت رسول اللہ ﷺ کی ہجرت سے پہلے اس وقت نازل ہوئی جب آپ ﷺ مکہ میں تھے اور ابھی آپ ﷺ کو سلطنت و قوت نہیں ملی تھی۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان کو یہ چیلنج کر دیا اور وہ اپنی سخت دشمنی کے باوجود بھی اس چیلنج کا مقابلہ نہ کر سکے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں چیلنج کیا کہ وہ دس سورتیں بنا لائیں۔

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَo﴾ (ھود: ۱۳)

''یا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے گھڑ لیا ہے۔ کہہ دے! پھر اس جیسی دس سورتیں

گھڑی ہوئی لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔"

یعنی تم جنوں اور انسانوں میں سے جس کی چاہو مدد لے لو اور اس قرآن جیسی دس سورتیں ہی لا کر دکھاؤ۔ وہ یہ بھی نہ کر سکے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں چیلنج کیا کہ ایک ہی سورت لا کر دکھا دو۔ بلکہ سورہ الکوثر یا سورۃ النصر جیسی کوئی سی سورت ہی بنا کر دکھاؤ۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

(البقرہ: ۲۳)

"اور اگر تم اس کے بارے میں کسی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو اس کی مثل ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتی بلا لو، اگر تم سچے ہو۔"

یعنی جس کی چاہے مدد حاصل کرو اور پھر جو سورت تم بناؤ اس پر کوئی گواہ بھی پیش کرنا کہ یہ قرآن جیسی ہے۔ وہ یہ بھی نہ کر سکے۔ تو ثابت ہو گیا کہ قرآن حکیم اللہ العظیم کا کلام ہے۔ کیونکہ اگر یہ بشر کا کلام ہوتا تو وہ اس جیسا بنانے میں کامیاب ہو جاتے۔ جب وہ ایسا نہ کر سکے تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ کسی مخلوق کا کلام نہیں بلکہ خالق کا کلام ہے۔

چنانچہ یہ قرآن ایک عظیم نشانی اور رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اور یہ معجزہ صدیاں گزرنے کے باوجود بھی باقی ہے۔ یہ چیلنج قیامت تک ہر شخص کے لیے قائم ہے۔ لیکن نہ کوئی ایسا کر سکا اور نہ ہی کر سکے گا۔

﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ (البقرہ: ۲۳ تا ۲۴)

"تو اس کی مثل ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتی بلا لو، اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا اور نہ کبھی کرو گے۔"

یہ مستقبل کی خبر ہے اور یہ چیلنج قیامت تک قائم رہے گا۔

﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ﴾

(البقرہ: ۲٤)

''تو اس آگ سے بچ جاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

چنانچہ قرآن کریم آج بھی پوری کائنات کے جنوں اور انسانوں کو چیلنج کر رہا ہے کہ وہ اس قرآن جیسی کوئی چھوٹی سی سورت ہی بنا کر دکھا دیں۔

اور چونکہ کوئی بھی اللہ کے کلام جیسا کلام لانے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ لہٰذا یہ دلیل ہے کہ قرآن بزرگی والے دانا اللہ ربّ العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

❀❀❀❀❀

وهٰذا هُوَ الْكِتَابُ الْعَرَبِیُّ الّذِیْ قَالَ فِیْهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ (السباء: ۳۱) (۱) وَقَالَ بَعْضُهُمْ ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ﴾ فَقَالَ سُبْحَانَهُ ﴿سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ﴾ (المدثر: ۲۵تا۲٦) (۲) وَقَالَ بَعْضُهُمْ: هُوَ شِعْرٌ، وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَهٗ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌo﴾ (یس: ٦۹). (۳)

ترجمہ......: اور یہی وہ عربی کتاب ہے جس کے متعلق کفار نے کہا تھا ''ہم اس قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے۔'' اور ان میں سے کچھ نے کہا: ''یہ تو سراسر انسان کا کلام ہے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''عنقریب اسے (قرآن کا انکار کرنے والے کو) ہم جہنم میں ڈالیں گے۔'' اور ان میں سے بعض نے کہا: یہ شعر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ہم نے اسے (اپنے پیغمبر محمد ﷺ کو) شعر نہیں سکھائے اور نہ ہی یہ اس کے لائق تھے۔ یہ تو نصیحت اور واضح قرآن ہے۔''

تشریح......: (۱) یہ ان کی باتوں کا خلاصہ ہے کہ انہوں نے دشمنی اور تکبر کی وجہ سے کہا: ''ہم

نہ تو اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور نہ ہی اس سے پہلی کتابوں پر۔'' (سباء:۳۱)

(۲)...... یہ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے بدترین دشمن ولید بن مغیرہ مخزومی نے کہا تھا کہ یہ تو انسان کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے وعید سنائی اور فرمایا: ''عنقریب ہم اسے جہنم میں ڈالیں گے۔''

﴿سَاُصۡلِيۡهِ سَقَرَ ٥ وَمَاۤ اَدۡرٰكَ مَا سَقَرُ ٥﴾ (المدثر: ٢٦تا٢٧)

''میں اسے جلد ہی سقر (جہنم) میں داخل کروں گا۔ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ سقر (جہنم) کیا ہے؟''

اللہ تعالیٰ نے اسے یہ وعید اس لیے سنائی کیونکہ اس نے یہ بات کہی تھی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ قرآن انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ اس نے اعتراف بھی کرلیا تھا کہ یہ ممکن نہیں کہ یہ انسان کا کلام ہو۔ لیکن جب اس نے قوم کے اپنے اوپر بدلتے ہوئے تیور دیکھے اور ان کی ناراضگی دیکھی تو ان کے سامنے ایسے ظاہر کرایا کہ یہ تو انسان کا کلام ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں فرمایا:

﴿اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ٥ فَقُتِلَ كَيۡفَ قَدَّرَ ٥ ثُمَّ قُتِلَ كَيۡفَ قَدَّرَ ٥ ثُمَّ نَظَرَ ٥ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ٥ ثُمَّ اَدۡبَرَ وَاسۡتَكۡبَرَ ٥ فَقَالَ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ يُّؤۡثَرُ ٥ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا قَوۡلُ الۡبَشَرِ ٥﴾ (المدثر: ١٨تا٢٥)

''بے شک اس نے غور وفکر کیا اور بات بنائی۔ پس وہ مارا جائے، اس نے کیسی بات بنائی! پھر مارا جائے، اس نے کیسی بات بنائی! پھر اس نے دیکھا۔ پھر اس نے تیوری چڑھائی اور برا منہ بنایا۔ پھر اس نے پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔ پھر اس نے کہا: یہ جادو کے سوا کچھ نہیں، جو نقل کیا جاتا ہے۔ یہ انسان کے قول کے سوا کچھ نہیں۔''

(۳)...... ان میں سے بعض نے کہا: یہ شاعری ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ﴾ (الحاقه : ٤١)

''اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔''

اور فرمایا:

﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ﴾ (یس : ٦٩)

''اور ہم نے نہ اسے شعر سکھایا ہے۔''

رسول اکرم ﷺ شاعر نہیں تھے اور نہ ہی آپؐ کے بارے میں یہ معروف تھا کہ وہ شاعر ہیں۔ نہ ہی آپؐ شعر کہتے تھے۔ پھر یہ قرآن کیسے شاعری ہوسکتا ہے۔ سو قرآن کو شاعری کہنا بالکل واضح جھوٹ ہے۔

❀❀❀❀❀

فَلَمَّا نَفَي اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهُ شِعْرٌ وَأَثْبَتَهُ قُرْاٰنًا لَمْ يَبْقَ شُبْهَةٌ لِذِي لُبٍّ فِيْ أَنَّ الْقُرْآنَ هُوَ هٰذَا الْكِتَابُ الْعَرَبِيُّ الَّذِيْ هُوَ كَلِمَاتٌ وَّحُرُوْفٌ وَاٰيَاتٌ (١)؛ لِأنّ مَا لَيْسَ كَذَالِكَ لَا يَقُوْلُ اَحَدٌ: إِنَّهُ شِعْرٌ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ﴾ (البقره : ٢٣) (١)

ترجمہ......: جب اللہ تعالیٰ نے اس کے شاعری ہونے کی نفی کردی اور ثابت کردیا کہ یہ قرآن ہے تو کسی عقلمند کے لیے کوئی شبہ باقی نہ رہا کہ قرآن ہی وہ عربی کتاب ہے جو کلمات و حروف اور آیات کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اور اگر تم اس کے بارے میں کسی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو اس کی مثل ایک سورت ہی لے آؤ۔''

تشریح......: (١) یعنی کسی عقلمند کو اس بات میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور یہ کہ جب جبریل علیہ السلام یا محمد ﷺ یا امت قرآن کی تلاوت کرے، اسے لکھے یا حفظ کرے تو وہ اللہ کے کلام کو ہی لکھتے، حفظ کرتے اور پڑھتے ہیں۔

(٢) ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ﴾ یعنی اے کفار! اگر تمہیں کوئی شک ہے ﴿مِّمَّا

نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا﴾ جو ہم نے اپنے بندے یعنی محمد ﷺ پر نازل کیا ہے۔اور وہ قرآن ہے ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ''تو اس جیسی کوئی سورت لا کر دکھاؤ اور جسے چاہے مدد کے لیے بلالو۔''

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا﴾ یعنی اگر تم کوئی سورت نہ لا سکے۔

﴿وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ اور تم قیامت تک نہ لاسکو گے۔

تو جان لو کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) پر تہمت لگا رہے ہو۔

﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾

(البقرہ: ٢٤)

''تو اس آگ سے بچ جاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے دشمنی رکھے، اس سے تکبر کرے، اس کی آیات کا انکار کرے اور ان کے بارے میں بحث کرے تو اس کی یہی سزا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلَا يَجُوْزُ أَنْ يَتَحَدَّاهُمْ بِالْإِتْيَانِ بِمِثْلِ مَا لَا يُدْرَي مَا هُوَ وَلَا يُعقلُ. (١)

ترجمہ......: اور وہ انہیں کسی ایسی چیز کی مثل لانے کا چیلنج کرتا جو عقل و سمجھ سے بالاتر ہوتی تو یہ درست نہ ہوتا۔

تشریح......: (۱) اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی چیز کا چیلنج کیا جو ان کی زبان میں تھی۔ ان کے کلام کی طرح الفاظ وکلمات اور جملوں کا مجموعہ تھی۔ وہ اس کے معانی اور تراکیب کو سمجھتے تھے کیونکہ وہ فصیح اللسان عرب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی ایسی زبان کا چیلنج نہیں کیا جس کے حروف و کلمات اور معانی وتراکیب سے وہ نا آشنا ہوں۔ بلکہ قرآن کریم بھی فصیح عربی زبان میں ہے۔

حروف وکلمات اور جملوں کا مجموعہ ہے۔اس کے معانی ان کے ہاں معروف تھے کیونکہ وہ ان کی اسی زبان میں تھے جو وہ روزمرہ اپنی گفتگو میں استعمال کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ۝ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (الشعراء: ۱۹۸ تا ۱۹۹)

''اور اگر ہم اسے غیر عرب لوگوں میں سے کسی پر نازل کرتے۔پس وہ اسے ان پر پڑھتا تو بھی وہ اس پر ایمان لانے والے نہ ہوتے۔''

﴿وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَ اَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ط قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْ آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّ هُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ۝﴾

(حم السجدہ: ٤٤)

''اور اگر ہم اسے عجمی قرآن بنا دیتے تو یقیناً وہ کہتے: اس کی آیات کھول کر کیوں نہ بیان کی گئیں۔کیا عجمی زبان اور عربی (رسول)؟ کہہ دے! یہ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہدایت اور شفا ہے۔اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور یہ ان کے حق میں اندھا ہونے کا باعث ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جنھیں بہت دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔''

ایک عربی نبی پر عجمی زبان میں قرآن کیسے نازل ہوسکتا تھا۔یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اس نے نبی کریم ﷺ کی زبان میں اور ان کی زبان میں قرآن نازل کیا جن کی طرف آپ ﷺ کو بھیجا گیا اور جن میں آپ ﷺ کو مبعوث کیا گیا تھا۔

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ط فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ ط وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾

(ابراهيم: ٤)

''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں، تاکہ وہ ان کے

لیے کھول کر بیان کرے، پھر اللہ گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔''

ہر رسول اپنی قوم کی ہی زبان بولتا اور ویسی ہی گفتگو کرتا جو وہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے انہیں اس قرآن کریم کے ذریعے مخاطب کیا جو ایسے حروف وکلمات، جملوں اور تراکیب سے بنا ہے جو ان کی زبان میں موجود ہیں۔ تو پھر اس جیسا کلام بنانے میں انہیں کیا رکاوٹ تھی۔

رکاوٹ صرف یہ تھی کہ یہ قرآن ایک معجزہ ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کسی کے لیے ممکن نہیں کہ کلام اللہ کے مشابہ کوئی کلام بنا سکے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام اس کی صفت ہے اور اس کی صفات مخلوق کی صفات کے مشابہ نہیں ہو سکتیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل کردہ اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے قاصد ہیں۔

❁❁❁❁❁

وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالَى: ﴿وَإِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي﴾ (یونس: ۱۵) فَأَثْبَتَ أَنَّ الْقُرْآنَ هُوَ الْآيَاتُ الَّتِي تُتْلَى عَلَيْهِمْ. (۱)

ترجمہ......: اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اور جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں: کوئی قرآن اس کے سوا لے آ، یا اسے بدل دے۔ کہہ دے! میرے لیے ممکن نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قرآن ہی وہ آیات ہیں جو ان

کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

تشریح.......: اٰيَاتِنَا: یعنی قرآن کریم کی آیات۔

بَيِّنَاتٌ: یعنی الفاظ و معانی اور دلالت کے اعتبار سے واضح ہیں۔ ان میں کسی قسم کی پیچیدگی اور پوشیدگی نہیں، نہایت واضح ہیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا: یعنی جو لوگ اخروی زندگی، قیامت اور محاسبہ پر ایمان نہیں لاتے وہ رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کرتے ہیں۔

اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ: کہ اس کے علاوہ کوئی قرآن لا (جو ان کی خواہشات کے مطابق ہو) یا اس قرآن کو تبدیل کر دے۔

وہ کہتے ہیں: ہمیں اس کے علاوہ قرآن چاہیے۔ جب تم ہمیں اس کے علاوہ کوئی قرآن لا کر دو گے تو ہم اس کو مان لیں گے اور اس پر ایمان لے آئیں گے۔'' وہ ایسا اس لیے کہتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ قرآن رسول اللہ ﷺ کا اپنا کلام ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ سے فرمایا:

﴿قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ﴾

''آپ فرما دیجیے! میں اسے اپنے مرضی سے نہیں بدل سکتا (بلکہ میں تو صرف پیغام رساں ہوں۔)''

ہاں اس کو بدلنے والی اور اس کے کسی حصے کو منسوخ کرنے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے جس نے اس کے ساتھ کلام فرمایا ہے:

﴿اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾

''میں تو صرف اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔''

میں تو صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ایک پیغام رساں ہوں اور تمہارے اور اللہ کے درمیان ایک واسطہ ہوں۔

﴿قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۝﴾

(یونس : ١٥)

''کہہ دے! میرے لیے ممکن نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں پیروی نہیں کرتا مگر اسی کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ بے شک میں اگر اپنے رب کی نافرمانی کروں تو بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔''

اگر نبی کریم ﷺ اس قرآن میں کوئی تبدیلی کرتے اور اپنی طرف سے اس میں کچھ داخل کرتے تو اللہ تعالیٰ انہیں بھی عذاب دیتا۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ۝﴾ (الحاقه : ٤٤ تا ٤٦)

''اور اگر وہ ہم پر کوئی بات بنا کر لگا دیتا۔ تو یقیناً ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑتے۔ پھر یقیناً ہم اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے۔''

رسول کریم ﷺ قرآن کریم میں تبدیلی نہیں کرتے تھے بلکہ اسے اسی طرح لوگوں تک پہنچاتے تھے جس طرح یہ اللہ کی طرف سے نازل ہوتا تھا۔ بعثتِ رسول کا مقصد ہی اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانا ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۫ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝﴾ (یونس : ١٦)

''کہہ دے! اگر اللہ چاہتا تو میں اسے تم پر نہ پڑھتا اور نہ وہ تمھیں اس کی خبر دیتا۔ پس بے شک میں تم میں اس سے پہلے ایک عمر رہ چکا ہوں۔ تو کیا تم نہیں سمجھتے؟''

نبی معظم محمد رسول اللہ ﷺ بعثت سے پہلے ۴۰ سال تک مکہ میں رہے۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ شب و روز بسر کیے۔ وہ آپ ﷺ سے واقف تھے۔ انہیں علم تھا کہ

آپ ﷺ نے نہ تو ان کے پاس علم حاصل کیا اور نہ ہی طلبِ علم کے لیے کسی دوسرے ملک کا سفر کیا۔ بلکہ آپ ان کے ساتھ مکہ میں رہتے تھے۔ وہ آپ کی امانت داری اور حسن اخلاق سے واقف تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی چالیس سالہ زندگی میں ان سے اس قرآن کی کوئی بات نہ کی تھی۔ بلکہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رسول بنانا چاہا تو آپ ﷺ پر قرآن نازل فرمایا اور آپ ﷺ نے اسے جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دیا۔

الغرض ''فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمْرًا مِنْ قَبْلِهِ'' کا معنی یہ ہوا کہ میں نے نبوت سے پہلے چالیس سال تمہارے ساتھ ہی گزارے ہیں۔ اگر یہ قرآن میرے پاس پہلے سے تھا تو اسے تمہارے سامنے پیش کرنے میں کیا رکاوٹ تھی کہ میں نے چالیس سال تک تمہارے سامنے اس کا کوئی تذکرہ نہ کیا؟

❀❀❀❀❀

وَقَالَ تَعَالَى: ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ﴾ (العنکبوت: ٤٩) وَقَالَ: ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ﴾ (الواقعه: ٧٧،٧٨) بَعْدَ أَنْ أَقْسَمَ عَلَى ذَالِكَ. (٢)

ترجمہ……: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''بلکہ یہ تو واضح آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنھیں علم دیا گیا ہے اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر جو ظالم ہیں۔'' اور پھر اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھا کر فرمایا: ''بلاشبہ یہ یقیناً ایک باعزت پڑھی جانے والی چیز ہے۔ ایک ایسی کتاب میں جو چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔''

تشریح……: (۱) قرآن کریم میں اس بات کے واضح دلائل موجود ہیں کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ مثلاً ایک دلیل یہ ہے کہ یہ اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہے اور اس کا آسانی سے یاد ہو جانا اور کثرت سے اس کی تلاوت دلیل ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف

سے نازل کردہ ہے۔

(۲)......اللہ تعالیٰ نے ستاروں کے گرنے کی جگہوں کی قسم اٹھاتے ہوئے فرمایا:

﴿فَلَآ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عَظِيۡمٌ ۝﴾

(الواقعہ: ۷۵تا۷۶)

''پس نہیں! میں ستاروں کے گرنے کی جگہوں کی قسم کھاتا ہوں! اور بلاشبہ یہ یقیناً ایسی قسم ہے کہ اگر تم جانو تو بہت بڑی ہے۔''

پھر فرمایا:

﴿اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌ ۝ فِىۡ كِتٰبٍ مَّكۡنُوۡنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ ۝ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝﴾ (الواقعہ: ۷۷۔۸۰)

ترجمہ......: ''بلاشبہ یہ یقیناً ایک باعزت پڑھی جانے والی چیز ہے۔ایک ایسی کتاب میں جو چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔اسے کوئی ہاتھ نہیں لگاتا مگر جو بہت پاک کیے ہوئے ہیں۔تمام جہانوں کے رب کی طرف سے اتاری ہوئی ہے۔''

﴿كِتٰبٌ مَّكۡنُوۡنٌ﴾ سے مراد لوح محفوظ ہے۔جبکہ اَلۡمُطَهَّرُوۡنَ سے مراد: معزز فرشتے ہیں۔

﴿تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعَالَمِيۡنَ﴾ فرما کر یہ واضح کر دیا کہ یہ قرآن نہ تو لوح محفوظ کا ذاتی کلام ہے اور نہ جبریل و محمد ﷺ کا۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

نجوم سے مراد:

اس کے مفہوم کے بارے میں مختلف اقوال ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

(۱)......بعض لوگ کہتے ہیں: اس سے مراد آسمان کے ستارے ہیں۔ چونکہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ یہ بارش نازل کرتے ہیں۔ یا بارش کے نزول میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ ستاروں سے بارش مانگتے تھے اور بارش کے نزول کو کسی ستارے کے طلوع یا غروب کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے ستاروں کے غروب ہونے کے مقامات

کی قسم کھائی کہ یہ ستارے کسی قسم کا اختیار نہیں رکھتے۔ بلکہ یہ تو محض اللہ تعالیٰ کی (بے شمار) مخلوقات میں سے (ایک مخلوق) ہیں۔

﴿وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ﴾

''اور بلاشبہ یہ یقیناً ایسی قسم ہے کہ اگر تم جانو تو بہت بڑی ہے۔''

(۲)......بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ''مواقع النجوم'' سے مراد قرآن کریم کے حصے ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم بھی رسول اکرم ﷺ پر آپ کی بعثت سے وفات تک واقعات اور حوادث کے اعتبار سے تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۳ سال میں نازل کیا گیا تھا۔ اس کا کچھ حصہ مکہ میں نازل ہوا اور کچھ مدینہ منورہ میں۔

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۚ﴾

(الفرقان : ۳۲)

''اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، یہ قرآن اس پر ایک ہی بار کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟۔''

یہ بھی ان کا ایک گھٹیا اعتراض ہے۔ حالانکہ اہم بات یہ نہیں کہ قرآن ایک ہی بار نازل ہوا یا تھوڑا تھوڑا کر کے۔ بلکہ اہم بات یہ ہے کہ تم قرآن کی پیروی کرتے ہو یا نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ ۖ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۝ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ۝﴾ (الفرقان : ۳۲تا۳۳)

''اسی طرح (ہم نے اتارا) تاکہ ہم اس کے ساتھ تیرے دل کو مضبوط کریں۔ اور ہم نے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا، خوب ٹھہر کر پڑھنا۔ اور وہ تیرے پاس کوئی مثال نہیں لاتے مگر ہم تیرے پاس حق اور بہترین تفسیر بھیج دیتے ہیں۔''

یعنی قرآن کریم کے رسول کریم ﷺ پر تھوڑا تھوڑا نازل کرنے کی حکمت یہ ہے کہ یہ انداز امت کے لیے زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ اگر تمام احکام اور اوامر ونواہی یکبارگی نازل

کر دیے جاتے تو یہ امت کے لیے باعث مشقت ہوتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شریعت مطہرہ کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالَى ﴿كٓهٰيٰعٓصٓ﴾ (مریم : ۱) وَقَالَ تَعَالَى ﴿حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ ۝﴾ (الشوریٰ : ۱، ۲) وَافْتَتَحَ تِسْعًا وَّعِشْرِيْنَ سُوْرَةً بِالْحُرُوْفِ الْمُقَطَّعَةِ. (۱)

ترجمہ......: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (کھیعص)، (حم عسق) اور اللہ تعالیٰ نے ۲۹ سورتوں کا آغاز حروف مقطعات سے فرمایا ہے۔

تشریح......: (۱) قرآن کریم میں بعض سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات آئے ہیں۔ مثلاً الٓمٓ، الٓر، الٓمٓص، طٰه، یٰسٓ، صٓ، قٓ، نٓ، حٰمٓ، عٓسٓقٓ۔ ایسی سورتوں کا آغاز کبھی تو ایک حرف سے ہوتا ہے، کبھی دو سے، کبھی تین سے اور کبھی اس سے زیادہ حروف کے ساتھ۔

بلاشبہ یہ حروف قرآن کریم کا حصہ ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کلام انہی حروف، کلمات اور آیات سے مل کر بنا ہے۔ کیونکہ یہ عربی زبان میں ہے اور عربی زبان انہی حروف سے مل کر بنتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بڑے بڑے قادر الکلام اور فصیح اللسان اس جیسا کلام بنانے سے عاجز آ گئے۔ حالانکہ وہ فصاحت و بلاغت اور بیان کو جاننے والے ہیں اور ان الفاظ کو اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔

اگرچہ وہ بڑی لمبی لمبی تقریریں کرنے والے خطباء تھے لیکن پھر بھی اس قرآن جیسی ایک سورت بھی نہ بنا سکے۔ ان کا قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت جیسا کلام بنانے سے بھی عاجز آ جانا، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انسانوں، فرشتوں اور مخلوق کا کلام نہیں بلکہ اللہ خالق کا کلام ہے۔

حروف مقطعات کے بارے میں علماء کے اقوال:

حروف مقطعات کے بارے میں علماء کے درج ذیل اقوال ہیں:

(۱)......بعض کہتے ہیں: صرف اللہ تعالیٰ ہی ان کی مراد کو جانتا ہے۔ چنانچہ یہ ان کے

متعلق بحث نہیں کرتے۔

(۲)......بعض کہتے ہیں: سورتوں کے آغاز میں ان حروف کا آنا اعجاز قرآنی کی طرف اشارہ ہے کہ یہ قرآن انہی حروف سے بنا ہے لیکن اس کے باوجود تم قرآن جیسی ایک چھوٹی سی سورت بھی نہیں بنا سکتے۔

یہ علماء کہتے ہیں کہ اسی لیے حروف مقطعات کے بعد اکثر قرآن کا ذکر آتا ہے۔ مثلاً

﴿الٓمّٓ o ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ o﴾ (البقرہ: ۱ تا ۲)

''الٓمّٓ یہ کتاب، اس میں کوئی شک نہیں، بچنے والوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ کتاب ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر اور متقین کے لیے سراپا ہدایت ہے۔

اسی طرح دیگر مقامات پر ہے۔ مثلاً:

﴿صٓ o وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ﴾ (ص: ۱)

''صٓ۔ اس نصیحت والے قرآن کی قسم!''

﴿قٓ o وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ (ق: ۱)

''قٓ۔ قسم ہے قرآن کی جو بہت بڑی شان والا ہے!''

﴿حٰمٓ o عٓسٓقٓ o كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ o﴾ (الشوریٰ: ۱ تا ۳)

''حٰمٓ۔ عٓسٓقٓ۔ اسی طرح وحی کرتا ہے تیری طرف اور ان لوگوں کی طرف جو تجھ سے پہلے تھے۔ وہ اللہ جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔''

﴿الٓرٰ o كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ﴾

(ھود: ۱)

''الٓرٰ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں، پھر انھیں کھول کر بیان کیا گیا ہے ایک کمال حکمت والے کی طرف سے جو پوری خبر رکھنے والا ہے۔''

﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ o اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ o﴾ (یوسف : ۱ تا ۲)

''الٓـرٰ ۔ یہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔ بے شک ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے، تا کہ تم سمجھو۔''

الغرض ان حروف مقطعات کے بعد قرآن کریم کا ذکر اس کے اعجاز کی طرف اشارہ ہے۔ اسی قول کو اہل علم کی ایک جماعت اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اختیار کیا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ : مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فَاَعْرَبَهُ، فَلَهُ بِكُلِّ حَرْفٍ مِنْهُ عَشْرُ حَسَنَاتٍ وَمَنْ قَرَأَهُ وَلَحَنَ فِيهِ فَلَهُ بِكُلِّ حَرْفٍ حَسَنَةً.

ترجمہ......: اور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''جس نے قرآن کریم کو عربی لہجے میں پڑھا، اس کے لیے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ہیں اور جس نے اس کو پڑھنے میں غلطی کی اس کے لیے (صرف) ایک نیکی ہے۔[1]

تشریح......: جو شخص قرآن کریم کو غلطی کے بغیر عربی لہجے میں پڑھے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسے قرآن یاد ہے اور وہ اس پر توجہ دیتا ہے۔ چنانچہ ایسے شخص کے لیے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ہیں۔ کیونکہ ہر نیکی کا ثواب دس گنا ملتا ہے۔ اس سے قرآن کو اچھی طرح یاد کرنے اور بغیر غلطی کے پڑھنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

جو شخص قرآن کو پڑھتا تو ہے لیکن عربی پر اچھی طرح عبور نہ ہونے کی وجہ سے غلطی کر جاتا ہے۔ زبر کی جگہ زیر اور زیر کی جگہ پیش پڑھ دیتا ہے تو اس کو اس کی استطاعت اور محنت کے مطابق اجر ملے گا۔ اس کی غلطی کو معاف کر دیا جائے گا۔ کیونکہ اس نے اپنی پوری استطاعت

---

[1] ابن قدامہ نے اسے مغنی میں (۲/۶) بیان کیا ہے اور اسے ترمذی کی طرف منسوب کیا ہے۔ کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ لیکن ہمارے پاس موجود ترمذی کے نسخوں میں ہمیں یہ حدیث نہیں ملی اور نہ ہی کسی اور حدیث کی کتاب میں۔ لیکن اس حدیث کے مفہوم کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے ''الماهر بالقران مع السفرة الكرام البررة، والذى يقرأ القرآن ويتتعتع فيه وهو عليه شاق فله اجران.''

کے مطابق اسے صحیح پڑھنے کی پوری کوشش کی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

((اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ، وَالَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهُ أَجْرَانِ.))

"قرآن کو مہارت سے پڑھنے والا (قیامت کے دن) بزرگ، نیکوکار فرشتوں کے ساتھ ہوگا جو اللہ عزوجل کے ہاں کتابت وحی کا کام کرتے ہیں۔ اور جو شخص قرآن اٹک اٹک کر پڑھتا ہے لیکن اسے پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے، اس کے لیے دگنا اجر ہے۔"

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان سے قرآن کریم کی تلاوت حسب استطاعت ہی مطلوب ہے۔ لہٰذا اگر کوئی قرآن کو سیکھنے کی استطاعت رکھتا ہے اور اپنی قراءت کو اچھا کرسکتا ہے تو اس پر یہ واجب ہے کہ اس علم سے جاہل نہ رہے۔ اگر کوئی اسے سیکھنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو وہ حسب استطاعت پڑھ لے، قرآن کی تلاوت اور قراءت کو نہ چھوڑے۔ بلکہ کوشش کرتا رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔

یہ ایک پہلو ہے۔ لیکن جس پہلو سے مصنف نے یہ حدیث بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ قاری کے حصے میں صرف قرآن کی تلاوت اور قراءت ہے۔ جبکہ جو چیز پڑھی جاتی ہے وہ اللہ کا کلام ہے اور قراءت پڑھنے والے کا عمل ہوتا ہے۔ اسی لیے کوئی اسے اچھی آواز سے پڑھتا ہے اور کوئی اسے اچھی آواز سے نہیں پڑھ سکتا۔ چنانچہ لوگوں کی زبانوں سے مختلف انداز تلاوت کا پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قراءت لوگوں کا عمل ہے اور جو چیز پڑھی جاتی ہے وہ اللہ کا کلام ہے۔ اسی لیے علماء کہتے ہیں: آواز قاری کی ہوتی ہے اور کلام اللہ تعالیٰ کا۔ بعض اس کو زیادہ اچھے انداز میں پڑھتے ہیں اور بعض کم۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ ((إِقْرَاءُ والقُرآنَ قَبْلَ اَنْ يَّاتِيَ قَوْمٌ يُقِيمُوْنَ حُرُوْفَهُ إِقَامَةَ السَّهْمِ، لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ، يَتَعَجَّلُوْنَ أَجْرَهُ وَلَا يَتَأَجَّلُوْنَهُ.'' (۱) [1]

ترجمہ......: اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''قرآن پڑھو اس سے پہلے کہ ایک ایسی قوم آجائے جو اس کے حروف کو تو تیر کی طرح سیدھا کریں گے لیکن قرآن ان کے حلقوں سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ اس کی اجرت لینے میں جلدی کریں گے اور بالکل تاخیر نہیں کریں گے۔''

تشریح......: (۱) مصنف نے اس حدیث کو اس حدیث کے بعد ذکر کیا ہے جس میں قرآن کریم کو عربی لہجے اور لغوی طور پر صحیح پڑھنے والے شخص کی فضیلت بیان ہوئی کہ اس کو ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ملتی ہیں۔

لیکن اس حدیث میں وضاحت ہے کہ محض قرآن کریم کی تلاوت ہی مقصود نہیں بلکہ تلاوت برائے عمل مقصود ہے۔ الغرض! اصل مقصود قرآن کریم پر عمل کرنا ہے اور تلاوت اس کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا آپ یہ نہ سمجھیں کہ مذکورہ اجر محض قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے کے لیے ہے خواہ وہ اس پر عمل نہ بھی کرے۔ بلکہ یہ اجر اس شخص کے لیے ہے جو قرآن کی تلاوت بھی کرتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ٥ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ٥﴾ (الفاطر: ۲۹ تا ۳۰)

''بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور انھوں نے نماز قائم کی اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا اس میں سے انھوں نے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کیا، وہ ایسی

---

[1] امام احمد نے اسے اپنی مسند میں (۵۰۹/۳۷) (۲۲۸۶۵)، ابوعبید نے فضائل القرآن (۶۸۔۶۹) اور ابوداؤد نے (۸۳۱) سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور یہ حدیث حسن ہے۔ اس کی مکمل تنقید وتخریج مسند میں ہے۔

تجارت کی امید رکھتے ہیں جو کبھی برباد نہ ہوگی۔ تاکہ وہ انھیں ان کے اجر پورے پورے دے اور اپنے فضل سے انھیں زیادہ بھی دے۔ بلاشبہ وہ بے حد بخشنے والا، نہایت قدردان ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے محض یہ کہنے پر اکتفاء نہیں فرمایا۔ یَتۡلُوۡنَ كِتَابَ اللّٰهِ (وہ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں) بلکہ فرمایا ﴿وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً﴾ یعنی تلاوت کے ساتھ ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔

محض ریاکاری، دکھلاوے اور تعریف کروانے کے لیے تلاوت کرنا، قاری کو کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ نہ ہی روزی کمانے کے لیے تلاوت کا کوئی فائدہ ہے۔ جیسا کہ بعض قراء محفلوں میں تلاوت کرنے کی مزدوری لیتے ہیں اور تلاوت کو بطور پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن پر عمل کرنے میں سب سے پیچھے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے بعض تو نماز بھی نہیں پڑھتے۔ محض وہ اچھے قاری اور اچھی آواز والے ہوتے ہیں۔ قرآن کو ایک پیشہ بنا لیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے لیے یہ شدید ترین وعید ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے: ﴿لَا يَتَجَاوَزُ الۡقُرۡاٰنُ تَرَاقِيَهُمۡ﴾ ''جن کا قرآن گلے سے نیچے نہیں اترتا۔'' یعنی وہ زبان سے اپنے مقاصد کے لیے قرآن پڑھتے تو ہیں لیکن وہ ان کے دلوں تک نہیں پہنچتا۔ (اللہ کی پناہ) ایسے ہی کچھ لوگ قرآن کی تلاوت بڑے پختہ انداز میں کرتے ہیں اور اس کے الفاظ کو تیر کی طرح سیدھا کر کے پڑھتے ہیں۔ لیکن وہ نہ تو معانی کو سمجھتے ہیں، نہ کتاب اللہ میں غور کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی تفسیر سیکھتے ہیں۔ تاکہ وہ اس پر عمل کر سکیں۔ بلکہ محض الفاظ کو ادا کرتے ہیں۔ معانی کو یا تو سمجھتے ہی نہیں یا قرآن کریم سے خوارج کی طرح غلط استدلال کرتے ہیں۔ خوارج اگرچہ سب سے زیادہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں لیکن وہ دین سے اس طرح نکل جاتے ہیں جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ کیونکہ وہ نہ تو قرآن کریم میں غور کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے معانی کو مطلوبہ انداز سے سیکھتے ہیں۔ لہٰذا قرآن ان کے گلوں سے نیچے نہیں اترتا۔ چنانچہ اس ضمن میں چند باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

۱......تلاوت کرنا اور اس پر غور کرنا۔

۲......اللہ تعالیٰ کے کلام کے معانی، تفسیر اور اللہ کی مراد کو سمجھنا۔

۳......قرآن پر عمل کرنا اور یہی اصل مقصود ہے۔ جبکہ تلاوت کرنا اور معانی کو سمجھنا اس مقصد تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔ اصل مقصود تو قرآن کریم پر اللہ کی مراد کے مطابق عمل کرنا اور اس کی باتوں پر یقین رکھنا ہے۔

کچھ لوگ قرآن کی بہت اچھی تلاوت کرتے ہیں لیکن اس کے مدلولات کے برعکس عقیدہ رکھتے ہیں۔ مثلاً جہمیہ، معتزلہ، اشاعرہ۔ یہ کہتے ہیں: ''قرآن محض ظاہری الفاظ کا نام ہے۔ جبکہ ہم اپنے عقیدے کی بنیاد یقینی منطقی قواعد پر رکھتے ہیں۔''

تو ایسے لوگ اہل قرآن کے زمرے میں نہیں آتے خواہ انہیں قرآن کریم بہت یاد ہو۔ کیونکہ وہ اپنے عقیدے کی بنیاد قرآن پر رکھنے کی بجائے علم کلام پر رکھتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا قرآن سے کیا واسطہ؟

محض تلاوت اور خوش الحانی مطلوب نہیں۔ بلکہ ایسی تلاوت تو قیامت کے دن ان کے خلاف دلیل بن جائے گی۔ جیسا کہ رحمت کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((وَالْقُرْاٰنَ حُجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْكَ . " [1]

''اور قرآن تیرے حق میں دلیل بن جائے گا یا تیرے خلاف۔''

آپ کے حق میں دلیل تب بنے گا جب آپ اس پر عمل کریں گے۔ اور آپ کے خلاف دلیل تب بنے جب آپ نے اس پر عمل نہ کیا ہوگا۔ آپ نے اپنے عقیدہ، نماز، روزہ اور حج کے معاملات میں اس پر عمل نہ کیا ہوگا۔ آپ نے حرام کاموں سے بچنے میں اور فرائض کی ادائیگی میں اس پر عمل نہ کیا ہوگا۔

ہاں! البتہ ہر ایک پر اس کی قدرت اور استطاعت کے مطابق یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا کوئی گناہ نہ ہو لیکن کتاب اللہ کی طرف توجہ کرنا اور اس

[1] مسند احمد: ۳۷/ ۵۳۵۔ ۵۳٦ وصحیح مسلم: ۲۲۳۔ والترمذی: ۳۵۱۷.

کا اہتمام کرنا واجب ہے۔ قرآن کو گنگنا کر خوبصورت آواز میں پڑھنا اور سامعین کو مسحور کرنا مقصود نہیں۔ مطلوب تو عمل، خشیت اور خوف الٰہی ہے۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ (الانفال : ۲)

"(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جائیں تو انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں۔ اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔"

ایک بندۂ مومن جب تلاوت سنتا ہے تو اس کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ خوف الٰہی سے رو پڑتا ہے اور قرآن اس پر اثر کرتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ

((إِذَا قَرَأَ الْقُرْآنَ فِي الصَّلَاةِ يُسْمَعُ لِصَدْرِهِ أَزِيْزٌ كَأَزِيْزِ الْمِرْجَلِ مِنَ الْبُكَاءِ .))

"جب قرآن پڑھتے تو آپ کے سینہ اطہر سے رونے کی وجہ سے ہنڈیا کے ابلنے کی طرح آواز سنائی دیتی تھی۔"[1]

جب رسول اکرم ﷺ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سورۃ نساء کی قراءت سنی اور وہ درج ذیل آیت تک پہنچے۔

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ (النساء: ٤١)

"پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور تجھے ان لوگوں پر گواہ لائیں گے۔"

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] اسے امام احمدؒ نے اپنی مسند میں (۲۶/۲۳۸) (۱۶۳۱۲) اور ابوداؤد نے عبد اللہ بن شخیر سے بیان کیا ہے (۹۰۴)۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور امام مسلم رحمہ اللہ کی شرط پر ہے۔

((حَسْبُكَ)) ......''یعنی ٹھہر جا۔''

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ❶

اہل ایمان جب قرآن کو سنتے ہیں تو یہ ان کے دلوں پر اسی طرح اثر کرتا ہے اور جب وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں تو ان میں خوف اور خشیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ رو پڑتے ہیں اور قرآن ان میں عمل صالح اور نیک سیرت پیدا کر دیتا ہے۔

محض تلاوت، حسن قرأت اور قراءات سبع وعشرہ کو پڑھ لینا مطلوب نہیں۔ یہ مطلوب نہیں کہ انسان اسے سات قراءات میں پڑھتا ہے یا دس قراءات میں۔ بلکہ اصل مطلوب قرآن پر عمل کرنا ہے۔ یہی نزول قرآن کا مقصد ہے۔ جبکہ قراءات سیکھنا اور عمدہ تلاوت کرنا اس مقصد تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ وَّ عُمَرُ رضی اللہ عنہما "إِعْرَابُ الْقُرْاٰنِ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِنْ حِفْظِ بَعْضِ حُرُوْفِهٖ." (۱) وَقَالَ عَلِيٌّ رضی اللہ عنہ "مَنْ كَفَرَ بِحَرْفٍ مِّنْهُ فَقَدْ كَفَرَ بِهٖ كُلِّهٖ." (۲) وَاتَّفَقَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلَى عَدَدِ سُوَرِ الْقُرْآنِ وَآيَاتِهٖ وَكَلِمَاتِهٖ وَحُرُوْفِهٖ. (۳)

ترجمہ......: سادا تنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''قرآن کو اچھی طرح پڑھنا ہمیں اس کے بعض الفاظ کو یاد کرنے سے زیادہ پسند ہے۔'' امیر المومنین جناب علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: ''جس نے اس کے ایک حرف کا انکار کیا گویا اس نے پورے قرآن کا انکار کیا۔'' قرآن کریم کی سورتوں، آیات اور کلمات وحروف کو شمار کرنے (ان کی گنتی) پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

تشریح......: (۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کو اچھی طرح یاد کرنا اور اس میں غلطی سے

❶ اسے امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں (۹۴/۲) (۳۶۰۶)، بخاری نے (۴۵۸۲)، مسلم (۸۰۰)، ابوداؤد (۳۶۶۸) اور ترمذی رحمہم اللہ جمیعاً (۳۰۲۵) نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔

محفوظ رہنا، زیادہ یاد کر کے غلطیاں کرنے سے بہتر ہے۔ لہٰذا تھوڑے قرآن کو حفظ کرنا، اس کو اچھی طرح یاد کرنا اور درست طور پر پڑھنا زیادہ قراءت کرنے سے بہتر ہے اس بات سے کہ آپ اس کو مطلوبہ انداز میں نہ پڑھتے ہوں۔

(۲)...... جب ایک حرف کا انکار کفر ہے تو ایک آیت، ایک سورت یا قرآن کی چند سورتوں کا انکار کرنے والا اس سے بڑا کافر ہے۔ کیونکہ اس نے کلام اللہ کا انکار کیا ہے۔

اسی مناسبت سے یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ بعض لوگ ''طٰہٰ''، ''یٰس'' کو رسول اللہ ﷺ کے نام سمجھتے ہیں۔ اسی بناء پر اپنے بچوں کے نام طٰہٰ اور یٰسین رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے نام نہیں ہیں۔ بلکہ یہ تو حروف مقطعات ہیں۔

(۳)...... بلاشبہ قرآن کریم کی آیات، سورتوں اور حروف کی تعداد معروف ہے۔ جو اس بارے میں جاننا چاہے وہ علوم القرآن کی کتابوں کی طرف رجوع کرے جنہیں اصول تفسیر کا نام دیا جاتا ہے۔ مثلاً امام سیوطیؒ کی کتاب ''الإتـقـان'' اور اس جیسی دیگر کتب اُصولِ تفسیر۔

❀❀❀❀❀

وَلَا خِلَافٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ فِيْ أَنَّ مَنْ جَحَدَ مِنَ الْقُرْاٰنِ سُوْرَةً، أَوْ اٰيَةً، أَوْ كَلِمَةً، أَوْ حَرْفًا، مُتَّفَقًا عَلَيْهِ أَنَّهُ كَافِرٌ، وَفِيْ هٰذَا حُجَّةٌ قَاطِعَةٌ عَلَى أَنَّهُ حُرُوْفٌ. (۱)

ترجمہ......: مسلمانوں کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے قرآن کی کسی سورت، آیت، لفظ یا کسی حرف تک کا انکار کیا تو وہ کافر ہے۔ یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ قرآن مجید (مجموعۂ) حروف ہے۔

تشریح......: (۱) جو پورے قرآن کا انکار کرے یا اس کی ایک آیت کا یا ایک حرف کا اس کے کفر پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس حرف (قراءت) کی صحت پر اتفاق ہو۔

❀❀❀❀❀

فصل چہارم:

آخرت میں دیدارِ الٰہی کا اثبات

کلام اللہ یعنی قرآن مجید پر گفتگو کرنے کے بعد مؤلف رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کی ایک اور عظم صفت کے بارے میں گفتگو شروع کرر ہے ہیں۔ اور وہ ہے مومنین کا روز قیامت دیدار الٰہی سے مشرف ہونا۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات تواتر کے ساتھ منقول ہے اور قرآن کریم بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ○﴾ (القیامہ: ۲۲ تا ۲۳)

"اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے۔"

اس آیت مبارکہ میں پہلا "نَاضِرَةٌ" ضاد کے ساتھ ہے۔ یہ "نضرۃ" سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنی ہے خوشی۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ قیامت کے دن اہل ایمان کے چہرے پررونق اور پُرنور ہوں گے۔

دوسرا "نَاظِرَةٌ" ظا (ظ) کے ساتھ ہے۔ یہ "نظر" سے ماخوذ ہے۔ یہ کبھی "إلی" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ اور جب "إلی" کے ساتھ متعدی ہو تو اس کا معنی "آنکھوں سے دیکھنا" ہوتا ہے۔ چنانچہ "إلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" کا معنی یہ ہے کہ خوش رو اہل ایمان قیامت کے دن اپنے رب کو اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھیں گے جس سے ان کے حسن، خوبصورتی اور نورانیت میں اضافہ ہو جائے گا۔ ان کی خوشی اور لطف دو چند ہو جائیں گے۔

اور جب "نظر" کو بذات خود متعدی کیا جائے۔ تو اس کا معنی انتظار کرنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ (الحدید: ۱۳)

"ہمارا انتظار کرو کہ ہم تمھاری روشنی سے کچھ روشنی حاصل کرلیں۔"

اس کا معنی یہ ہے کہ قیامت کے دن منافقین اہل ایمان سے کہیں گے: ہمارا انتظار کرو تاکہ ہم بھی تمہارے نور کا کچھ حصہ حاصل کر لیں۔ کیونکہ اہل ایمان کو تو نور دیا جائے گا، جو ان کے دائیں جانب اور ان کے آگے آگے چل رہا ہوگا۔ جبکہ منافقین کو پہلے تو نور دیا جائے گا لیکن پھر ان کا نور بجھ جائے گا۔ وہ اندھیرے میں بھٹک جائیں گے، انہیں چلنے کا حکم دیا جائے گا تو وہ مومنین سے کہیں گے۔

((اُنْظُرُوْنَا))

یعنی ہمارا انتظار کرو تاکہ ہم بھی تمہارے نور کا کچھ حصہ حاصل کر لیں۔ کیونکہ وہ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں گھر جائیں گے اور انہیں راستہ سجھائی نہیں دے گا۔ وہ جان ہی نہیں سکیں گے کہ کدھر جائیں۔

﴿قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآئَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ٥﴾

(الحدید: ۱۳)

''کہا جائے گا: اپنے پیچھے لوٹ جاؤ، پس کچھ روشنی تلاش کرو۔ پھر ان کے درمیان ایک دیوار بنا دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اس کی اندرونی جانب، اس میں رحمت ہوگی اور اس کی بیرونی جانب، اس کی طرف عذاب ہوگا۔''

﴿يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ٥﴾ (الحدید: ۱٤)

''وہ انھیں آواز دیں گے: کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں؟ لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنے میں ڈالا اور تم انتظار کرتے رہے۔ تم نے شک کیا اور (جھوٹی) آرزوؤں نے تمھیں دھوکا دیا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا اور اس دغاباز نے تمھیں اللہ کے بارے میں دھوکا دیا۔''

چونکہ وہ دنیا میں مومنین کے ساتھ مل کر نمازیں پڑھتے اور جہاد کرتے تھے لیکن وہ ایماندار نہیں تھے۔ بلکہ منافقت کے ساتھ یہ کام کرتے تھے۔ اس لیے قیامت کے دن انہیں نور بھی محض وقتی طور پر دیا جائے گا۔ یہ ان کے ساتھ مذاق ہوگا۔ جیسے وہ دنیا میں اللہ کے ساتھ دھوکہ کرتے تھے اللہ بھی قیامت کے دن ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گے۔ کہ انہیں پہلے تو نور دے دیں گے لیکن پھر ان سے چھین لیں گے تاکہ ان کی حسرت اور افسوس میں اضافہ ہو۔

دلیل ......: اس بحث سے اصل مقصود یہ ہے کہ جب لفظ "نظر" کو بذات خود متعدی بنایا جائے تو اس کا معنی "انتظار" ہوتا ہے۔ جیسے آیت "أُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُوْرِكُمْ" میں ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ٥﴾ (البقرہ: ۲۱۰)

"وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ بادل کے سائبانوں میں آجائے اور فرشتے بھی۔ اور کام تمام کر دیا جائے اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔"

یعنی یہ لوگ صرف قیامت کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور جب لفظ "نظر" کو "فی" کے ساتھ متعدی بنایا جائے تو اس کا معنی "غور و فکر کرنا" اور "عبرت پکڑنا" ہوتا ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (یونس: ۱۰۱)

"کہہ تم دیکھو آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ موجود ہے۔"

اور دوسرے مقام پر ہے:

﴿اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (الاعراف: ۱۸۵)

''اور کیا انھوں نے نگاہ نہیں کی آسمانوں اور زمین کی عظیم الشان سلطنت میں۔''

(یعنی اُنہوں نے کیا غور وفکر نہیں کیا؟)

یعنی اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور وفکر سے کام نہیں لیا؟

خلاصۂ بحث:

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ''نظر'' کو بذات خود متعدی کیا جائے تو اس کا معنی توقف و انتظار ہوتا ہے۔ جب ''الی'' کے ساتھ متعدی کیا جائے تو اس کا معنی آنکھوں کے ساتھ دیکھنا ہوتا ہے۔ اور جب ''فی'' کے ساتھ متعدی کیا جائے تو اس کا معنی غور وفکر کرنا ہوتا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَالْمُؤْمِنُوْنَ يَرَوْنَ اللّٰهَ تَعَالَى بِأَبْصَارِهِمْ. (۱)

ترجمہ......: اور اہل ایمان اپنی آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔

تشریح......: (۱) مؤلف رحمہ اللہ نے ''بأبصارھم'' کا لفظ بول کر ان لوگوں کا رد کر دیا ہے جو کہتے ہیں دیدار الٰہی سے مراد یہ ہے: اپنے دل کی آنکھ سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ یا وہ اس کی نعمتوں کو دیکھیں گے یا اس کی جنت کو دیکھیں گے۔ حالانکہ یہ کلام اللہ کی تحریف ہے۔ ایسی تاویلات باطل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں کے ساتھ حقیقی طور پر دیکھیں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں یہ اعزاز بخشے گا کہ ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ دنیا میں اس کی عبادت کرتے رہے لیکن اسے دیکھ نہ سکے۔ محض اس کی کائنات اور قرآن میں موجود نشانیوں اور دلائل کو دیکھ کر ایمان لائے اور ایمان و تصدیق کے ساتھ اس کی عبادت کرتے رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انہیں اس کا یہ بدلہ دیں گے کہ انہیں اپنا جلوہ دکھائیں گے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو واضح طور پر اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ بلکہ محض اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی نشانیوں میں

غور وفکر کر کے اس کی بندگی کرتے رہے۔ اس لیے انہیں اللہ تعالیٰ یہ اعزاز بخشیں گے کہ انہیں اپنا دیدار کروائیں گے۔

لیکن جنہوں نے اللہ کا انکار کیا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انہیں اپنے دیدار سے محروم رکھے گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ۝﴾ (المطففين: ١٥)

''ہرگز نہیں، بے شک وہ اس دن یقیناً اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے۔''

کیونکہ انہوں نے دنیا میں ربّ العالمین کا انکار کیا۔ اس کی اُلوہیت اور اس کے اسماء و صفات کو نہیں مانا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ بطور سزا قیامت کے دن ان سے پردہ میں رہیں گے۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ ۖ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ ۚ﴾ (یونس: ٢٦)

جن لوگوں نے نیکی کی انھیں کے لیے نہایت اچھا بدلہ اور کچھ زیادہ ہے۔ ان کے چہروں کو نہ کوئی سیاہی ڈھانپے گی اور نہ کوئی ذلت۔''

﴿لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا﴾ سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں نے دنیا میں نیک اعمال کیے۔ ان کے لیے ''الحسنیٰ'' ہے۔ اور الحسنیٰ سے مراد جنت ہے۔ اور ''زیادة'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ''زیادة'' سے مراد اللہ تعالیٰ کے چہرے کا دیدار ہے۔ [1]

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ﴾ (ق: ٣٥)

''ان کے لیے جو کچھ وہ چاہیں گے اس میں ہوگا اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔''

---

[1] دیکھئے: مسند احمد (٣١/٢٦٥) (١٨٩٣٥)، مسلم (١٨١)، ترمذی (٣١٠٥)، یہ حدیث صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے۔ اس کے شروع میں یہ الفاظ ہیں "إذا دخل أهلُ الجنةِ الجنةَ ......"

اس آیت مبارکہ میں "مزید" سے مراد اللہ تعالیٰ کے چہرہ کا دیدار ہے۔ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ٥ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ٥﴾ (القیامہ: ۲۲تا۲۳)

''اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے۔اپنے رب کی طرف دیکھنے والے۔''

یہ دیدار الٰہی کے قرآنی دلائل ہیں۔اس بارے میں احادیث بھی تواتر کے ساتھ منقول ہیں۔جیسا کہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے انہیں اپنی کتاب "حادی الأرواح إلی بلاد الأفراح" میں بیان کیا ہے۔

الغرض دیدار الٰہی قرآن کریم سے بھی ثابت ہے اور احادیث میں بھی تواتر سے مروی ہے۔اس کو ماننا اہل سنت والجماعت سلفی اہل حق کا مذہب ہے۔اہل ایمان قیامت کے دن اپنے پروردگار کا دیدار کریں گے اور یہ دیدار دو موقعوں پر ہوگا۔

۱......محشر والے دن قیامت کے لمحات میں۔

۲......جب جنتی جنت میں داخل ہوجائیں گے تو انعام اور عزت افزائی کے طور پر انہیں دیدار الٰہی نصیب ہوگا۔

معتزلہ وغیرہ کا مؤقف:

معتزلہ، ان کے ہم مشرب اور ان کے پروردہ لوگ دیدار باری تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں: چونکہ دیکھا صرف جسم کو ہی جاسکتا ہے اور تمام اجسام ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں لہٰذا اگر ہم اللہ تعالیٰ کی رؤیت (دیدار) کو مانیں گے تو اللہ تعالیٰ کا جسم ہونا ثابت ہوگا۔اجسام سب ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کا تمام صفات کے بارے میں یہی منہج (اصول) ہے اور یہ ایک باطل نظریہ ہے۔لہٰذا ہم کہتے ہیں: اہل ایمان اللہ تعالیٰ کا دیدار تو کریں گے لیکن اس سے وہ لازم نہیں آتا جو تم کہتے ہو (یعنی تشبیہ لازم نہیں آتی) کیونکہ اللہ تعالیٰ کے مشابہ کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

اور حدیث مبارکہ میں ہے:

((إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ لَيْلَةَ الْبَدْرِ ، وَكَمَا تَرَوْنَ الشَّمْسَ صَحْوًا لَيْسَ دُوْنَهَا سَحَابٌ ، لَا تُضَامُوْنَ -أَوْ لَا تُضَامُّوْنَ- فِيْ رُؤْيَتِهِ .)) [1]

رسول اللہ ﷺ نے یہ اس وقت فرمایا تھا؛ جب آپ سے سوال کیا گیا: ہم اپنے پروردگار کو کیسے دیکھیں گے؟ جبکہ وہ ایک ہے اور ہم سب ہوں گے۔ تو نبی کریم ﷺ نے انہیں ایسی مخلوقات کی مثال دی جنہیں اکٹھے دیکھتے ہوئے انہیں مشکل پیش نہیں آتی۔

ان میں سے ایک مثال چودہویں رات کے چاند کی ہے جو اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ ہر ایک اسے دیکھتا ہے اور جب لوگ اسے دیکھنا چاہتے ہیں تو انہیں مشکل بھی پیش نہیں آتی۔

اسی طرح سورج کو ہر کوئی اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر ہی دیکھ لیتا ہے اور انہیں آپس میں مزاحمت بھی نہیں کرنا پڑتی۔ جب مخلوق کا یہ حال ہے تو اللہ تعالیٰ تو بہت عظیم اور جلیل دکھائی دے گا اور بھیڑ بھی نہیں ہوگی۔

اس حدیث میں ایک رؤیت کو دوسری رؤیت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رؤیت کو شمس وقمر کی رؤیت کے ساتھ۔ نہ کہ مرئی (جس کو دیکھا جائے گا) کی تشبیہ مرئی کے ساتھ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نہ تو سورج کے مشابہ ہے، نہ چاند کے۔ اور نہ ہی اپنی مخلوق میں سے کسی اور چیز کے۔

منکرین رؤیت کی دلیل:

منکرین دیدار الٰہی درج ذیل آیت کو دلیل بناتے ہیں:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾ (الانعام: ۱۰۳) ''اسے نگاہیں نہیں پاتیں۔''

جواب......: ہم کہتے ہیں: تمہاری یہ بات باطل ہے۔ کیونکہ آیت مبارکہ میں رؤیت (دیدار) کی نفی نہیں بلکہ ادراک کی نفی ہے۔ ہر دکھائی دینے والی چیز کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا

---

[1] اسے احمدؒ نے اسی طرح اپنی مسند میں (۵۲۶/۳۱) (۱۹۱۹۰)، بخاریؒ نے (۵۵۴) اور مسلم رحمہم اللہ جمیعاً نے (۶۳۳) حضرت جریر بن عبداللہ سے بیان کیا ہے۔

آپ اللہ تعالیٰ کو دیکھ تو سکیں گے لیکن اس کا ادراک یعنی احاطہ نہیں کر سکتے۔

دوسری دلیل:

وہ اس بات کو نفی دیدار کی دلیل بناتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا "لَنْ تَرَانِیْ"، یعنی تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ﴾ (الاعراف: ۱۴۳)

"تو اس نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا کہ میں تجھے دیکھوں، فرمایا: تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔"

جواب......: ہم کہتے ہیں یہ دنیا میں دیدار الٰہی کی نفی ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دعا کی تھی کہ وہ دنیا میں اسے اپنا دیدار کروائے لیکن دنیا میں کوئی اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتا۔

نیز جب "لن" کے ساتھ نفی ہو تو یہ ہمیشہ کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ کچھ وقت تک کے لیے ہوتی ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہود کو یہ فرمانا ہے۔

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ٥ وَ لَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ٥﴾ (البقرہ: ۹۴ تا ۹۵)

"کہہ دے! اگر آخرت کا گھر اللہ کے ہاں سب لوگوں کو چھوڑ کر خاص تمھارے ہی لیے ہے تو موت کی آرزو کرو، اگر تم سچے ہو۔ اور وہ ہرگز اس کی آرزو کبھی نہیں کریں گے۔ اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔"

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کی دنیا میں موت کی تمنا کی نفی کی ہے۔ لیکن آخرت میں وہ موت کی تمنا کریں گے اور کہیں گے:

﴿یٰمٰلِكُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّكَ﴾ (الزخرف: ۷۷)

''اے مالک! تیرا رب ہمارا کام تمام ہی کردے۔''

یعنی وہ آگ سے نجات حاصل کرنے کے لیے موت کی تمنا کریں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دنیا کی حالت یہ بیان کی ہے کہ:

﴿وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا﴾

''وہ اس (موت) کی ہرگز تمنا نہیں کریں گے۔''

لٰہذا یہ دلیل ہے کہ ''لن'' ہمیشہ کی نفی کرنے کے لیے نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے ''لن ترانی'' کہا ہے: ''لَا تَرَانِیْ'' نہیں کہا۔ کیونکہ دنیا میں لوگوں کے اجسام کمزور ہوتے ہیں اور وہ رؤیت باری تعالیٰ کے متحمل نہیں ہوتے۔ جبکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اپنے دیدار کی قوت بخشے گا۔ دنیا کے تمام معاملات آخرت کے معاملات سے یکسر مختلف ہیں۔

نقطۂ لطیفہ:

یہاں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ بعض شارحین کہتے ہیں: دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار محال ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے کیونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار محال نہیں بلکہ ممکن ہے۔ البتہ لوگوں میں اس کی طاقت نہیں۔ اسی لیے تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دیدار کی درخواست کی۔ اگر دنیا میں دیدار الٰہی ممکن نہ ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کے لیے مناسب نہ تھا کہ وہ ایک محال چیز کا سوال کریں۔ لہٰذا دنیا میں رؤیت باری تعالیٰ محال نہیں۔ ذاتی طور پر رؤیت تو ممکن ہے۔ البتہ لوگوں کے حواس اس زندگی میں کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے لیے ناممکن ہے۔

❀❀❀❀❀

وَيَزُوْرُوْنَهُ (١) وَيُكَلِّمُهُمْ وَيُكَلِّمُوْنَهُ (٢) قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ (القيامه: ٢٢ تا ٢٣) (٣)

ترجمہ......: اور (اہل ایمان آخرت میں) اللہ تعالیٰ کی زیارت کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے باتیں کرے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ (القیامہ : ۲۲ تا ۲۳)

''اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے۔''

تشریح......: (۱) اس بات کی تائید جناب ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ: اہل جنت جمعہ کے دن یا دنیاوی جمعہ کے دن کی مقدار کے برابر اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ اُس دن اللہ تعالیٰ ان کے سامنے جلوہ افروز ہوں گے۔ اسی لیے اُس دن کو ''یوم المزید'' کا نام دیا جائے گا۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ [1]

(۲)...... اللہ تعالیٰ انہیں سلام کہیں گے اور وہ اللہ تعالیٰ کے سلام کا جواب دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے ہم کلام ہوں گے اور وہ اللہ تعالیٰ سے باتیں کریں گے۔ لہٰذا حدیث میں آتا ہے:

((مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا سَيُكَلِّمُهُ رَبُّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ، لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ تُرْجُمَانٌ .))

''تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس طرح گفتگو کرے گا کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔''

(۳)...... ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝﴾ نَاضِرَةٌ ماخوذ ہے نضرۃ سے۔ جس کا معنی ہے حسن اور تروتازگی۔

﴿اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ یعنی اپنے رب کو بالکل واضح طور پر دیکھ سکیں گے اور یہ دیدار ان کی عزت افزائی کے طور پر ہوگا۔

معطلہ کا نظریہ

معطلہ کہتے ہیں: ''إِلٰى رَبِّهَا'' میں ''إِلٰى'' مفرد ہے۔ اس کی جمع ''آلاء'' آتی ہے اور اس

[1] اسے ترمذیؒ نے (۲۵۴۹) اور ابن ماجہ رحمہم اللہ (۴۳۳۶) نے بیان کیا ہے۔ دیکھئے: تفسیر طبری (۱۱/۴۳۰) (۳۱۹۳۸)، تفسیر ابن کثیر (۷/۴۰۷)، زیر آیت سورۃ ''ق'' آیت نمبر ۳۵۔ ان دونوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے اہل جنت کو جمعہ کے دن دیدار کروانے کا ذکر ہے۔

کا معنی ہے نعمت۔ لہٰذا ''إلـی ربھـا'' کا معنی ہے اپنے رب کی نعمت کو دیکھیں گے۔ اس سے ان کی مراد وہ ''آلاء'' ہے جو درج ذیل آیت میں بیان ہوا ہے:

﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ (الرحمن: ۱۳)

''تو (اے جن وانس!) تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟''

حالانکہ گزشتہ آیت میں وارد ''الـــی'' حرف جر ہے۔ وہ نہ تو مفرد ہے اور نہ ہی اس کی جمع ''آلاء'' آتی ہے۔ انہیں ان کے اپنے مذہب کے لیے تعصب نے اس پر مجبور کیا اور یہ کلام اللہ میں کھلی تحریف ہے۔

وَقَالَ تَعَالٰي ﴿كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُوْنَ﴾ (المطففین: ۱۵)

(۱) فَلَمَّا حُجِبَ أُولَـٰئِكَ فِيْ حَالِ السَّخَطِ (۲) دَلَّ عَلَى أَنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ يَرَوْنَهُ فِيْ حَالِ الرِّضَا، وَإِلَّا لَمْ يَكُنْ بَيْنَهُمَا فَرْقٌ. (۳)

ترجمہ......: اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وہ اس دن اپنے رب کے (دیدار سے) پردے میں کردیئے جائیں گے۔ ان (کافروں) سے اللہ تعالیٰ کے بحالت ناراضگی اپنے دیدار سے محروم کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بحالت رضا اہل ایمان کو دیدار ہوگا۔ ورنہ تو کفار اور اہل ایمان کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

تشریح......: جب اللہ تعالیٰ کفار کو قیامت کے دن اپنے دیدار سے محروم رکھیں گے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مومنین اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے اور دیدار الٰہی سے صرف کفار کو ذلیل کرنے کے لیے محروم رکھا جائے گا۔ کیونکہ انہوں نے دنیا میں اس کا انکار کیا۔ لہٰذا ان کی یہی سزا ہوگی کہ انہیں دیدار الٰہی سے محروم رکھا جائے گا۔ اہل ایمان کو دیدار کے ساتھ عزت بخشی جائے گی اور اللہ تعالیٰ انعام کے طور پر اپنے دیدار سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی کریں گے۔

(۲)...... یہ استدلال کا ایک انداز ہے۔

(۳)...... لہٰذا امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو اپنے دیدار

سے محروم رکھیں گے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے دوست اس کا دیدار کریں گے۔ ورنہ اگر مومنوں اور کفار سب کو محروم رکھا گیا تو ان میں فرق کیا رہ جائے گا؟''

❀❀❀❀❀

وَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ ((إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ هٰذَا الْقَمَرَ لَا تُضَامُّوْنَ فِیْ رُؤْیَتِهِ .)) ❶ (١) حديث صحيح متفق عليه.

ترجمہ......: اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بے شک تم (قیامت کے دن) اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح تم اس چاند کو دیکھتے ہو۔ اس کے دیدار میں کوئی چیز حائل نہیں ہوگی۔ یہ صحیح اور متفق علیہ حدیث ہے۔

تشریح......: (١) لَا تَضَامُّوْنَ کا معنی یہ ہے کہ تم ایک ہی جگہ پر اس طرح اکٹھے نہیں ہوگے جس طرح لوگ کسی ایک چیز کو دیکھنے کے لیے جمع ہوتے ہیں اور اس سے بھیڑ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے زیادہ واضح ہوگا۔ لہٰذا لوگوں کو اس کے دیدار کے لیے جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بلکہ ہر کوئی اپنی جگہ پر رہتے ہوئے بھی اس کو دیکھ لے گا۔

❀❀❀❀❀

وَهٰذَا تَشْبِیْهٌ لِلرُّؤْیَةِ بِالرُّؤْیَةِ (١) لَا لِلْمَرْئِیِّ بِالْمَرْئِیِّ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا شَبِیْهٌ لَهُ وَلَا نَظِیْرٌ. (٢)

ترجمہ......: یہ رؤیت کی رؤیت کے ساتھ تشبیہ ہے نہ کہ مرئی کی مرئی کے ساتھ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے مشابہ اور مثل کوئی نہیں۔

تشریح......: (١) یہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کی تشبیہ شمس وقمر کے دیدار کے ساتھ ہے نہ کہ سورج اور چاند کی تشبیہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ۔

---

❶ اسے بخاریؒ (۵۵۴) اور مسلم (۶۳۳) نے حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے۔ دیکھئے: جامع الأصول (۱۰/ ۵۵۷۔۵۵۸) (۸۱۲۵)۔

(۲)......رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ...... .“ گویا رؤیت کو رؤیت کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

اشاعرہ کا مؤقف:

چونکہ رؤیت ثابت ہے سو، اشاعرہ کو اس کی نفی کا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ لہٰذا انہوں نے معتزلہ کے مذہب سے نکلنا چاہا۔ لیکن ان کی بدبختی کہ انہوں نے یہ کہہ دیا: اللہ تعالیٰ دکھائی تو دے گا لیکن کسی جہت میں نہیں۔ کیونکہ وہ اللہ کے علو کی نفی کرتے ہیں۔

جواب ......: ہم کہتے ہیں یہ باطل کلام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جہت علو میں دکھائی دے گا۔

❁❁❁❁❁

فصل پنجم:

تقدیر پر ایمان لانے کا بیان

وَمِنْ صِفَاتِ اللّٰہ تَعالَی اَنَّہُ الْفَعّالُ لِمَا یُرِیْدُ، لَا یَکُوْنُ شَیْئٌ إِلَّا بِإِرَادَتِہِ.

ترجمہ......: اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ہر کام اس کے ارادہ سے ہوتا ہے۔

تشریح......: (۱) یہاں سے مؤلف رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت (قضاء وقدر) کا بیان شروع کر رہے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر اس چیز کا فیصلہ کر دیا ہے جو ازل سے لے کر ابد تک اس کائنات میں رونما ہوگی۔ اس کی بادشاہی میں وہ کام نہیں ہوسکتا جو وہ نہ چاہے۔ ہر کام اس کی قضاء وقدر، ارادہ ومشیت اور اس کی تخلیق وایجاد کے مطابق ہوتا ہے۔ اور قضاء وقدر پر ایمان لانا ایمان کے چھ ارکان میں سے ایک ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْإِیْمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ، وَمَلَائِکَتِہٖ، وَکُتُبِہٖ، وَرُسُلِہٖ، وَالْیَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ.)) [1]

''ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، یوم آخرت اور اچھی و بری تقدیر پر ایمان لائے۔''

''تُؤْمِنَ بِالْقَدرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ'' یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ قضاء وقدر پر ایمان لانا ایمان کے چھ ارکان اور اصول ایمان میں سے ہے۔ لہٰذا جس نے اس کا انکار کیا۔ اس

---

[1] یہ حضرت عمر بن خطاب کی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جسے احمد نے اپنی سند میں (۱/۳۲۲، ۳۳۳) (۱۹۴)، مسلم (۸)، ابن ماجہ (۶۳) اور ترمذی (۲۶۱۰) نے بیان کیا ہے، دیکھئے ابن رجب کی کتاب جامع العلوم والحکم (۱/۹۳) حدیث نمبر۲۔

نے ایمان کے ایک بہت عظیم رکن اور اصول ایمان میں سے ایک اصول کا انکار کیا۔

قضاء وقدر پر ایمان کے مراتب:

قصاء وقدر پر ایمان کے ۴ مراتب ہیں۔

پہلا مرتبہ......: یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہوگا اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ازل سے متصف ہے اور ابد تک رہے گا۔

دوسرا مرتبہ ......: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تقدیر کو اس لوح محفوظ میں لکھا ہے جس میں قیامت تک ہونے والی ہر چیز درج ہے۔

تیسرا مرتبہ......: اس کائنات میں ہر چیز کا وجود میں آنا، ہلاک ہونا، زندہ رہنا، مرنا، وجود و عدم اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کا ارادہ کرتے ہیں وہ ہوجاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝﴾ (یس : ۸۲)

''اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے۔''

چنانچہ اس کائنات میں کسی کی زندگی اور موت، خیر وشر، صحت ومرض اور آبادی و ویرانی اللہ کی مشیت وارادہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کی حکومت میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں ہوتا۔

چوتھا مرتبہ......: جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اور اسے چاہتا ہے تو وہ اسے پیدا کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کائنات میں ہر چیز اللہ ہی کی پیدا کردہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۝﴾ (الزمر : ٦٢)

''اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ تنہا خالق ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (الصافات: ۹۶)

''حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔''

چنانچہ بندوں کے اعمال بھی اللہ تعالیٰ کی جمیع مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جانتا تھا، اس نے انہیں لکھا، ان کا ارادہ کیا اور چاہا تو انہیں پیدا کر دیا اور جن اوقات میں چاہا انہیں پیدا کر دیا۔ انہیں بندوں کے افعال اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہ انہیں اپنی مرضی، ارادہ اور طاقت سے کرتے ہیں لیکن یہ ایجاد و مخلوق اللہ کی ہیں۔

یہ قضاء وقدر پر ایمان کی بحث کا خلاصہ ہے اور ان چاروں مراتب کا ہونا ضروری ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ط إِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُo﴾ (الحج: ۱۴)

''بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔ بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُo﴾

(البقرہ: ۲۵۳)

''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے اور لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

اور سورۃ بروج میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُo﴾ (البروج: ۱۶)

''کر گزرنے والا ہے جو وہ چاہتا ہے۔''

الغرض وہ کسی چیز کو جب چاہتا پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں۔ کیونکہ وہ ''فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْد'' ہے۔ جبکہ مخلوق بعض اوقات کوئی کام کرنا چاہتی ہے لیکن اس

کے پاس اس کی طاقت نہیں ہوتی۔ اور یہ تمام کائنات کے بارے میں عام ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے وجود میں آئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہی ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلَا يَخْرُجُ شَيْئٌ عَنْ مَشِيْئَتِهِ وَلَيْسَ فِي الْعَالَمِ شَيْئٌ يَخْرُجُ عَنْ تَقْدِيْرِهِ وَلَا يَصْدُرُ إِلَّا بِتَدْبِيْرِهِ وَلَا مَحِيْدَ لِاَحَدٍ عَنِ الْقَدْرِ وَالْمَقْدُوْرِ ، وَلَا يَتَجَاوَزُ مَا خُطَّ فِي اللَّوْحِ الْمَسْطُوْرِ. (۱)

ترجمہ......: اور اس کی مشیت سے کوئی چیز باہر نہیں، کائنات کا ہر ذرہ اس کی تقدیر کے ماتحت اور اس کے حکم سے وجود میں آتا ہے۔ اس کی مقرر کردہ تقدیر سے کسی کو فرار نہیں اور لوح محفوظ میں جو لکھا جا چکا ہے اس سے آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں۔

تشریح......: (۱) ہر مخلوق پر وہ خیر یا شر، بہتری یا بگاڑ، کفر و ایمان، اطاعت و معصیت ضرور واقع ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں لکھ رکھی ہے۔ یہ تو افعال کی بات ہے۔ ان چیزوں کی بھی یہی صورت حال ہے جو ان کے اختیار کے بغیر ان کو پیش آتی ہیں۔ مثلاً بیماری اور صحت، مالداری اور فقر وغیرہ۔ یہ سب حالات انسان کی مشیت اور ارادے کے بغیر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہ صرف اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔

لیکن افعال کو وہ اپنے ارادے، چاہت اور اختیار ہی سے کرتے یا چھوڑتے ہیں وہ ان اُمور کو پسند کرتے ہوں یا انہیں ناپسند کرتے ہوں یہ ان کے اللہ کی مخلوق ہونے سے مانع نہیں۔ کیونکہ ان افعال کو بھی اور انسانوں کی قدرت، مشیت اور ارادہ کو بھی پیدا تو اللہ ہی نے کیا ہے۔

❀❀❀❀❀

عَقِيْدَةُ أَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ فِيْ أَفْعَالِ الْعِبَادِ:

أَرَادَ مَا الْعَالَم فَاعِلُوْهُ (١) وَلَوْ عَصَمَهُمْ لَمَا خَالَفُوْهُ وَلَوْ شَاءَ أَنْ يُطِيْعُوْهُ جَمِيْعًا لَأَطَاعُوْهُ. (٢)

ترجمہ……: ((بندوں کے افعال کے متعلق اہل سنت والجماعت کا عقیدہ)) جو کچھ بھی اہل جہاں کرتے ہیں اس نے اس کا ارادہ کیا ہے۔ اگر وہ ان کو بچاتا تو وہ اس کی مخالفت نہ کر سکتے اور اگر وہ چاہتا کہ تمام لوگ اس کی اطاعت کریں تو وہ ضرور اس کی فرمانبرداری کرتے۔

تشریح……: (۱) دنیا میں لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہی کرتے ہیں۔ کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے ارادے کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ لیکن یہ اصول ارادہ کونیہ کے بارے میں ہے۔ اس ارادے کے تحت خیر وشر، کفر وایمان، اطاعت ومعصیت سب کچھ آ جاتا ہے۔

ارادہ شرعیہ:

ارادہ شرعیہ صرف نیکی کے کاموں کے ساتھ ہی خاص ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرہ: ۱۸۵)

''اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا﴾ (النساء: ۲۷)

''اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی فرمائے اور جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم (سیدھے راستے سے) ہٹ جاؤ، بہت بڑا ہٹ جانا۔''

ارادہ کی قسمیں:

ارادہ کی دو قسمیں ہیں۔ (۱)……ارادہ کونیہ (۲)……ارادہ دینیہ شرعیہ

ارادہ کونیہ:

اس میں خیر و شر، اطاعت و معصیت، کفر و ایمان سبھی چیزیں شامل ہیں۔ ان سب کے وجود میں آنے کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے۔

ارادہ دینیہ شرعیہ:

اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ صرف افعالِ خیر اور اعمال صالحہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کبھی پورا ہوتا ہے کبھی پورا نہیں ہوتا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا کافر کے بارے میں ارادۂ شرعیہ یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو۔ لیکن وہ مسلمان نہ ہو تو گویا اللہ تعالیٰ کا اس کے بارے میں ارادہ دینیہ پورا نہیں ہوا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا تمام لوگوں سے ایمان لانے کا مطالبہ ہے۔ لیکن مومن نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور کافر نے نافرمانی کی۔ چنانچہ ارادہ کونیہ کا پورا ہونا لازمی ہے اور ارادہ دینیہ کبھی پورا ہوتا ہے، کبھی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور رحمت کے مطابق پورا نہیں ہوتا۔

(۲)......اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ﴾

(ھود: ۱۱۸)

''اور اگر تیرا رب چاہتا تو یقیناً سب لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا اور وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے۔''

نیز فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ۝﴾ (الانعام: ۱۳۷)

''اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے اپنی اولاد کو مار ڈالنا ان کے شریکوں نے خوش نما بنا دیا، تاکہ وہ انھیں ہلاک کریں اور تاکہ وہ ان پر ان کا دین خلط

ملط کریں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ پس چھوڑ انھیں اور جو وہ جھوٹ باندھتے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ (السجدہ : ۱۳)

''اور اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے اور لیکن میری طرف سے بات پکی ہو چکی کہ یقیناً میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے ضرور بھروں گا۔''

چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام اہل جہاں ایمان لے آتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کی بنیاد پر اسے لوگوں کے اختیار میں کر دیا ہے۔ لہٰذا مومن تو اپنے ارادہ ومشیت سے ایمان لاتا ہے اور کافر اپنی مرضی اور اختیار سے اس کا انکار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ بندوں کے اختیار میں اس لیے دیا ہے تا کہ اس سے لوگ اس کے راستے میں محنت کریں اور اس کے انعام و انتقام اور رحمت وغضب سے متعلقہ اسماء و صفات کا اظہار ہو۔ اگر تمام لوگ نیک ہوتے تو کوئی جہنمی نہ ہوتا اور اگر تمام لوگ ہی کافر ہو جاتے تو جنت میں کوئی بھی نہ جاتا۔

چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اس نے ایمان و کفر دونوں کی قدرت دی اور لوگوں کی آزمائش اور امتحان کے لیے انہیں کچھ احکامات دیے اور کچھ کاموں سے منع فرمایا تو جو کوئی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گا وہ اپنے افعال اور اس کو اپنے لیے پسند کر کے جنت میں چلا جائے گا۔ اور جو اس کی نافرمانی کرے گا وہ اپنے اعمال اور اختیار سے جہنم میں جائے گا۔

❀❀❀❀❀

خَلَقَ الْخَلَائِقَ وَأَفْعَالَهُمْ (١) وَقَدَّرَ اَرْزَاقَهُمْ وَآجَالَهُمْ (٢) يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ بِرَحْمَتِهِ وَيُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ بِحِكْمَتِهِ. (٣)

ترجمہ......: اس نے مخلوقات اور ان کے افعال کو پیدا فرمایا ہے، ان کا رزق اور اجل مقرر

کردی ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ ہدایت دیتا اور جسے چاہتا ہے اپنی حکمت کے ساتھ گمراہ کرتا ہے۔

تشریح......: (۱) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۝﴾ (الصافات: ۹۶)

''حالانکہ اللہ ہی نے تمھیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔''

نیز فرمایا:

﴿قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الرعد: ۱۶)

''کہہ دے اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔''

(۲)......اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے رزق، ان کے انجام، ان کی تندرستی و بیماری اور موت وحیات کو لکھ دیا ہے۔ ان چیزوں میں مخلوق کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ چیزیں ان کی مرضی کے بغیر انہیں پیش آتی ہیں خواہ وہ اسے چاہیں یا نہ چاہیں۔ بیماری اور موت، خوشی اور غمی وغیرہ سب اللہ تعالیٰ کے فیصلہ اور قدرت کے ساتھ ان پر جاری وطاری ہوتی ہیں۔

(۳)......وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کسی حکمت کی وجہ سے گمراہ کرتا ہے۔ وہ ہدایت صرف اسی کو دیتا ہے جو ہدایت کا مستحق ہو۔ وہ جانتا ہے کہ ہدایت کے لائق اور ہدایت کو قبول کرنے والے کون لوگ ہیں۔ اور جسے اللہ گمراہ کرتا ہے اسے اپنے عدل اور حکمت کی بناء پر گمراہ کرتا ہے۔ کیونکہ وہ زیادہ جانتا ہے کہ کوئی ہدایت کے لائق ہے یا نہیں۔

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ۝﴾ (القصص: ۵۶)

''بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے۔''

نبی مکرم ﷺ اپنے چچا ابوطالب کی ہدایت کے خواہش مند رہے اور جب وہ مرا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ مَا لَمْ أُنْهَ عَنْكَ .)) [1]

''میں ضرور تیرے لیے معافی مانگوں گا جب تک کہ مجھے اس سے منع نہیں کر دیا جاتا۔''

لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس کے لیے استغفار کرنے سے منع فرما دیا:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ۝﴾

(التوبہ : ۱۱۳)

''اس نبی اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، کبھی جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ قرابت دار ہوں، اس کے بعد کہ ان کے لیے صاف ظاہر ہو گیا کہ یقیناً وہ جہنمی ہیں۔''

اور درج ذیل آیت ابوطالب کے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ۝﴾ (القصص : ٥٦)

''بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور وہ ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے۔''

الغرض اللہ تعالیٰ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ہدایت کا مستحق کون ہے۔ چنانچہ وہ اسے اس کی توفیق دے دیتا ہے۔ اور وہی جانتا ہے کہ کون ہدایت کا مستحق نہیں۔ چنانچہ اسے وہ سزا کے طور پر اس سے محروم رکھتا ہے۔

معلوم ہوا کہ ہدایت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

﴿وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۝﴾ (یونس : ٩٩)

[1] مسند احمد (۷۸/۳۹) والبخاری: ۳۸۸٤ ومسلم: ٢٤۔ من حدیث المسیب بن حزن رضی اللہ عنہ.

''اور اگر تیرا رب چاہتا تو یقیناً جو لوگ زمین میں ہیں سب کے سب اکٹھے ایمان لے آتے۔ تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا، یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں؟''

رسول کا کام محض تبلیغ ہے، جبکہ ہدایت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ البتہ رسول بھی اس معنی میں ہدایت دیتا ہے کہ وہ تبلیغ اور رہنمائی کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوحًا مِنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُوْرًا نَهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

''اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے؟ اور لیکن ہم نے اسے ایک ایسی روشنی بنا دیا ہے جس کے ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں۔ اور بلاشبہ تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔''

یعنی آپ راستہ دکھاتے اور راہنمائی کرتے ہیں۔

جہاں تک ہدایت القلوب (دلوں کی ہدایت) اور ہدایت القبول (ماننے کی توفیق) کا تعلق ہے تو یہ صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، رسول کے ہاتھ میں نہیں۔ رسول خواہ کتنا ہی چاہے ہدایت صرف اسی کو ملتی ہے جسے اللہ تعالیٰ چاہے۔

❀❀❀❀❀

قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۲۳) (۱)

ترجمہ......: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے۔ بلکہ ان سے پوچھا جائے گا جو وہ کرتے ہیں۔''

تشریح......: (۱) یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کیونکہ وہ جو کچھ بھی چاہتا ہے کسی حکمت کی بنیاد پر کرتا ہے اور جو کچھ نہیں کرتا

اس میں بھی کوئی حکمت ہوتی ہے۔

حکمت سے مراد:

''چیزوں کو ان کے اصل مقام پر رکھنا۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت اسے ہی دی ہے جو اس کے قابل تھا۔ اور گمراہی میں اسے ہی رکھا ہے جو گمراہی کے قابل تھا۔ جو جنت کے قابل ہے اسے حصول جنت کی اور جو جہنم کے قابل ہے اسے دخول جہنم کی توفیق دیتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی اپنی مخلوق کے بارے میں بہتر جانتا ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کرے۔ اس سے ہدایت اور توفیق مانگے، اپنے عمل اور اپنی ذات پر بھروسہ نہ کرے۔ بلکہ اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردے اور اس بات سے ڈرتا رہے کہ کہیں اسے اللہ گمراہ نہ کردے یا اس کے دل کو ٹیڑھا نہ کردے۔ اسی لیے رسول اکرم ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ، وَطَاعَتِكَ. فَتَقُوْلُ لَهُ عَائِشَةُ: إِنَّكَ تُكْثِرُ أَنْ تَقُوْلَ: يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ؛ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلَى دِيْنِكَ وَطَاعَتِكَ. فَيَقُوْلُ: وَمَا يُؤْمِنِّيْ وَقُلُوْبُ الْعِبَادِ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ، إِذَا شَاءَ أَنْ يُّقَلِّبَ قَلْبَ عَبْدٍ قَلَّبَهُ.))

''اے اللہ! اے دلوں کے پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین اور اطاعت پر جمائے رکھ۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: ''آپ کثرت سے یہ دعا کیوں پڑھتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے جواب دیا: ''جبکہ انسانوں کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ وہ جب کسی بندے کے دل کو پھیرنا چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ تو کون سی چیز مجھے اس دعا سے بے خوف کرے۔''[1]

---

[1] امام احمدؒ نے اسے اپنی مسند میں (۲۳۰/۴۳) (۲۶۱۳۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان فرمایا ہے۔ یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے۔ اس کی مکمل تخریج مسند میں دیکھئے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَ تْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا﴾

(الانعام: ۱۰۹ تا ۱۱۰)

''اور انھوں نے اپنی پختہ قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی کہ بے شک اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو اس پر ضرور ہی ایمان لے آئیں گے۔''

یعنی ایمان تمہارے ہاتھوں میں نہیں بلکہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ آگے فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَ تْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ وَ نُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ٥﴾ (الانعام: ۱۰۹، ۱۱۰)

''اور انھوں نے اپنی پختہ قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی کہ بے شک اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو اس پر ضرور ہی ایمان لے آئیں گے۔ تو کہہ: نشانیاں تو صرف اللہ کے پاس ہیں۔ اور تمھیں کیا چیز معلوم کرواتی ہے کہ بے شک وہ جب آئیں گی تو یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے، جیسے وہ اس پر پہلی بار ایمان نہیں لائے۔ اور انھیں چھوڑ دیں گے، اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں گے۔'' معلوم ہوا کہ ایمان کا معاملہ ایک اللہ عزوجل کے ہاتھ میں ہے۔

❁❁❁❁❁

وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالَي ﴿اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ (القمر: ۴۹) (۱) وَقَالَ تَعَالَي ﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا٥﴾ (الفرقان: ۲) (۲) وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالَي ﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ط﴾ (الحديد: ۲۲) (۳).

ترجمہ......: نیز فرمایا: ''بے شک ہم نے جو بھی چیز ہے، ہم نے اسے ایک اندازے کے

ساتھ پیدا کیا ہے۔'' اور فرمایا: '' پھر اس کا اندازہ مقرر کیا، پورا اندازہ۔'' اور فرمایا: ''کوئی مصیبت نہ زمین پر پہنچتی ہے اور نہ تمھاری جانوں پر مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔''

تشریح......: (۱) ان آیات میں تقدیر کا اثبات ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور تقدیر کے تابع ہیں۔

جب ''كُلَّ شَيْءٍ'' کے الفاظ کہے تو کوئی چیز اس سے خارج نہ رہی۔ ''خَلَقْنٰهُ'' میں تمام مخلوقات آ گئیں اور کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوقات سے خارج نہیں۔

''بِقَدَرٍ'' کا معنی یہ ہے کہ ہر چیز کا اندازہ کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا یہ آیت عام ہے اور اس میں ہر چیز شامل ہے۔

(۲)......اس آیت مبارکہ میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ ہر چیز اللہ کی مخلوق ہے اور تقدیر میں لکھی جا چکی ہے۔ کوئی چیز نئی نہیں بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور تقدیر کے تابع ہے۔

(۳)......اس آیت مبارکہ میں بیان ہوا ہے کہ تمام بیماریاں، موت، تمام بدنی مصیبتیں جو انسانوں کو لاحق ہوتی ہیں یا جو مصیبتیں زمین پر نازل ہوتی ہیں مثلاً قحط، بارشوں کا نہ ہونا، پھلوں کی بیماری اور وہ تمام بیماریاں جو درختوں، پھلوں یا گندم کو لگتی ہیں اور ان کی پیداوار کم کر دیتی ہیں، سب اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور تقدیر کے تحت رونما ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ تمام سمندری حادثات جو اموال کی تباہی کا باعث بنتے ہیں، اللہ کی تقدیر کے تابع ہیں۔ ان تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی حکمت کی بنیاد پر تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ یہ سب حادثات بندوں کے خلافِ شریعت کاموں اور اللہ کی نافرمانیوں کے باعث ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (الروم: ٤١)

''خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہوگیا، اس کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا۔ (اب اللہ تعالیٰ کا پیغمبر مبعوث ہوگا۔) تاکہ وہ انھیں اس کا کچھ مزہ چکھائے جو انھوں نے کیا ہے، تاکہ وہ باز آجائیں۔''

مزید برآں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ یہ تمام مصائب لوح محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور یہ تقدیر کے درجہ کی دلیل ہے یعنی لوح محفوظ میں تقدیروں کے لکھے ہونے کی۔ ''مِنْ قَبْلِ أَنْ نَّبْرَأَهَا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصائب پیدا ہونے اور زمین پر نازل ہونے سے پہلے ہی لوح محفوظ میں لکھے جا چکے ہیں۔

تقدیر کے مراتب:

اس آیت مبارکہ میں قضاء وقدر کے دو مراتب کے اثبات کی دلیل ہے۔

۱......لوح محفوظ میں کتابت کا مرحلہ۔

۲......تخلیق وایجاد کا مرتبہ

اور یہ آیت اس بات کی بھی دلیل ہے کہ جو چیز بھی نئی وجود میں آتی ہے وہ اللہ کی مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ خیر وشر، پسندیدہ اور ناپسندیدہ تمام چیزوں کا خالق ہے۔ جو چیز بھی نئی وجود میں آتی ہے، اللہ تعالیٰ ہی اس کا خالق و مدبر اور موجد ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ تَعَالَي ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ (الانعام: ۱۲۵) (۱)

ترجمہ......: نیز فرمایا: ''تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔''

تشریح......: اس آیت مبارکہ میں ارادۂ کونیہ کا اثبات ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جسے ہدایت اور

قبولِ حق کی توفیق دینا چاہتے ہیں تو اس میں اس کی اہلیت بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں، وہ حق کو قبول کر لیتا ہے، اس پر مطمئن ہو جاتا ہے اور اس کے لیے کشادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ یہ اہلیت اسی کو عطا کرتے ہیں جسے ہدایت کے قابل اور اس کو قبول کرنے والا سمجھتے ہیں۔ اور جسے اللہ تعالیٰ اپنے عدل کی وجہ سے گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ ہدایت کے قابل نہیں ہے، اس میں ہدایت کی قابلیت نہیں رکھتے اور اس کے سینے کو کھولنے کی بجائے تنگ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہدایت کو قبول نہیں کرتا۔

﴿وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

”اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ مشکل سے آسمان میں چڑھ رہا ہے۔“

ایک قراءت میں یوں ہے:

﴿صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرِجًا﴾ [1]

یعنی وہ حق کو قبول نہیں کرتا، اس پر مطمئن نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسا شخص جب حق کو سنتا ہے تو اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے، سمٹ جاتا ہے اور اعراض کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ﴾ (الزمر: ۴۵)

”اور جب اس اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل تنگ پڑ جاتے ہیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ اور جب ان کا ذکر ہوتا ہے جو اس کے سوا ہیں تو اچانک وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔“

---

[1] یہ نافع اور ابوبکر کی قراءت ہے ”حَرِجًا“ را کے کسرہ کے ساتھ۔ ان دونوں نے اسے اسم فاعل بنایا ہے۔ اس کا معنی بھی تنگی ہوتا ہے۔ لفظ کی تبدیلی کی وجہ سے معنی میں تکرار اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔ (الکشف عن وجوہ القراءات، لمکی (۱/ ۴۵۰).

اس قسم کے لوگ باطل پر خوش ہوتے اور حق سے تنگ ہوتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ جان کر ان میں ہدایت کی قابلیت نہیں رکھی کہ وہ ہدایت کے قابل ہی نہیں ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ دانا ہیں، ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہدایت بھی اسی کو دیتے ہیں جو اس کا مستحق اور لائق ہوتا ہے۔ اور گمراہی بھی اسی کو دیتے ہیں جو حق کو قبول نہیں کرتا۔ یہ صورت حال لوگوں میں واضح نظر آتی ہے: بعض لوگ جب حق کی بات، قرآن کریم اور وعظ و نصیحت سنتے ہیں تو ان کا دل تنگ ہوجاتا ہے اور وہ پریشان ہوجاتے ہیں۔ جبکہ بعض لوگ نیکی کرنے اور سننے کا شوق رکھتے ہیں۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہدایت اور گمراہی کے اسباب بندوں کی طرف سے ہی ہوتے ہیں۔ جو حق کو قبول کرتا اور اس کا شوق رکھتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ حق کی توفیق دیتے ہیں اور جو حق اور اہل حق سے نفرت کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اس سے محروم رکھتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ دانا اور حکمت والے ہیں اس لیے نہ تو ہدایت کو نا اہل میں ودیعت کرتے ہیں اور نہ ہی اس شخص کو گمراہ کرتے ہیں جو اس کا مستحق نہ ہو۔ بلکہ ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھتے ہیں اور یہ تقسیم اللہ تعالیٰ کے ارادہ کونیہ کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

﴿كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس کے لیے ایمان لانا اس طرح ناممکن ہوجاتا ہے جیسے آسمان پر چڑھنا۔ انسان آلات کے بغیر بذات خود آسمان پر نہیں چڑھ سکتا۔ وہ اڑ کر آسمان پر نہیں چڑھ سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اڑنے والا نہیں بنایا۔ بلکہ زمین پر رینگنے والا بنایا ہے۔ الغرض اُس شخص پر ایمان لانا اس طرح محال ہوجاتا ہے جس طرح اس کے لیے فضا میں اڑنا ناممکن ہوتا ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝﴾ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے کسی کو گمراہ کرنے کی حکمت بیان کی ہے کہ یہ اُس شخص کے ایمان نہ لانے کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَرَوَى ابْنُ عُمَرَ [عَنْ اَبِيهِ] رضی اللہ عنہما، "أَنَّ جِبْرِيلَ علیہ السلام قَالَ لِلنَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم مَا الْإِيمَانُ؟ قَالَ: أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ. فَقَالَ جِبْرِيلُ: صَدَقْتَ" انفرد مسلم بإخراجه.[1] (۱)

ترجمہ......: جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "یہ کہ تو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، یوم آخرت اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لائے۔" تو جناب جبریل علیہ السلام نے فرمایا: "آپ نے سچ فرمایا۔" اس کو تنہا امام مسلم رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

تشریح......: (۱) مؤلف رحمہ اللہ قضاء و قدر کے دلائل قرآن سے بیان کرنے کے بعد اب حدیث سے اس کے دلائل ذکر کر رہے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے حدیث جبریل ذکر کی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ وہ اپنے باپ جناب عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ سیّدنا جبریل علیہ السلام ایسی شکل میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ شدید سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے بال انتہائی سیاہ تھے۔ ان پر سفر کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ حاضرین مجلس میں سے کوئی انہیں جانتا بھی نہیں تھا۔ یہ بڑا عجیب وغریب قسم کا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ وہ نہ تو اس علاقے کا رہنے والا تھا کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے پہچانتے نہیں تھے اور نہ ہی وہ مسافر تھا کیونکہ اس پر سفر کے آثار بھی نہیں تھے۔ اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تعجب کیا۔ وہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گیا۔

جبریل علیہ السلام اکثر طور پر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے۔ چونکہ انسان فرشتوں کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے اس لیے فرشتے انسانوں کے پاس اپنی اصلی شکل میں نہیں آتے بلکہ وہ انسانی شکل میں آتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں انسانی صورت اختیار کرنے کی صلاحیت بخشی ہوئی ہے۔

---

[1] اس کی تخریج پیچھے گزر چکی ہے۔

الغرض جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے پاس انسانی شکل میں آئے، آپ ﷺ کے سامنے بیٹھ گئے اور اسلام کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے: اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ تو نماز قائم کرے، زکوٰۃ دے، رمضان کے روزے رکھے اور زادِ راہ کی طاقت ہو تو بیت اللہ کا حج کرے۔ جبریل علیہ السلام نے فرمایا: ''آپ نے سچ فرمایا ہے۔''

یہ دوسری تعجب خیز بات تھی کہ وہ کیسا سائل تھا جو خود ہی تصدیق بھی کرتا تھا۔ جبکہ عام طور پر سائل لاعلم ہوتا ہے۔ مگر جبریل کا آپ ﷺ کی تصدیق کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں خود اس کا علم تھا۔ پھر جبریل علیہ السلام نے سوال کیا: ''مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ تو اللہ ربّ العالمین، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، یوم آخرت اور اچھی، بری تقدیر پر ایمان لائے۔''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''آپ نے سچ فرمایا۔''

جبریل علیہ السلام نے اسلام کے بارے میں پوچھا جو کہ ظاہری اعمال کا نام ہے۔ پھر ایمان کے بارے میں سوال کیا جو کہ باطنی اعمال کا نام ہے۔ اسلام اور ایمان دونوں ہی ضروری ہیں۔ چنانچہ دین ظاہری اور باطنی اعمال کا نام ہے۔ دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ نہ تو اسلام ایمان کے بغیر کفایت کرتا ہے اور نہ ہی ایمان کا اسلام کے بغیر کوئی فائدہ ہے۔ بلکہ دونوں ہی ضروری ہیں۔

حدیث میں محل شاہد:

"وَتُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ" کے الفاظ ہیں۔ گویا رسول اللہ ﷺ نے ایمان بالقدر کو ایمان کے چھ ارکان میں سے ایک رکن شمار کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو تقدیر پر ایمان نہیں لاتا اس کا ایمان صحیح نہیں۔ کیونکہ اس نے ارکان ایمان میں سے ایک رکن کو کم کر دیا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ ’’آمَنْتُ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ وَحُلْوِہٖ وَمُرِّہٖ.‘‘ (۱)

ترجمہ……: اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ’’میں اچھی بری، میٹھی اور کڑوی تقدیر پر ایمان لاتا ہوں۔‘‘

تشریح……: (۱) اس حدیث کو مصنف رحمہ اللہ نے نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’آمَنْتُ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ وَحُلْوِہٖ وَمُرِّہٖ.‘‘ [1]

اس حدیث کا درست مفہوم یہ ہے کہ اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لانا ایک ضروری امر ہے۔ تمام پسندیدہ، مرغوب، مفید اور ہر قسم کا شرعی یعنی نقصان دہ اور ناپسندیدہ کام اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر کے تابع ہیں۔ تمام نیکیاں خیر ہیں اور تمام برائیاں شر ہیں۔

’’وَحُلْوِہٖ وَمُرِّہٖ‘‘ سے مراد ہے کہ تقدیر بعض اوقات میٹھی ہوتی ہے۔ یعنی طبیعت کے موافق لذیذ اور خوش کن ہوتی ہے اور کبھی کڑوی ہوتی ہے یعنی طبیعت کے موافق نہیں ہوتی۔ مثلاً مصائب وآلام، غم اور پریشانیاں وغیرہ۔ لیکن یہ بھی تقدیر میں شامل ہیں۔ لہٰذا ان پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ جو شخص تقدیر کے صرف انہی فیصلوں پر ایمان لاتا ہے جو موافق طبیعت ہوں تو وہ گویا محض اپنی شہوت اور خواہشات کا پیروکار ہے۔ ایسا شخص دراصل تقدیر پر ایمان نہیں لاتا بلکہ محض لذت دینے والی چیزوں پر ایمان لاتا ہے۔ جبکہ حقیقی مومن وہ ہے جو اچھی اور بری ہر قسم کی تقدیر پر ایمان لاتا ہے۔

قضاء اور تقدیر پر ایمان لانے والے کا امتیاز یہ ہوتا ہے کہ وہ مصائب پر صبر کرتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور تقدیر کے تحت ہی آتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ﴾ (البقرہ: ۱۵۵)

’’اور یقیناً ہم تمھیں خوف، بھوک، مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی میں سے کسی

---

[1] ذہبی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو سیر اعلام النبلاء میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ (۸/ ۲۸۷)

نہ کسی چیز کے ساتھ ضرور آزمائیں گے۔ اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دے۔''

یہی لوگ صابر ہیں۔

﴿الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ (البقرہ: ۱۵٦)

''وہ لوگ کہ جب انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

یہ لوگ جانتے ہیں کہ مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ اس کا آنا ضروری ہے اور وہی ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔ چنانچہ وہ صبر کرتے ہیں۔ محاسبہ نفس کرتے ہیں اور آہ و بکا اور ناراضگی کا اظہار نہیں کرتے۔ بعض اوقات یہ مصیبت کسی گناہ، غلطی یا حکم الٰہی کی مخالفت کی سزا ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ محاسبہ نفس اور توبہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ (الشوری: ۳۰)

''اور جو بھی تمھیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا اور وہ بہت سی چیزوں سے درگزر کر جاتا ہے۔''

چنانچہ ایک بندۂ مومن آہ و بکا اور ناراضگی کا اظہار کرنے کی بجائے صبر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اسے جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں کی وجہ سے ہی پہنچتی ہے۔ چنانچہ یہ صبر بھی اس کے لیے نیکی بن جاتا ہے اور انجام کار یہ مصیبت بھی کسی بھلائی کا ہی پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ الغرض یہ اسی کے فائدہ میں ہوتی ہے۔ جبکہ تقدیر پر اظہار ناراضگی اور واویلا کرنے والا نہ مصیبت سے بچتا ہے اور نہ ہی اسے اس پر اجر ملتا ہے۔ بلکہ وہ اس واویلے کی وجہ سے گناہگار ہو جاتا ہے۔ (ہم ایسے رویے

سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں)۔

❀❀❀❀❀

وَمِنْ دُعَاءِ النَّبِيِّ ﷺ الَّذِي عَلَّمَهُ الْحَسَنَ بْنَ عَلِيٍّ يَدْعُوْ بِهِ فِيْ قُنُوتِ الْوِتْرِ:

"وَقِنِيْ شَرَّ مَا قَضَيْتَ." [1] (۱)

ترجمہ......: اور نبی کریم ﷺ کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے جو آپ ﷺ نے سیّدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو سکھائی تھی۔ جناب حسن رضی اللہ عنہ اسے قنوتِ وتر میں مانگا کرتے تھے۔

"اور مجھے اس شر سے بچا جس کا تو نے فیصلہ کیا ہے۔"

تشریح......: (۱) نبی اکرم ﷺ نے حضرت حسن بن علی (اپنی بیٹی سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہم کے لختِ جگر) کو وتر کے بعد والے قنوت وتر میں پڑھنے کے لیے یہ دعا سکھلائی۔

((اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ، وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ، وَتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَقِنِيْ شَرَّمَا قَضَيْتَ، إِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ.))

اس حدیث مبارکہ میں "وَقِنِيْ شَرَّمَا قَضَيْتَ" کے الفاظ سے استدلال ہے۔ کیونکہ نبی معظم ﷺ نے شر کی نسبت قضاء وقدر کی طرف کی ہے۔

شر سے مراد:

"وہ ناپسندیدہ حالات جو انسان کو پیش آتے ہیں یا انسان کو جن ناپسندیدہ حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ تقدیر میں لکھے جا چکے ہیں اور ان کا فیصلہ ہو چکا ہے۔"

نبی اکرم ﷺ نے اپنے نواسے سیّدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنے کا حکم دیا کہ وہ اسے اس تکلیف سے بچالے جس کا اس نے فیصلہ کر رکھا ہے۔ اپنی تقدیر کو اس کے لیے بہتر بنا دے۔ اور یہ کہ وہ ان لوگوں کی طرح نہ بن جائے جن کو اللہ کی تقدیر اور فیصلے

[1] ابوداؤد (۱۴۲۵)، ابن ماجه (۱۱۷۸)، ترمذی (۴۶۴)، نسائی (۳/۲۴۸)، (۱۷۴۴)۔ اس کے راوی حسن بن علی رضی اللہ عنہما ہیں اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔

کے تحت کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ واویلا کرنے لگ جاتے اور ناراض ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً گناہ کے حقدار بن جاتے ہیں۔

الغرض وہ یہ دعا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صبر و تحمل عطا کر کے اپنی قضاء و قدر پر راضی رکھ کر بری تقدیر سے بچا۔ یہی ان کے لیے انجام کار بہتر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مومن کے لیے وہی فیصلہ کرتے اور مقدر کرتے ہیں جو اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔

((إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ عَلَيْهَا ، فَكَانَ ذٰلِكَ خَيْرًا ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ عَلَيْهَا ، وَكَانَ ذٰلِكَ خَيْرًا لَهُ ، وَلَيْسَ ذٰلِكَ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ .)) [1]

''اگر اسے خوشی ملتی ہے، وہ اس پر شکر کرتا ہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے اور اگر اسے تکلیف پہنچتی ہے، وہ اس پر صبر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے بہتر ہوتا ہے اور یہ خیر صرف مومن کو ہی نصیب ہوتی ہے۔''

حدیث میں محل شاہد "شرّ ما قضیت" کے الفاظ ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ شر بھی قضاء وقدر میں داخل ہے۔ نیز یہ کہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنا مستحب ہے کہ اے اللہ! مجھے بری قضاء وقدر سے بچا اور تقدیر کو میری گمراہی اور بے صبری کا سبب نہ بنا۔ مجھے اپنی تقدیر پر ناراض ہونے اور اسے ناپسند جاننے سے بچا تا کہ یہ میری بدبختی کی بجائے میری نیک بختی کا سبب بنے۔

❁❁❁❁❁

وَلَا نَجْعَلُ قَضَاءَ اللّٰهِ وَقَدْرَهُ حُجَّةً لَنَا فِيْ تَرْكِ أَوَامِرِهِ وَاجْتِنَابِ نَوَاهِيْهِ (ا) بَلْ يَجِبُ أَنْ نُؤْمِنَ وَنَعْلَمَ أَنَّ لِلّٰهِ عَلَيْنَا الْحُجَّةَ بِإِنْزَالِ الْكُتُبِ وَبِعْثَةِ الرُّسُلِ.

ترجمہ......: اور ہم اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ترک کرنے اور اس کی نواہی سے بچنے کے بارے

[1] اس معنی کی حدیث مسند احمد میں حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (۲۶۴/۳۱) (۱۸۹۳۴)۔ صحیح مسلم (۲۹۹۹)۔ اور اُس کے شروع میں "عجبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ" کے الفاظ ہیں۔

میں اس کی قضاء وقدر کو اپنے لیے حجت نہیں بناتے۔ بلکہ ہم پر یہ ایمان لانا اور جاننا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتابیں نازل کر کے اور رسول بھیج کر اپنی حجت ہم پر پوری کر دی ہے۔

تشریح ......: (ا) یہ قضاء وقدر سے متعلقہ ایک عظیم مسئلہ ہے کہ جب انسان سے کوئی گناہ یا غلطی سرزد ہو جائے اور وہ یہ کہہ کر کہ: یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور تقدیر ہے، توبہ نہ کرے اور اپنے گناہ کا اعتراف نہ کرے تو یہ جائز نہیں۔ بلکہ مومن پر واجب ہے کہ جب اس سے اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی ہو جائے تو وہ اُس سے توبہ کرے۔ مؤلف رحمہ اللہ کی عبادت مذکور بالا ''اور ہم اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ترک کرنے اور اس کی نواہی سے بچنے کے متعلق اس کی قضاء وقدر کو اپنے لیے حجت نہیں بناتے۔''

چنانچہ قضاء وقدر کو گناہ کے کاموں کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ بلکہ اسے صرف ان مصائب میں دلیل بنایا جا سکتا ہے جن پر انسان کو کوئی اختیار نہ ہو۔ ایسے کاموں کو وہ قضاء وقدر کی طرف منسوب کر کے اس پر صبر کرے۔ لیکن گناہ میں تو انسان کو اختیار ہوتا ہے، اس میں اس کا ارادہ اور قدرت شامل ہوتی ہے، یہ انسان کا اپنا فعل اور کمائی ہوتی ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ گناہ پر خود کو ہی ملامت کرے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی معافی مانگے۔

ہمارے والدین آدم وحوا علیہما السلام نے عرض کیا تھا:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سکتہ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (الاعراف: ۲۳)

''اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے۔''

اور دوسری آیت میں ہے:

﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾ (البقرہ: ۳۷)

''پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے، تو اس نے اس کی توبہ قبول کر

لی۔ یقیناً وہی ہے جو بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

ہمارے والدین نے یہ نہیں کہا: اے ہمارے رب! تیرا فیصلہ اور تقدیر تھی۔ بلکہ فرمایا:

''اے ہمارے رب! ہم نے ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا۔''

گویا انہوں نے غلطی کا اعتراف کیا اور کہا:

''اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحمت نہ کی تو ہم لازماً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''

تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا یہی طریقہ کار رہا ہے کہ جب ان سے کوئی غلطی ہو جاتی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے، اس سے توبہ و استغفار کرتے اور اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کر لیتا۔ لہٰذا عام لوگ تو توبہ کے زیادہ محتاج ہیں۔

الغرض ایک مسلمان اپنے گناہوں اور معصیتوں کو قضاء وقدر کی طرف منسوب نہیں کرتا۔ اگرچہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے قضاء وقدر سے ہوتا ہے لیکن وہ فعل انسان ہی کرتا ہے اور اس کو اس کے اختیار و اجتناب کی پوری طاقت ہے، چاہے تو وہ فعل سرانجام دے چاہے تو نہ دے۔ کیونکہ انسان کو کسی کام پر مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ وہ خود ہی ایک گناہ کرتا ہے۔ اپنی مرضی سے اللہ کی طرف رجوع کرتا اور اس سے بخشش کی درخواست کرتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کی طرف لوٹ آئے اللہ تعالیٰ اس سے درگزر کرتے ہوئے اس کی توبہ قبول کر لیتے ہیں۔

ایک مسلمان کا شیوہ یہی ہونا چاہیے کہ اگر اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو وہ قضاء و قدر کا بہانہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے کر توبہ سے دور نہ رہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ و استغفار کرے۔

❀❀❀❀❀

قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى: ﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ﴾

(النساء: ١٦٥) (١)

ترجمہ......: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تاکہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے

میں کوئی حجت نہ رہ جائے۔"

تشریح.......: (۱) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًاo وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًاo رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًاo﴾

(النساء: ۱٦۳ تا ۱٦۵)

"بلا شبہ ہم نے تیری طرف وحی کی، جیسے ہم نے نوح اور اس کے بعد (دوسرے) نبیوں کی طرف وحی کی۔ اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق و یعقوب اور اس کی اولاد اور عیسیٰ و ایوب اور یونس و ہارون اور سلیمان (علیہم السلام) کی طرف وحی کی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔ اور بہت سے رسولوں کی طرف جنھیں ہم اس سے پہلے تجھ سے بیان کر چکے ہیں۔ اور بہت سے ایسے رسولوں کی طرف جنھیں ہم نے تجھ سے بیان نہیں کیا۔ اور اللہ نے موسیٰ (علیہ السلام) سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔ ایسے رسول جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے۔ تا کہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہ جائے اور اللہ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔"

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کا تذکرہ کرنے کے بعد ان کی بعثت اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بندوں کا عذر باقی نہ رہے۔ جسے دلیل بنا کر وہ یہ کہہ سکیں "اے ہمارے پروردگار! ہمارے پاس کوئی برائیوں سے روکنے والا اور معاصی سے ڈرانے والا نہیں آیا تھا جو ہمارے سامنے خیر و شر اور

ہدایت و گمراہی کو واضح کرتا۔ ہمیں تو ان چیزوں کا علم نہیں تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے، انہیں کتب سماویہ عطا کیں تا کہ وہ لوگوں کے سامنے اطاعت و معصیت، کفر و ایمان اور خیر و شر کا امتیاز واضح کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو بعثتِ رسل اور توضیحِ شریعت سے پہلے عذاب نہیں دیتا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ (الاسراء: ۱۵)

''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا (رسول) بھیجیں۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی بندوں پر حجت ہے۔

﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ﴾

(الاعراف: ٦)

''تو یقیناً ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور یقیناً ہم رسولوں سے (بھی) ضرور پوچھیں گے۔''

﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾ (المائدہ: ۱۰۹)

''جس دن اللہ تعالیٰ رسولوں کو جمع کرے گا، پھر کہے گا تمھیں کیا جواب دیا گیا؟ وہ کہیں گے: ہمیں کچھ علم نہیں، بے شک تو ہی چھپی باتوں کو بہت خوب جاننے والا ہے۔''

الغرض اللہ تعالیٰ نے لوگوں کا عذر ختم کرنے کے لیے رسولوں کو بھیجا تا کہ وہ قیامت کے دن اس بات کو دلیل نہ بنائیں کہ ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آیا تھا۔ اگر قضاء و قدر کو دلیل بنانا درست ہے تو پھر یہ درج ذیل آیت مبارکہ کے مخالف ہے۔

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾

''تا کہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہ جائے۔''

جبکہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے سامنے اپنے اوامر ونواہی کی وضاحت کردی تو لوگوں کے لیے اللہ کے ہاں قضاء وقدر یا کسی بھی دوسری چیز میں کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ بلکہ وہ بذات خود قابل ملامت ہیں۔ کیونکہ انہوں نے حدود سے تجاوز کیا۔ لہٰذا ان کے افعال واعمال پر ان کی پکڑ ہوگی۔ قضا وقدر اللہ کا معاملہ ہے۔ لیکن انسان جانتا ہے کہ اس میں قدرت وطاقت پائی جاتی ہے وہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ خیر وشر اور نفع بخش اور نقصان دہ چیزوں کو پہچانتا ہے۔ جب انسان اپنے اختیار اور علم سے یہ سب کچھ کرتا ہے تو اس کا اللہ کے ہاں کیا عذر باقی رہ جاتا ہے؟

❁❁❁❁❁

وَنَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ مَا اَمَرَ وَ نَهَى إِلَّا الْمُسْتَطِيْعَ لِلْفِعْلِ وَالتَّرْكِ وَأَنَّهُ لَمْ يُجْبِرْ اَحَدًا عَلَى مَعْصِيَةٍ وَلَا اضْطَرَّهُ إِلَي تَرْكِ طَاعَةٍ (١) قَالَ اللّٰه تَعَالَى: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا﴾ (البقره: ٢٨٦) (٢) وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالَى ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ١٦) (٣) وقال تعالي ﴿اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ، لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ﴾ (غافر: ١٧) (٤)

ترجمہ......: اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اوامر ونواہی صرف اسی کو دیے ہیں جو ان کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس نے کسی کو اپنی نافرمانی کرنے یا اطاعت کو ترک کرنے پر مجبور و مضطر نہیں کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا۔'' نیز فرمایا: ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔'' نیز فرمایا: ''آج ہر شخص کو اس کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا، آج کوئی ظلم نہیں۔''

تشریح......: (۱) یہ بھی گذشتہ بات ہی کی مزید تشریح و وضاحت ہے۔ یعنی ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی کو کسی کام کا حکم دیتے یا منع کرتے ہیں جو کرنے اور نہ کرنے دونوں کی قدرت رکھتا ہو۔ کیونکہ اوامر ونواہی کا تعلق ہوتا ہی اس شخص سے ہے جس کے پاس قدرت

اور استطاعت ہو۔

نابالغ بچہ، مجنون، بے عقل، پاگل، یا وہ مجبور شخص جس کے پاس اختیار نہ ہو سب کے سب مرفوع القلم ہیں۔ ان سے کسی کام کا مطالبہ نہیں۔ کیونکہ ان کے پاس قدرت و استطاعت ہی نہیں ہوتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مکلّف بنایا ہے اور نہ ہی ان کا مواخذہ فرمائیں گے۔ مکلّف صرف وہی ہوتا ہے جو عقل منداور طاقت واختیار رکھنے والا ہو۔

(۲)......ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا وَ اغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۝﴾ (البقرہ : ۲۸۶)

’’اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔ اسی کے لیے ہے جو اس نے (نیکی) کمائی اور اسی پر ہے جو اس نے (گناہ) کمایا، اے ہمارے رب! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں۔ اے ہمارے رب! اور ہم پر کوئی بھاری بوجھ نہ ڈال، جیسے تو نے اسے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے تھے۔ اے ہمارے رب! اور ہم سے وہ چیز نہ اٹھوا جس (کے اٹھانے) کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ اور ہم سے درگزر کر اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر۔ تو ہی ہمارا مالک ہے۔ سو، کافر لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔‘‘

(۳)......اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝﴾

(التغابن : ۱۶)

''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو اور سنو اور حکم مانو اور خرچ کرو، تمھارے اپنے لیے بہتر ہوگا۔ اور جو اپنے نفس کے بخل سے بچا لیے جائیں سو وہی کامیاب ہیں۔''

لہٰذا جو شخص کوئی کام کر ہی نہ سکتا ہو اور اسے چھوڑ دے تو اس سے اس بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ بلکہ جو شخص طاقت کے باوجود کوئی کام چھوڑ دے اس کا مواخذہ کیا جائے گا۔

(۴)...... مذکورہ آیت میں ''اَلْیَوْمَ'' سے مراد قیامت کا دن ہے۔

'' تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ '' کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے عمل کی نسبت مکلّف کی طرف کی ہے اور جزاء کا تعلق بھی اسی سے قائم کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ کسی دوسرے کے اعمال کی بناء پر کسی کو عذاب نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کاموں پر کسی کا مواخذہ ہوگا جو بلا ارادہ، جہالت یا مجبوری کی بناء پر اس سے سرزد ہو جائیں۔ بلکہ مواخذہ صرف ان کاموں پر ہوگا جنھیں کوئی شخص اپنے ارادہ واختیار سے کرتا ہے۔

''لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا وجہ کسی کا مواخذہ نہیں فرمائیں گے۔ کیونکہ یہ تو ظلم ہے اور اللہ ظلم سے پاک اور بلند و برتر ہے۔ کسی جرم کے بغیر کسی کا مواخذہ کرنا یا مومنوں کو عذاب اور کافروں کو سزا دینا ظلم ہے۔ کیونکہ کسی چیز کو اس کے غیر مناسب مقام پر رکھنا ظلم ہے۔

سزا و جزا کا تعلق کفر و ایمان اور طاعت و معصیت کے ساتھ ہے جو کہ بندوں کے ارادی اور اختیاری افعال سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی پر ان کا مواخذہ کیا جائے گا اور یہی عدل ہے۔

اگر کسی انسان کا اس کے ناکردہ افعال پر غیر اختیاری، جہالت اور غلطی کی بناء پر کیے گئے کاموں پر مواخذہ کیا جائے تو یہ ظلم ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ پاک ہے۔

﴿وَ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ فِیْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَ لٰکِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُکُمْ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا﴾ (الاحزاب : ۵)

''اور تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جس میں تم نے خطا کی۔ لیکن جو تمھارے دلوں

نے ارادے سے کیا۔ اور اللہ ہمیشہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

اللہ نے اپنے بندوں کے لیے ان کے ارادی گناہوں اور غلطیوں کے باوجود توبہ اور مغفرت کا دروازہ کھلا رکھا ہے اور انہیں مایوس نہیں کیا۔ جو شخص ایمان لائے، اپنے پروردگار سے توبہ و استغفار کرے وہ اسے بخش دے گا اور اس پر رحم کرے گا۔

❁❁❁❁❁

فَدَلَّ عَلَى أَنَّ لِلْعَبْدِ فِعْلاً وَ كَسَباً، يُجْزَى عَلَى حَسنِهِ بِالثَّوابِ وَعَلَى سَيِّئِهِ بِالْعِقَابِ. (۱)

ترجمہ......: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بندے کو کام کرنے اور (نیکی) کمانے کا (پورا اختیار) ہے۔ اس کی نیکیوں کے نتیجے میں اسے اچھا بدلہ اور گناہوں پر سزا ہوگی۔

تشریح......: (۱) یہ آیات مبارکہ اس بات کی دلیل ہیں کہ انسان کے پاس کاموں کا اختیار ہوتا ہے۔ اگر وہ اچھے کام کرے گا تو اس کو ثواب ملے گا اور اگر گناہ کرے گا تو سزا کا مستحق ٹھہرے گا اور یہی عدل ہے۔ کسی چیز کو اس کے لائق مقام دینا، عدل کہلاتا ہے۔ نیکوکار کے لائق ثواب ہوتا ہے اور بدکار کے لیے سزا۔ یہی عدل کا تقاضا ہے۔ اگر اس کے برعکس کیا جائے تو یہ ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک ہے کہ کسی چیز کو اس کے غیر مناسب مقام دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ٥ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ٥﴾

(القلم: ۳۵تا۳۶)

''تو کیا ہم فرماں برداروں کو جرم کرنے والوں کی طرح کردیں گے؟ کیا ہے تمھیں، تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟''

اسی طرح فرمایا:

﴿اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ٥﴾ (ص: ۲۸)

''کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح کر دیں گے؟ یا کیا ہم پرہیز گاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے؟''

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَاءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَاءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝﴾

(الجاثیہ : ۲۱)

''یا وہ لوگ جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا، انھوں نے گمان کر لیا ہے کہ ہم انھیں ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے؟ ان کا جینا اور ان کا مرنا برابر ہو گا؟ برا ہے جو وہ فیصلہ کر رہے ہیں۔''

یہ اللہ کے بارے میں بدظنی ہے کہ وہ اپنے بندوں پر ظلم کرے گا۔ کہ نیکوکاروں کو سزا اور بدکاروں کو جزا دے گا۔

❀❀❀❀❀

وَهُوَ وَاقِعٌ بِقَضَاءِ اللّٰهِ وَقَدْرِهِ. (۱)

ترجمہ......: لیکن یہ سب اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کے تحت واقع ہوتا ہے۔

تشریح......: (۱) اچھائیاں اور برائیاں بندوں کی خود عمل کردہ ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر کے مطابق ہی ہوتی ہیں اور اس کی قضاء وقدر میں داخل ہیں لیکن ہم اس کو قضاء وقدر کا نتیجہ کہہ کر اپنی غلطیوں، جرائم اور برائیوں سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہمارے پاس ان کو کرنے اور نہ کرنے کا مکمل اختیار ہوتا ہے اور ہم اپنی مرضی سے ان کا انتخاب کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم سے اس بارے میں پوچھا جائے گا۔

آپ اللہ کی قضاء وقدر کو دلیل نہ بنائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ قضاء وقدر کی وجہ سے کسی کو سزا

نہیں دے گا۔ بلکہ اس کے اپنے ہی افعال و اعمال پر اس کو سزا ملے گی۔ وہ اس لیے کسی کو سزا نہیں دے گا کہ اس نے اس کام کا کرنا اس کی تقدیر میں لکھ دیا تھا۔ اس کا ثواب وعقاب سے کوئی تعلق نہیں۔ ثواب وعقاب کا تعلق تو بندوں کے اپنے افعال اور اختیار کردہ کاموں کے ساتھ ہے جنہیں وہ اپنے ارادہ اور مرضی سے جان بوجھ کر قصداً کرتے ہیں۔

❁❁❁❁❁

فصل ششم:

ایمان کیا ہے؟

وَالْإِيْمَانُ قَوْلٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِالْأَرْكَانِ وَعَقْدٌ بِالْجِنَانِ، يَزِيْدُ بِالطَّاعَةِ وَيَنْقُصُ بِالْعِصْيَانِ. (١)

ترجمہ……: ایمان زبان سے اقرار، اعضاء سے عمل اور دل کے عقیدے کا نام ہے۔ یہ اطاعت سے بڑھتا اور نافرمانی سے کم ہوتا ہے۔

تشریح……: (۱) قضاء وقدر کی بحث سے فارغ ہوکر مصنف رحمہ اللہ ایمان کی تعریف کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔

ایمان کی لغوی تعریف:

''ایک امانت دار خبر دینے والے کی کسی غیبی معاملے سے متعلق خبر کی تصدیق کرنا۔'' اس تصدیق کو ایمان اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ ہم خبر دینے والے کو امین مانتے ہیں۔ ایک ایسی بات کی خبر پر جو ہم نے نہیں دیکھی ہوتی۔ یعنی ہم کسی شخص کی ثقاہت کی وجہ سے اس کی خبر پر اعتماد کرتے ہیں۔

مثلاً آپ کو کوئی بتائے کہ فلاں علاقے میں فلاں فلاں واقعہ پیش آیا ہے۔ آپ وہاں جائے بغیر اور اس واقعہ کو دیکھے بغیر اس کی بات کی تصدیق کردیں تو اس کو لغت میں ایمان کہتے ہیں۔

اصطلاحی تعریف:

شریعت کی اصطلاح میں ایمان ایک شرعی حقیقت کا نام ہے۔ اہل اصول کے ہاں حقیقت کی تین قسمیں ہیں۔

ا……حقیقت شرعی

۲......حقیقت عرفی

۳......حقیقت لغوی

لہٰذا یہاں ایمان کی تعریف میں ہم اسے ایک حقیقت شرعی کہیں گے نہ کہ حقیقت لغوی یا حقیقت عرفی۔

مثلاً لغت میں صلوٰۃ محض دعا کو کہتے ہیں۔ لیکن شریعت میں اس سے مراد یہ ہے کہ: ''معروف صلوٰۃ (نماز) جو تکبیر سے شروع کی جاتی ہے اور سلام پر ختم کی ہوتی ہے۔ یعنی اقوال و افعال کا وہ مجموعہ جسے تکبیر سے شروع کیا جاتا اور سلام پر ختم کیا جاتا ہے اسے ''اَلصَّلٰوۃُ ......نماز'' کہا جاتا ہے۔''

اسی طرح روزہ، زکوٰۃ، حج۔ یہ تمام شرعی حقائق ہیں اور ایمان بھی ایک شرعی حقیقت ہے۔

اور اس سے مراد قول باللسان، اعتقاد بالقلب اور عمل بالجوارح ہے۔ قول باللسان سے مراد شہادتین کا اقرار، ذکر الٰہی اور تسبیح و تہلیل ہیں۔ اعتقاد بالقلب سے مراد یہ ہے کہ جس بات کا آپ زبان سے اقرار کر رہے ہیں آپ کا دل بھی اس کی تصدیق کرے۔ اور عمل بالجوارح سے مراد یہ ہے کہ انسان کے اعضاء اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت میں استعمال ہوں اور گناہوں سے رکے رہیں۔

لہٰذا ایمان محض زبان سے انکار کا نام نہیں اور نہ ہی محض تصدیق قلبی یا عقیدہ و اقرار کے بغیر محض عمل کا نام ہے۔ بلکہ ان تینوں شروط کا پایا جانا ضروری ہے جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔

یَزِیْدُ بِالطَّاعَاتِ: سے مراد یہ ہے کہ جب انسان نیکی کے کام کرتا ہے تو اس کا ایمان بڑھتا ہے۔

وَیَنْقُصُ بِالْمَعْصِیَۃِ: اور گناہ کرنے سے ایمان میں کمی واقع ہوتی ہے۔

ایمان کی کمی و بیشی کی قرآن سے دلیل ملتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُہُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ

عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ (الانفال : ۲)

''(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جائیں تو انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔''

مذکورہ بالا آیت سے یہ دلیل ملتی ہے کہ جب انسان قرآن سنتا ہے تو اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور جب قرآن سے دور ہوتا ہے تو ایمان میں کمی آتی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى وَّ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا﴾ (مریم : ۷۶)

''اور اللہ ان لوگوں کو جنھوں نے ہدایت پائی، ہدایت میں زیادہ کرتا ہے اور باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے بہتر اور انجام کے لحاظ سے کہیں اچھی ہیں۔''

اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَ اِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ﴾

(التوبة : ۱۲٤)

''اور جب بھی کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں اس نے تم میں سے کس کو ایمان میں زیادہ کیا؟ پس جو لوگ ایمان لائے، سو ان کو تو اس نے ایمان میں زیادہ کر دیا اور وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔''

یعنی جب بھی قرآن کی کوئی سورت نازل ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان بڑھ جاتا۔

ارشاد پاک ہے:

﴿وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَ

مَاتُوْا وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ﴿﴾ (التوبہ : ۱۲۵)

''اور رہے وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے تو اس نے ان کو ان کی گندگی کے ساتھ اور گندگی میں زیادہ کر دیا اور وہ اس حال میں مرے کہ وہ کافر تھے۔''

یعنی جن کے دلوں میں نفاق اور شک ہوتا تھا ان کی غلاظت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ کیونکہ وہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا جوں جوں قرآن نازل ہوتا توں توں ان کے شک وشبہ میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

ایمان کی زیادتی کی ایک دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

﴿وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (المدثر : ۳۱)

''اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں ایمان میں زیادہ ہو جائیں اور اہل کتاب اور ایمان والے تاکہ شک نہ کریں۔''

جب اللہ تعالیٰ نے جہنم کے داروغہ کے بارے میں بتایا اور یہ بتایا کہ جہنم کے داروغے ۱۹ فرشتے ہیں، گذشتہ آسمانی کتابوں میں بھی یہی بتایا گیا ہے تو اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو گیا۔ جبکہ کفار کہنے لگے: جہنم پر صرف ۱۹ فرشتے ہی کیوں مقرر کیے گئے ہیں؟ کیا جہنم والے ان پر غالب نہیں آسکتے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا جَعَلْنَا اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ﴾ (المدثر : ۳۱)

''اور ہم نے جہنم کے محافظ فرشتوں کے سوا نہیں بنائے اور ان کی تعداد ان لوگوں

کی آزمائش ہی کے لیے بنائی ہے جنھوں نے کفر کیا، تاکہ وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی ہے، اچھی طرح یقین کر لیں۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں ایمان میں زیادہ ہو جائیں۔ اور وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی ہے اور ایمان والے شک نہ کریں۔ اور تاکہ وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جو کفر کرنے والے ہیں کہیں: اللہ نے اس کے ساتھ مثال دینے سے کیا ارادہ کیا ہے؟ اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ باتیں بشر کی نصیحت ہی کے لیے ہیں۔''

اگرچہ ان کی تعداد ۱۹ ہے لیکن وہ فرشتے ہیں۔ اور فرشتے انسانوں جیسے نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق اس طرح فرمائی ہے اور انہیں اتنی قوت دی ہے کہ صرف ایک فرشتہ بھی ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک کے تمام انسانوں پر غلبہ پا سکتا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں محل شاہد ﴿وَيَزْدَادَ الَّذِينَ اٰمَنُوْا﴾ کے الفاظ ہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہیں کہ ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ جہاں تک ایمان کی کمی کی بات ہے تو یہ بدیہی طور پر معلوم ہے کہ جس چیز میں اضافہ ہو سکتا ہے اس میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں اس کے لیے نقلی دلائل بھی ہیں۔ مثلاً حدیث مبارکہ میں ہے:

((اَلْإِيْمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُوْنَ شُعْبَةً ، فَأَعْلَاهَا قَوْلُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ، وَأَدْنَاهَا ، إِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيْمَانِ .))

''ایمان کے ستر سے زیادہ درجات ہیں۔ ان میں سب سے بلند ''لا الہ الا اللہ'' کا اقرار اور سب سے کم تر درجہ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے۔ اور حیاء بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔'' [1]

[1] مسند احمد (۲۱۲/۱۵) ۹۳۶۱، بخاری (۹)، مسلم (۳۵)، ابوداؤد (۴۶۷۶)، ابن ماجہ (۵۷)، ترمذی (۲۶۱۴)، نسائی (۱۱۰/۸)، یہ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ ایمان میں کمی وبیشی ہوتی ہے۔ اس کے ۶۰ یا ستر سے زیادہ حصے ہیں۔ جب یہ تمام حصے مکمل ہو جائیں تو ایمان کامل ہو جاتا ہے اور جب ان میں سے کوئی کم پڑ جائے تو ایمان میں بھی کمی آ جاتی ہے۔

اسی لیے پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا:

"أَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ ."

اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان میں درجہ بندی ہے۔ اسی طرح سرور کونین کا فرمان ہے:

مَنْ رَأَىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَان .

"تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے اسے چاہیے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کو ختم کرے اگر اس کے پاس اتنی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے۔ اور اگر اتنی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے (برا جانے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔"[1]

یہ حدیث دلیل ہے اس بات کی کہ ایمان سے کمزوری آتی ہے۔ کبھی ایمان کامل ہوتا ہے اور کبھی ناقص اور کمزور۔ جو شخص محض دل سے برائی کو برا جانتا ہے اس کا ایمان انتہائی کمزور ہے۔ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں۔ لہٰذا جو شخص دل سے بھی برائی کو برا نہیں سمجھتا وہ مومن ہی نہیں۔ سو، معلوم ہوا کہ ایمان کبھی مضبوط ہوتا ہے، کبھی کمزور ہوتا ہے اور کبھی مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے:

((وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيْمَان حَبَّةُ خَرْدَلٍ .))

"اس سے نیچے رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہوتا۔"

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان کم ہوتے ہوتے کبھی انتہائی کمزور درجے تک پہنچ

---

[1] مسند احمد (۴۲/۱۸) (۱۱۴۶۰)، مسلم (۴۹)، ابوداؤد (۱۱۴۰، ۴۳۴۰)، ابن ماجہ (۱۲۷۵)، ترمذی (۲۱۷۲)، نسائی (۸/۱۱۲۔۱۱۱)۔ راوی ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں۔

جاتا ہے۔

اس کی ایک دلیل درج ذیل فرمان خداوندی بھی ہے:

﴿وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ﴾ (آل عمران : ١٦٧)

''اور تاکہ وہ ان لوگوں کو جان لے جنھوں نے منافقت کی اور جن سے کہا گیا: آؤ اللہ کے راستے میں لڑو، یا مدافعت کرو تو انھوں نے کہا: اگر ہم کوئی لڑائی معلوم کرتے تو ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اس دن اپنے ایمان (کے قریب ہونے) کی بہ نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے۔ اپنے مونہوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں۔ اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو وہ چھپاتے ہیں۔''

یعنی ان کے دلوں میں ایمان انتہائی کمزور ہوگیا حتیٰ کہ وہ کفر کے زیادہ قریب ہوگئے۔ ان کے دلوں میں ایمان انتہائی تھوڑا رہ گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ بعض اوقات ایمان اس قدر کمزور ہوجاتا ہے کہ انسان کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

اسی طرح حدیث شفاعت میں بھی ہے کہ:

((إِنَّ اللّٰهَ جَلَّ وَعَلَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَقُوْلُ: أَخْرِجُوْا مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ أَدْنٰى مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنَ الْإِيْمَانِ .))

''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جس شخص کے دل میں رائی کے دانے سے بھی کم ایمان ہے اسے جہنم سے نکال لو۔'' [1]

یہ حدیث بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان کمزور ہوکر بعض اوقات رائی کے دانے کے برابر رہ جاتا ہے جو کہ انتہائی چھوٹی چیز ہے۔ اس قدر ایمان انسان کو قیامت کے دن

[1] یہ حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ مسند احمد (۹۱/۱۸) (۱۱۵۳۳)، بخاری (۲۲)، مسلم (۱۸۴)۔

جہنم سے نکالنے کا سبب بن جائے گا۔ اور یہ ایمان کی فضیلت کی دلیل ہے کہ اس قدر ایمان رکھنے والا بھی ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔ اور بلا شبہ لوگوں کے ایمان برابر نہیں ہیں۔ سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان تمام لوگوں کے ایمان کے برابر ہو، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایمان اور ایک فاسق مسلمان کا ایمان برابر ہوں۔

مُرجئہ کے نزدیک ایمان تصدیق کا نام ہے۔ اس کا تعلق دل سے ہوتا ہے اور اس میں درجات نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایمان اور ایک فاسق ترین شخص کا ایمان برابر ہے۔ حالانکہ یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے۔

مُرجئہ کے خلاف اہل سنت والجماعت سلفی اہل حق کا مؤقف یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ایمان برابر درجے کا نہیں ہوتا۔ اس میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ کبھی مضبوطی اور کبھی کمزوری آتی ہے۔ کبھی کامل اور کبھی ناقص ہوتا ہے۔

مُرجئہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ ''اِرجاء'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے تاخیر۔ مُرجئہ چونکہ عمل کو ایمان سے مؤخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایمان محض تصدیق بالقلب کا نام ہے۔ اہل ایمان اصل ایمان میں برابر ہیں، ان میں درجہ بندی نہیں۔ اس لیے ان کو مرجئہ کہا جاتا ہے۔ مُرجئہ کے باہم بھی بہت سے فرقے ہیں اور ہر فرقہ کے اقوال مختلف ہیں۔

پہلا قول:

یہ ہے کہ ایمان محض قلبی معرفت کا نام ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے پروردگار کو پہچانتا ہے وہ مومن ہے۔ یہ جہمیہ کا قول ہے۔ اس قول کے مطابق ابلیس (شیطان) بھی مومن ہے۔ کیونکہ وہ اپنے رب کو پہچانتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ﴾ (الحجر: ۳۹)

''اس نے کہا اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے۔''

ان کے نزدیک فرعون اور باقی تمام کافر بھی مومن ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے رب کو پہچانتے تھے لیکن محض تکبر اور عناد کی وجہ سے ظاہری طور پر انکار کرتے تھے۔ ان میں سے ایک بھی ایسا

نہیں تھا جو اپنے پروردگار کو نہ پہچانتا ہو۔ یہ بدترین قول ہے۔ اس قول کے مطابق ان کے نزدیک روئے زمین پر ایک بھی کافر نہیں۔

دوسرا قول:

یہ ہے کہ محض معرفت قلبی کافی نہیں بلکہ ایمان کے لیے تصدیق قلبی بھی ضروری ہے۔ یہ اشاعرہ کا قول ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ دل سے تصدیق تو کافر بھی کرتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَیَحْزُنُكَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ۝﴾ (الانعام: ۳۳)

''بے شک ہم جانتے ہیں کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ یقیناً تجھے وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں۔ چنانچہ بلاشبہ وہ تجھے نہیں جھٹلاتے اور لیکن وہ ظالم اللہ کی آیات ہی کا انکار کرتے ہیں۔''

نیز ارشاد فرمایا:

﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ۝﴾ (النمل: ۱٤)

''اور انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا۔ حالانکہ ان کے دل ان کا اچھی طرح یقین کر چکے تھے۔ پس دیکھ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا۔''

الغرض کفار بھی دل میں رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتے اور آپ ﷺ کو پہچانتے تھے۔ لیکن محض تکبر، عناد، لوگوں میں اپنے جھوٹے مرتبے کی حفاظت کے لیے اور اپنے باطل ادیان کی حمیت کی وجہ سے آپ ﷺ کی رسالت کا اعتراف نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ابوطالب نے اپنی وفات کے وقت کہا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس کو اس کی وفات کے وقت توحید کے اقرار کی دعوت دی تھی۔ اس کے پاس موجود کفار کی ایک جماعت نے اسے کہا: ''کیا تو عبدالمطلب کے دین کو چھوڑ رہا ہے۔ وہ بے جا حمیت کا شکار ہوگیا اور لا

الہ الا اللہ کہنے سے انکار کر دیا۔ کہا: ''میں عبدالمطلب کے دین پر قائم ہوں۔'' اور اسی حالت میں مر گیا۔ حالانکہ وہ رسول اللہ ﷺ کو خوب پہچانتا تھا۔ [1]

لہٰذا وہ اپنے اشعار میں کہتا ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُ بِأَنَّ دِينَ مُحَمَّدٍ
مِنْ خَيْرِ أَدْيَانِ الْبَرِيَّةِ دِيْنًا
لَوْلَا الْمُلَامَةُ أَوْ حِذَارُ مسبةٍ
لَوَجَدْتَنِي سَمْحًا بِذَاكَ مُبِيْنًا

''یقیناً میں جان چکا ہوں کہ بلاشبہ محمد (ﷺ) کا دین کائنات کے تمام ادیان سے بہتر ہے۔ اگر مجھے ملامت یا طعنوں کا ڈر نہ ہوتا تو تم مجھے کھلم کھلا اس کی حمایت کرتے ہوئے پاتے۔''

اسے قبول اسلام سے صرف ملامت اور لوگوں کے طعنوں کے خوف نے روکے رکھا اور اس کی جاہلی حمیت نے اس کو کفر پر قائم رہنے پر مجبور کیا۔ حالانکہ وہ پہچانتا تھا کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن اس کے باوجود حالت کفر میں مرا۔ اور جب رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے استغفار کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ۝﴾

(التوبہ: ۱۱۳)

''اس نبی اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، کبھی جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ قرابت دار ہوں، اس کے بعد کہ ان کے لیے صاف ظاہر ہو گیا کہ یقیناً وہ جہنمی ہیں۔''

---

[1] مسند احمد (۳۹/۷۸) (۲۳۶۷۴)۔ بخاری (۱۳۶۰، ۳۸۸۴، ۴۶۷۵)۔ مسلم (۲۴) راوی مسیّب بن حزن ہیں۔ رضی اللہ عنہ

لٰہذا ایمان محض دل کی تصدیق کا نام نہیں۔ کیونکہ بہت سے کفار دل سے تو تصدیق کرتے ہیں لیکن تکبر اور عناد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔

تیسرا قول:

یہ ہے کہ ایمان محض تصدیق قلبی اور زبان سے اقرار کا نام ہے۔ یہ فقہاء مُرجئہ اور احناف کا قول ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''ایمان زبان سے اقرار اور دل میں یقین رکھنے کا نام ہے۔'' گویا یہ اعمال کو ایمان کا حصہ نہیں مانتے۔

چوتھا قول:

یہ ہے کہ ایمان محض زبان سے اقرار کا نام ہے۔ یہ کرامیہ کا قول ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ منافق بھی مومن ہیں۔ کیونکہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ ایمان کے بارے میں مُرجئہ کے مختلف فرقوں کے اقوال ہیں جو سب کے سب غلط اور گمراہی پر مبنی ہیں۔

اہل سنت والجماعت کا قول:

صحیح قول وہ ہے جو اہل سنت والجماعت سلفی اہل حق اختیار کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ایمان زبان سے اقرار، دل سے تصدیق اور اعضاء سے عمل کرنے کا نام ہے۔ یہ نیکیوں سے بڑھتا اور گناہوں سے کم ہوتا ہے۔

❀❀❀❀❀

قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى: ﴿وَمَا اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝﴾ (۱) فَجَعَلَ عِبَادَةَ اللّٰهِ، وَإِخْلَاصَ الْقَلْبِ وَإِقَامَ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَاءَ الزَّكٰوةِ كُلَّهُ مِنَ الدِّيْنِ.

ترجمہ......: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں۔ اسی کے لیے دین کو خالص رکھیں، ابراہیم حنیف کے دین پر۔ اور نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ دیتے رہیں یہی ہے دین سیدھی ملت کا۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت، اخلاص قلب، اقامت نماز، ادائیگی زکوٰۃ سب کو دین کے حصے قرار دیا ہے۔

تشریح.......: (۱) ایمان قول، اعتقاد اور عمل کا نام ہے، نیکیوں سے بڑھتا اور گناہوں سے کم ہوتا ہے۔ اس کی ایک دلیل درج ذیل فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا أُمِرُوٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِo﴾ (البینہ : ۵)

''انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں۔ اسی کے لیے دین کو خالص رکھیں، ابراہیم حنیف کے دین پر۔ اور نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ دیتے رہیں۔ یہی ہے دین سیدھی ملت کا۔''

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان قول، عمل اور اعتقاد کا نام ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں چیزوں کو مضبوط دین کہا ہے اور دین اور ایمان ہم معنی ہیں۔

دِيْنُ الْقَيِّمَة سے مراد مضبوط دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت مبارکہ میں اپنی عبادت، اپنے لیے اخلاص، اقامت نماز اور ادائیگی زکوٰۃ کو دین کہا ہے۔ حالانکہ ان میں بعض چیزیں عقیدہ سے تعلق رکھتی ہیں، بعض اقرار سے اور بعض عمل سے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ "اَلْإِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً، أَعْلَاهَا شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ." (۱) فَجَعَلَ الْقَوْلَ وَالْعَمَلَ مِنَ الْإِيْمَانِ.

ترجمہ.......: اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ایمان کی ستر سے زائد شاخیں ہیں جن میں سے بلند ترین لا الہ الا اللہ کی گواہی اور سب سے نچلی شاخ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے۔'' تو آپ ﷺ نے قول وعمل کو ایمان قرار دیا ہے۔

تشریح......: (۱) ایمان کی گذشتہ تعریف کی ایک دلیل یہ حدیث مبارکہ بھی ہے۔

((اَلْإِیْمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُوْنَ شُعْبَةً -: أَعْلاهَا: قَوْلُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ، وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِیْمَانِ.))

''ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں۔ ان میں سے سب سے بلند مرتبہ لا الہ الا اللہ کا اقرار ہے۔ اور سب سے کم درجہ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے۔ اور حیاء بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔'' ❶

اس حدیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے قول، عمل اور اعتقاد کو ایمان کا نام دیا ہے کیونکہ لا الہ الا اللہ کہنا قول ہے۔ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا عمل اور حیاء اعتقاد ہے۔ حیاء کو ایمان کی شاخ اس لیے کہا کیونکہ اس کا تعلق دل سے ہے اور ایمان بھی قلبی اعمال میں سے ہے۔ یہ حدیث اہل سنت والجماعت سلفی اہل حق کے قول کی دلیل ہے کہ ایمان: قول، عمل اور اعتقاد سے مرکب ہے۔ اور اس حدیث میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ ایمان کا ایک اعلیٰ مرتبہ بھی ہے اور ادنیٰ مرتبہ بھی، جو ایمان کی کمی وبیشی کی دلیل ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ تَعَالَی: ﴿فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا﴾ (التوبة: ١٢٤) (۱) وقال: ﴿لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا﴾ (الفتح: ٤) (۲)

ترجمہ......: اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔'' نیز فرمایا: تاکہ ان کا ایمان بڑھ جائے۔''

تشریح......: (۱) یہ آیت مبارکہ ایمان میں اضافے کی دلیل ہے۔ اس میں مُرجئہ کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ ایمان ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔ جبکہ درست بات یہ ہے کہ اس میں فرق آتا رہتا ہے۔ اس میں کمی وبیشی ہوتی ہے اور ﴿فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا﴾ کے الفاظ اس مسئلہ میں

---

❶ اس کی تخریج پیچھے گزر چکی ہے۔

بالکل واضح ہیں کہ قرآن کے نزول، اس کی سماعت اور اس پر عمل کرنے کی وجہ سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۲)۔۔۔۔ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۝﴾ (الفتح: ٤)

''وہی ہے جس نے ایمان والوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمائی، تاکہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ ایمان میں زیادہ ہو جائیں۔ اور آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

یہ آیت حدیبیہ کے واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جب مومنین کی آزمائش کی گئی تھی۔ کفار نے انہیں مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر سکینت نازل فرمائی۔ انہوں نے اللہ و رسول کے حکم پر سر تسلیم خم کر دیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی کفار کے ساتھ صلح کے لیے تیار ہو گئے۔

وہ صلح نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ مکہ میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ لیکن اللہ و رسول کے حکم کے آگے جھک گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس صلح کو مسلمانوں کے لیے مفید اور کفار کے لیے باعث ذلت بنا دیا اور اس کے اچھے نتائج نکلے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان جنگ بندی ہوگئی۔ مسلمانوں کو موقع مل گیا۔ جو مدینہ کی طرف ہجرت کرنا چاہتا تھا یا مسلمان ہونا چاہتا تھا وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اس میں کامیاب ہوگئے۔ اور صلح کی وجہ سے کسی نے ان کو نہ روکا۔ بالآخر مسلمانوں کو عظیم فتح حاصل ہوئی۔ مکہ مکرمہ فتح ہو کر اسلامی مملکت میں داخل ہوگیا اور کفار کا غلبہ ختم ہوگیا۔

یہ تمام اس عظیم صلح کے فوائد و ثمرات تھے جسے مسلمان ناپسند کرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے انجام کار مسلمانوں کے لیے بہتر بنا دیا۔ مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو سکون بخشا اور

انہوں نے اپنی بہادری کی وجہ سے کوئی مخالفت یا من مانی نہیں کی۔ اگرچہ ان میں سے اکثر مسلمانوں کی ذلت سمجھتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اسے مسلمانوں کے لیے باعث عزت بنائے گا اور اس کے نتائج مسلمانوں کے حق میں بہتر نکلیں گے۔ اس آیت میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے جھک جاتا ہے اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ "يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَفِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ بُرَّةٍ أَوْ خَرْدَلَةٍ أَوْ ذُرَّةٍ مِنَ الْإِيْمَانِ." فَجَعَلَهُ مُتَفَاضِلًا." (۱)

ترجمہ......: اور رسول اللہ کا فرمان ہے: ''آگ سے ہر وہ شخص نکل جائے گا جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہوگا، خواہ اس کے دل میں گندم، جو یا ریت کے ذرے کے برابر بھی ایمان ہوا۔'' گویا آپ ﷺ نے اس کو بڑھنے والا بتایا ہے۔

تشریح......: (۱) اس حدیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے کہ: جس شخص نے یقین قلب کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہا ہوگا اسے قیامت کے دن آگ سے نکال لیا جائے گا چاہے اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہو۔ بشرطیکہ وہ اس کلمے کے معنی پر یقین رکھنے والا ہو۔ ایسا نہیں کہ وہ اس کا زبان سے اقرار تو کرے مگر اس کے معنی پر یقین قلب نہ ہو۔ جیسے منافقین، کہ یہ کلمہ ان کے لیے نافع نہ ہوگا۔ اس حدیث میں ان کا ردّ بھی ہے جو کہتے ہیں کہ ایمان صرف زبان سے اقرار کا نام ہے۔ اور اس حدیث میں ان لوگوں کا بھی ردّ ہے جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ: ایمان صرف تصدیق قلب کا نام ہے۔ اور یہ کہ ایمان ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہتا ہے، نہ بڑھتا ہے اور نہ ہی کم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن رسول اللہ ﷺ سے فرمائیں گے:

((اِنْطَلِقْ فَاَخْرِجْ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ أَدْنٰى أَدْنٰى أَدْنٰى مِثْقَالَ حَبَّةٍ

مِـنْ خَـرْدَلٍ مِـنْ اِیـمَـان ، فَـأَخْرِجْهُ مِنَ النَّارِ ، مِنَ النَّارِ ، مِنَ النَّارِ ، فَانْطَلِقُ فَأَفْعَلُ .)) ❶

(اللہ عزوجل کے سامنے چوتھی بار سجدہ ریز ہونے کے بعد ربّ العالمین فرمائیں گے: اے میرے محبوب نبی محمد!) جاؤ اور جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے کم سے کم سے تر حصہ کے برابر بھی ایمان ہو، اسے جہنم سے نکال لو۔ جہنم کی آگ سے اسے نکال لو۔'' چنانچہ میں جاؤں گا اور ایسے لوگوں کو نکال لوں گا۔

تو، اس حدیث مبارک سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ؛ ایمان گھٹتے گھٹتے کبھی رائی کے دانہ سے بھی کم تر کم حصے تک چلا جاتا ہے۔ مگر اللہ عزوجل کے ہاں اس کی بھی قدر و قیمت ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب) اس حدیث سے یہ دلیل بھی ملتی ہے کہ؛ اسی کا نام ضعیف ایمان ہے۔ لیکن جب یہ کمزور تر ایمان قول ''لا الہ الا اللّٰہ'' کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے اور اس کلمہ مبارکہ کے معنی والے عقیدہ کے ساتھ تو پھر یہ اس مومن، مسلمان آدمی کو نفع دیتا ہے۔ اسے جہنم میں چلے جانے کے باوجود اس سے نکلوا لیتا ہے۔ اس لیے کہ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ ربّ العالمین کے ساتھ شرک و کفر کرنے والے ہی رہیں گے۔ جہاں تک اہل ایمان کا تعلق ہے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں رہیں گے، اگرچہ ان کا ایمان نہایت کمزور ہو اور اگرچہ انہیں بعض گناہوں کی سزا کے لیے جہنم میں داخل ہی کیوں نہ کیا جائے گا۔ بلکہ وہ اپنے ایمان کے سبب اس سے باہر نکل آئیں گے۔

❀❀❀❀❀

❶ صحیح البخاری: ۷۵۱۰۔ صحیح مسلم: ۱۹۳/ ۳۲۶۔ عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ.

فصل ہفتم:

ایمان بالغیب کا بیان

ایمان کی تعریف اور اہل سنت کے نزدیک تعریف ایمان بیان کرنے کے بعد مصنف رحمہ اللہ نے اس کے دلائل ذکر کیے۔ اب وہ بتا رہے ہیں کہ ایمان کی ایک قسم ایمان بالغیب بھی ہے۔ ایمان بالغیب سے مراد ماضی یا مستقبل کے وہ معاملات ہیں جن کا لوگوں نے مشاہدہ نہیں کیا۔ اس لیے کہ یا تو وہ گزر چکے ہیں یا ایسے معاملات ہیں جو صحیح احادیث میں بیان ہوئے ہیں لیکن ابھی رونما نہیں ہوئے۔ ان دونوں قسم کی باتوں میں عقل کا کوئی دخل نہیں بلکہ ان میں محض نقل پر ہی اعتماد کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نقل کردہ سچی خبریں ہیں۔

چنانچہ ماضی یا مستقبل کے جن غیبی معاملات کی اللہ ربّ العالمین اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے ان سب پر ایمان لانا اور اپنی عقل وفہم کو ان میں دخل دیے بغیر ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا واجب ہے۔ کیونکہ یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہماری عقل وفکر سے بالاتر ہیں۔ ان کی بنیاد محض اللہ ورسل کی خبر کی تصدیق وتسلیم پر ہے۔

اصل ایمان تو ہے ہی ایمان بالغیب۔ ظاہری باتوں کو ماننا تو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور نہ ہی اسے ایمان کہا جاتا ہے یعنی جو چیز مشاہدہ میں آ جائے اور دکھائی دے اس کو تو ہر کوئی مان لیتا ہے۔ لہٰذا یہ کوئی ایمان نہیں ہے۔ اسی لیے جب قیامت آ جائے گی تو اس وقت کسی کا ایمان لانا قابل قبول نہ ہوگا۔ یا جب موت کا وقت آ جاتا ہے اور انسان ان غیبی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے جو اسے بتائی جاتی تھیں تو اس وقت ایمان مقبول نہیں ہوتا۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ .))

''بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک موت کا غرغرہ نہ کرنا شروع کردے۔'' [1]

یعنی جب تک اس کی روح حلق تک نہ آجائے۔ کیونکہ جب روح حلق تک آجاتی ہے اور انسان ان چیزوں کا مشاہدہ کرلیتا ہے جو اسے بتائی جاتی تھیں تو ایمان وعمل کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے۔

﴿لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ۝﴾ (ق : ۲۲)

''بلا شبہ یقیناً تو اس سے بڑی غفلت میں تھا۔ سو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ دور کر دیا، تو تیری نگاہ آج بہت تیز ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں بندے کو بتایا گیا ہے کہ جب اس کی روح قبض کی جائے گی اور وہ ان چیزوں کو دیکھ لے گا جن کے بارے میں اسے زندگی میں بتایا جاتا تھا تو اس وقت ایمان لانا اس کے لیے نفع بخش نہیں ہوگا۔

اسی طرح فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ۝﴾ (الانعام : ۱۵۸)

''وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں۔ یا تیرا رب آئے، یا تیرے رب کی کوئی نشانی آئے، جس دن تیرے رب کی کوئی نشانی آئے گی کسی شخص کو اس کا ایمان فائدہ نہ دے گا، جو اس سے پہلے ایمان نہ

[1] جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس کے راوی ہیں۔ مسند احمد (۱۰/ ۳۰۰)، ترمذی (۳۵۳۷) امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

لایا تھا۔ یا اپنے ایمان میں کوئی نیکی نہ کمائی تھی۔ کہہ دے انتظار کرو، بے شک ہم (بھی) منتظر ہیں۔"

اس سے مراد وہ دن ہے جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور جو شخص اس وقت ایمان لائے گا یا توبہ کرے گا تو اس کا ایمان اور توبہ قبول نہیں کیے جائیں گے۔ کیونکہ اس وقت ایمان لانا حسی اور مشاہداتی چیز پر ایمان کہلائے گا نہ کہ ایمان بالغیب۔

اسی لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ۝﴾

(یونس : ۳۹)

"بلکہ انھوں نے اس چیز کو جھٹلا دیا جس کے علم کا انھوں نے احاطہ نہیں کیا۔ حالانکہ اس کی اصل حقیقت ابھی ان کے پاس نہیں آئی تھی۔ اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے۔ سو دیکھ ظالموں کا انجام کیسا ہوا۔"

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۝﴾

(البقرہ : ۲ تا ۳)

"یہ کتاب، اس میں کوئی شک نہیں، بچنے والوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔ وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے اور اس میں سے، جو ہم نے انھیں دیا ہے، خرچ کرتے ہیں۔"

معلوم ہوا کہ متقین کی سب سے پہلی صفت ایمان بالغیب ہے۔ یعنی وہ باتیں جن کا انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا لیکن صادق و مصدوق کی خبر پر اعتماد کرتے ہوئے اس پر اسی طرح ایمان لائے جیسا کہ انہوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہو۔ کیونکہ وہ اللہ ربّ العالمین اور اس کے

رسول ﷺ کی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

چنانچہ غیبی اور مستقبل کے معاملات میں عقل وفکر پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ غیب و حاضر کو جاننے والی ذات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے صحیح ثابت شدہ باتوں پر اعتماد کیا جائے جو اپنی مرضی سے بات نہیں کرتا تھا بلکہ وحی کی بنیاد پر بولتا تھا۔

ماضی کی بہت سی باتوں کی خبریں بھی اس میں داخل ہیں۔ مثلاً آدم وملائکہ کا واقعہ، اقوام نوح وابراہیم، اصحاب مدین، عاد وثمود اور دیگر گزشتہ امتوں کے واقعات۔ ان سب کی اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے، اس لیے ان پر ایمان لانا واجب ہے۔ یہ ماضی کے غیبی امور ہیں۔

مستقبل کے غیبی امور کا بھی یہی معاملہ ہے۔ مثلاً علامات قیامت، قیامت سے پہلے کیا ہوگا؟ آخری زمانہ میں کیا ہوگا؟ اسی طرح قبر کے عذاب اور اس کی نعمتوں سے متعلق خبریں، قیامت کے دن اور اس میں پیش آنے والے واقعات پر ایمان، نئی زندگی اور دوبارہ جی اٹھنے پر ایمان اور جنت وجہنم پر ایمان، یہ سب ایمان بالغیب میں داخل ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان بھی ایمان بالغیب میں داخل ہے کیونکہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہوا نہیں بلکہ محض اس کی کائناتی اور قرآنی آیات اور اس کے پیغمبروں کی باتوں پر اعتماد کرتے ہوئے اس پر ایمان لائے ہیں۔ ہم سچی صحیح احادیث، واضح آیات اور شب وروز دکھائی دینے والی اس کی مخلوقات اور اس کی بادشاہی جیسے قطعی دلائل پر اعتماد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ذات، اسماء وصفات اور اس کی عبادت کی فرضیت پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کائنات کا از خود وجود میں آجانا یا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا اس کو پیدا کرنا ناممکن ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝﴾ (الطور: ۳۵تا۳۶)

”یا وہ کسی چیز کے بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں۔ یا وہ (خود) پیدا کرنے والے ہیں؟ یا انھوں نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ بلکہ وہ یقین نہیں کرتے۔“

کون یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس نے ایک ذرہ، گندم یا جو کا دانہ یا آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز پیدا کی ہے؟

کفار میں سے بھی کسی نے باوجود اپنے شدید کفر اور عناد کے یہ دعویٰ نہیں کیا۔ وہ یہ دعویٰ کر ہی نہیں سکتے تھے کہ انہوں نے کوئی چیز پیدا کی ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰی بَیِّنَتٍ مِّنْهُ ط بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا۝﴾ (الفاطر: ٤٠)

''مجھے دکھاؤ زمین میں سے انھوں نے کون سی چیز پیدا کی ہے۔ یا آسمانوں میں ان کا کوئی حصہ ہے۔ یا ہم نے انھیں کوئی کتاب دی ہے کہ وہ اس کی کسی دلیل پر قائم ہیں؟ بلکہ ظالم لوگ، ان کے بعض بعض کو دھوکے کے سوا کچھ وعدہ نہیں دیتے۔''

گویا اللہ تعالیٰ نے انہیں چیلنج کرتے ہوئے فرمایا: یہ جن کی تم اللہ ربّ العالمین کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو مجھے دکھاؤ انہوں نے زمین کا کون سا حصہ پیدا کیا ہے؟ تو ان میں سے کسی نے بھی دعویٰ نہیں کیا کہ اس کے معبود نے کوئی چیز پیدا کی ہے۔ کیونکہ یہ دعویٰ کرنا کسی کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تمام آسمانوں، زمینوں، جنوں اور انسانوں کو اسی نے پیدا کیا ہے۔ وہ ہی پیدا کرتا ہے اور کوئی بھی اللہ تعالیٰ پر اس کی تخلیق کے سلسلے میں اعتراض نہیں کرتا کہ وہ یوں کہے: اس چیز کو فلاں نے پیدا کیا ہے، اس چیز کو فلاں نے پیدا کیا ہے۔ کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں چیلنج کرتے ہوئے فرمایا: اس دعوے پر اپنے دلائل پیش کرو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے۔

﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ ج قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ لَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ط قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَ الْبَصِیْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ط اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ

شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ (الرعد: ١٦)

''کہہ آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ کہہ دے اللہ۔ کہہ پھر کیا تم نے اس کے سوا کچھ کارساز بنا رکھے ہیں جو اپنی جانوں کے لیے نہ کسی نفع کے مالک ہیں اور نہ نقصان کے؟ کہہ دے کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتے ہیں؟ یا کیا اندھیرے اور روشنی برابر ہوتے ہیں؟ یا انھوں نے اللہ کے لیے کچھ شریک بنا لیے ہیں جنھوں نے اس کے پیدا کرنے کی طرح پیدا کیا ہے، تو پیدائش ان پر گڈمڈ ہوگئی ہے؟ کہہ دے اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ایک ہے، نہایت زبردست ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تمام مخلوقات کو پیدا کیا اور وہی پیدا کرتا ہے۔ کوئی اس دعوے پر اعتراض نہیں کرتا، نہ ہی کوئی کسی چیز کی تخلیق پر قادر ہے۔ بلکہ عقل اس کو تسلیم کرتی ہے۔ کوئی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور بھی خالق ہے۔ لہٰذا تنہا اللہ تعالیٰ ہی خالق کائنات ہیں اور کائنات کے تمام لوگ خواہ وہ کافر ہوں یا مومن اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ خالق صرف اللہ ہی ہے۔

﴿وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (لقمان: ٢٥)

''اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہہ دے سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے۔''

نیز فرمایا:

﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ﴾

(الزخرف: ٨٧)

''اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو بلاشبہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر کہاں بہکائے جاتے ہیں۔''

جب خالق اللہ تعالیٰ ہے تو حکم بھی اسی کا چلتا ہے۔ وہی احکام دیتا ہے، قوانین بناتا اور کسی کام سے منع کرسکتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ غیب کی ان تمام باتوں میں عقل وفہم کا کوئی دخل نہیں اور نہ ہی کوئی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بتلائے بغیر ان میں سے کسی بات کا اقرار یا انکار کرسکتا ہے۔

❀❀❀❀❀

ويَجِبُ الْإِيْمَانُ بِكُلِّ مَا أَخْبَرَ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ (١)؛ صَحَّ بِهِ النَّقْلُ عَنْهُ (٢) فِيْمَا شَاهَدْنَاهُ أَوْ غَابَ عَنَّا، نَعْلَمُ أَنَّهُ حَقٌّ وَّصِدْقٌ، وَسِوَاءٌ فِيْ ذٰلِكَ مَا عَقَلْنَاهُ أَوْ جَهِلْنَاهُ، وَلَمْ نَطَّلِعْ عَلَى حَقِيْقَةِ مَعْنَاهُ. (٣)

ترجمہ ...... : ہر اس بات پر ایمان لانا واجب ہے جس کی نبی مکرم ﷺ نے خبر دی، آپ سے صحیح سند سے منقول ہو۔ خواہ وہ ان معاملات کے متعلق ہو جن کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں یا ان کے متعلق جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ ہم اسے حق اور سچ جانتے ہیں۔ برابر ہے کہ ہمیں اس کی سمجھ آئے یا ہم اس سے جہالت میں ہوں اور ہمیں اس کی حقیقی علت سمجھ نہ آئے۔

تشریح ...... : (۱) نبی اکرم ﷺ کی بعض احادیث کو ماننا اور بعض کا انکار کرنا تمام احادیث کے انکار کے مترادف ہے۔ لہٰذا ہم آپ ﷺ کی تمام باتوں پر ایمان لاتے ہیں خواہ وہ ہماری عقل کے دائرے میں آئیں یا نہ آئیں۔ ہماری عقلوں کی اس معاملہ میں کوئی حیثیت نہیں، کیونکہ وہ تمام چیزوں کو جاننے سے عاجز ہیں۔ تمام اشیاء کو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

(۲) ...... چنانچہ جب کوئی حدیث صحیح سند سے ثابت ہو جائے تو خواہ وہ غیبی امور کے

متعلق ہی ہو اس پر ایمان لانا اور اس کی تصدیق کرنا واجب ہے۔ اور اگر کسی حدیث کی سند صحیح نہ ہو تو اس پر ایمان لانا ہم سے مطلوب ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ائمہ محدثین کے نزدیک (کسی بات پر ایمان لانے کے لیے) اس کی سند کا صحیح ہونا لازمی ہے۔ جب کوئی حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو اس میں نکتہ چینی کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔

(۳)......یعنی جس چیز کا ہم نے مشاہدہ کیا ہو اور جس کا مشاہدہ نہ کیا ہو ان میں کوئی فرق نہیں۔ اور ہر دو پر اسی طرح ایمان لانا واجب ہے گویا کہ ہم نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ کیونکہ اس کے بارے میں آپ کو اس صادق و مصدوق ﷺ نے خبر دی ہے جو اپنی خواہش سے نہیں بولتا۔ لہٰذا اسے ایسے ہی سمجھیں جیسے آپ نے خود اس کا مشاہدہ کیا ہو، خواہ کوئی بات ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ عقل کی اس میں کوئی حیثیت نہیں۔ کیونکہ غیبی معاملات کو عقل نہیں سمجھ سکتی۔ مثلاً انسانی عقل عذاب قبر کا تصور نہیں کرسکتی کہ یہ جنت کے باغات میں سے ایک باغ یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا بن جاتی ہے۔

اسی لیے بعض لوگ کہتے ہیں: میّت تو مٹی بن جاتی ہے اور اگر ہم قبر کھودیں تو ہمیں وہاں کوئی آگ یا باغ دکھائی نہیں دیتا۔

ہم کہتے ہیں: یہ دنیا کی طرح دکھائی دینے والی چیز نہیں بلکہ یہ تو آخرت کا جہان ہے جسے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور نہ ہی آپ اسے محسوس کر سکتے ہیں۔ کسی چیز کے صحیح ہونے اور وجود کے لیے لازمی نہیں کہ وہ دکھائی بھی دے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو آپ دیکھ سکتے ہیں، نہ ان کا مشاہدہ کرسکتے ہیں اور نہ ہی ان کا ادراک کرسکتے ہیں۔ حالانکہ وہ موجود ہیں۔

مثلاً دو شخص ایک دوسرے کے قریب سو جائیں، ان میں سے ایک تو بڑی پرسکون اور میٹھی نیند سوئے اور دوسرے کو پراگندہ خواب دکھائی دیتے ہوں۔ وہ نیند میں بے چین اور پریشان ہوتا ہے۔ لیکن ان دونوں کو ایک دوسرے کا احساس نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ ایک دوسرے کے قریب لیٹے ہوئے ہیں۔

جب دنیا میں یہ ہوسکتا ہے تو آخرت کے معاملات میں کیوں نہیں ہوسکتا جن کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا؟ ایسے ہی مردوں کو سمجھ لیجئے کہ ان میں سے ایک دوسرے کے قریب ہوتا ہے لیکن وہ ایک دوسرے کی نعمتوں اور عذاب کو محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ ہر ایک کو صرف اپنی ہی حالت محسوس ہوتی ہے۔

یہ اس اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے جسے کوئی چیز عاجز نہیں کرسکتی۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سے آخرت کے امور کو مخفی رکھا ہے اور عذاب قبر بھی امور آخرت میں سے ہے۔ چنانچہ ہم اگرچہ عذاب قبر کو محسوس نہیں کرتے اور نہ ہی وہ ہمیں دکھائی دیتا ہے لیکن ہم رسول اللہ ﷺ کی حدیث پر اعتماد کرتے ہوئے اس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے اسے ہم سے پوشیدہ رکھا ہے کیونکہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

لَوْلَا أَلَّا تُدَافِنُوْا لَسَأَلْتُ اللّٰهَ اَنْ يُسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ أَهْلِ الْقُبُوْرِ مَا أَسْمَعَنِيْ . [1]

''اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ وہ تمہیں قبر والوں کا وہ عذاب سنا دے جو اس نے مجھے سنایا ہے۔''

چنانچہ میّت کو قبر میں مارا جاتا ہے تو اس کی چیخ و پکار کو جنوں اور انسانوں کے علاوہ ہر مخلوق سنتی ہے۔ اگر انسان اسے سن لے تو مرجائے۔ سو، ان امور کا ہم سے مخفی رہنا اللہ تعالیٰ کی ہم پر رحمت ہے کہ ہم اسے دیکھ اور سن نہیں سکتے۔

لہٰذا آخرت کے معاملات کو دنیا کے معاملات کی طرح نہیں سمجھنا چاہیے اور آخرت کے مراحل میں سے پہلا مرحلہ عذاب قبر کا ہے۔ یہی آخرت کی پہلی منزل ہے اور قبر میں جو کچھ پیش آتا ہے وہ ایک غیبی جہان ہے جسے صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

❀❀❀❀❀

[1] أخرجه أحمد في المسند (١٩/ ١٤٧) (١٢٠٩٦) من حديث أنس، وهو حديث إسناده صحيح.

مِثْل حَدِيْثِ الْإِسْرَاءِ وَالْمِعْرَاجِ . (١)

ترجمہ......: مثلاً اسراء اور معراج کی حدیث۔

تشریح......: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں جو غیب کی خبریں بتائی ہیں ان میں سے ایک اسراء اور معراج کا واقعہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾ (الاسراء: ۱)

''پاک ہے وہ (اللہ ربّ العالمین) جو رات کے ایک حصے میں اپنے بندے کو حرمت والی مسجد سے بہت دور کی اس مسجد تک لے گیا جس کے اردگرد کو ہم نے بہت برکت دی ہے، تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بلاشبہ وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

یعنی مکہ مکرمہ سے فلسطین کی مسجد اقصیٰ تک رسول اللہ ﷺ گئے۔ مکہ اور فلسطین کے درمیان اتنی مسافت ہے کہ اونٹ اس کو ایک ماہ میں طے کرتا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ ایک ہی رات میں وہاں گئے اور اسی میں واپس بھی لوٹ آئے۔

(واقعہ یوں ہے کہ) نبی معظم محمد رسول اللہ ﷺ مکہ میں سوئے ہوئے تھے۔ جبرائیل علیہ السلام آئے۔ آپ کو براق پر سوار کیا اور بیت المقدس لے گئے (یاد رہے براق اس چوپائے کا نام ہے جس پر انبیاء سواری کرتے تھے اور اس کا قدم وہیں جا کر لگتا ہے جہاں تک اس کی نظر جاتی ہے) آپ ﷺ نے بیت المقدس میں تمام انبیاء کو نماز پڑھائی۔ پھر آپ ﷺ کو آپ کی روح اور جسم سمیت بیداری کی حالت میں نہ کہ نیند میں آسمان پر چڑھایا، لے جایا گیا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی اور رسول اکرم ﷺ کا معجزہ ہے۔ معراج کا تذکرہ سورۃ نجم کے شروع میں اور اسرا کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل کے آغاز میں ہے۔

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ﴾

''پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو رات کے وقت سیر کروائی۔''

''سَــــرٰیٗ'' کا لفظ عربی زبان میں ''رات کے وقت سفر کرنے'' پر بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسراء کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

﴿لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا﴾

''تاکہ ہم اس کو اپنی بعض نشانیاں دکھائیں۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس رات نبی مکرم محمد رسول اللہ ﷺ کو آسمان اور زمین کی بادشاہی میں اپنی عجیب وغریب نشانیاں دکھائیں۔ آپ ﷺ نے جنت وجہنم اور ان میں موجود لوگوں کو دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے جو چاہی اپنی وحی کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ سے گفتگو فرمائی اور سات آسمانوں کے اوپر سے آپ ﷺ پر پانچ نمازیں فرض کی گئیں۔ پھر آپ ﷺ زمین پر اتر آئے۔ اسی ایک رات میں مکہ واپس پہنچ گئے اور اگلے دن لوگوں کو سارا واقعہ بتلایا۔

یہ سن کر اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہوگیا۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی آپ کی تصدیق کر چکے تھے اور ایمان کامل رکھتے تھے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں چنانچہ آپ ﷺ کی کسی بات کو جھوٹ نہیں سمجھتے تھے۔ اسی لیے جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ آپ کا ساتھی کہتا ہے؛ وہ رات کو بیت المقدس گیا تھا، آسمان پر چڑھا اور ایک ہی رات میں واپس بھی آ پہنچا ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو ایسا ہی ہوگا۔ میں آسمانوں کی باتوں پر آپ کی تصدیق کرتا ہوں تو کیا اس بات کی تصدیق نہیں کروں گا۔''

لیکن کفار اور کمزور ایمان والے لوگوں نے اس واقعے کو آپ ﷺ کے ساتھ ٹھٹھا کرنے کا بہانہ بنالیا اور کمزور ایمان والوں میں سے بعض مرتد ہوگئے۔ کفار کو اس پر بہت خوشی ہوئی۔

لیکن اسراء اور معراج حق ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ایک معجزہ ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا امت محمدیہ کو عطا کردہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ چنانچہ اس پر ایمان لانا واجب ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ یہ سارے واقعات بیداری کی حالت میں پیش آئے نہ کہ نیند کی حالت میں۔ کیونکہ خواب کا تو کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔ کفار قریش بھی انکار نہیں کرتے تھے۔ لٰہذا اگر یہ خواب ہوتا تو وہ بھی اس کا انکار نہ کرتے۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے "اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ" کے الفاظ فرمائے ہیں۔ "عبد" کا لفظ روح اور جسم کے مجموعے پر بولا جاتا ہے۔ نہ تو تنہا روح کو "عبد" کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی تنہا جسم کو۔

❀❀❀❀❀

وَكَانَ يَقْظَةً لَامَنَاماً (١) فَإِنَّ قُرَيْشًا أَنْكَرَتْهُ وَأَكْبَرَتْهُ وَلَمْ تَكُنْ تُنْكِرُ الْمَنَامَاتِ. (٢) وَمِنْ ذَالِكَ: أَنَّ مَلَكَ الْمَوْتِ لَمَّا جَاءَ إِلَي مُوسٰي عَلَيْهِ السَّلَامُ لِقُبِضَ رُوحَهُ لَطَمَهُ فَفَقَأَ عَيْنُهُ فَرَجَعَ إِلَى رَبِّهِ فَرَدَّ عَلَيْهِ عَيْنَهُ. (٣)

ترجمہ......: یہ حالت بیداری میں ہوئی تھی نہ کہ حالت نیند میں۔ کیونکہ قریش نے اس کا انکار کیا اور اسے ناممکن جانا۔ جبکہ وہ نیند کی حالت (میں دیکھی ہوئی چیزوں) کا انکار نہیں کرتے تھے۔ ایسی احادیث میں سے ایک یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے پاس ملک الموت (موت کا فرشتہ) آپ علیہ السلام کی روح قبض کرنے آیا تو آپ علیہ السلام نے اس کو تھپڑ مارا۔ اس کی آنکھ پھوٹ گئی اور وہ اپنے رب کی طرف لوٹا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھ درست کر دی۔

تشریح......: (۱) اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر نیند کی حالت میں ہوتا تو قریش والے اس کا انکار نہ کرتے۔ کیونکہ خواب کا تو کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔ تو ثابت ہوا کہ یہ خواب نہیں تھا۔ ہاں البتہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب کی حالت میں بھی یہ دیکھا تھا۔ لیکن یہ اسراء اور معراج کا موقعہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک اور واقعہ ہے۔

(۲)...... کفار قریش خوابوں کا انکار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کفار و مومنین میں سے کوئی بھی خوابوں کا انکار نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔

(۱)...... اور جن باتوں کی تصدیق کرنا واجب ہے ان میں سے ایک موسیٰ علیہ السلام اور ملک الموت کا قصہ بھی ہے۔ موسیٰ سے مراد موسیٰ بن عمران کلیم اللہ علیہ السلام ہیں۔ (واقعہ یوں ہے کہ)

آپ علیہ السلام کے پاس ملک الموت (آپ کی آزمائش کرنے کے لیے) انسانی شکل میں آیا اور آپ علیہ السلام کو بتایا کہ میں آپ کی روح قبض کرنے والا ہوں۔ جناب موسیٰ علیہ السلام نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا (کیونکہ آپ بہت غیرت مند تھے)۔اس سے ملک الموت کی آنکھ پھوٹ گئی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس گئے اور کہا۔اے اللہ! تو نے مجھے ایک ایسے بندے کے پاس بھیج دیا جو مرنا نہیں چاہتا تھا۔اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھ کو ٹھیک کر دیا اور اُس سے فرمایا:

((اِذْهَبْ إِلَيْهِ ، فَقُلْ لَهُ يَضَعُ يَدَهُ عَلَى جِلْدِ ثَوْرٍ ، فَمَا أَصَابَتْ مِنْ جِلْدِ الثَّوْرِ ، فَلَهُ بِكُلِّ شَعْرَةٍ سَنَةٌ يَعِيْشُهَا .))

''اس کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ وہ اپنا ہاتھ کسی بیل کی جلد پر رکھیں۔ بیل کی جلد کے جتنے بال ان کے ہاتھ کے نیچے آئیں، ہر بال کے بدلے ان کی زندگی ایک سال مزید بڑھ جائے گی۔''

ملک الموت دوسری مرتبہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان کہہ سنایا تو موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: وَبَعْدَ ذالك؟ ''اس کے بعد کیا ہوگا''۔ ملک الموت نے کہا: موت۔تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: اِذَنْ اَلْآنَ يَا رَبِّ ''تو پھر اے میرے پروردگار ابھی (قبول) ہے۔'' [1]

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر بالآخر مرنا ہی ہے تو اے پروردگار میں ابھی مرنے کے لیے تیار ہوں۔

چنانچہ ملک الموت نے آپ علیہ السلام کی روح قبض کر لی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے ایسا اس لیے کیا کہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ ملک الموت ہے۔ جب انہیں علم ہوگیا کہ وہ ملک الموت اور اللہ کا فرستادہ ہے تو آپ نے اس کی بات مان لی۔

---

[1] امام احمد رحمہ اللہ نے اسے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے (۱۴/۲۶۴۔۲۶۵) (۸۶۱۶) اس حدیث کے تمام رواۃ ثقہ اور صحیح بخاری کے رواۃ ہیں سوائے ابن لھیعہ کے۔لیکن مسند احمد میں یہ حدیث صحیح سند سے بھی مروی ہے (۱۳/۸۴) (۸۶۴۶)، بخاری (۱۳۳۹، ۳۴۰۷)، مسلم (۲۳۷۲/۱۵۷) انہوں نے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی بیان کی ہے۔

وَمِنْ ذَالِكَ اَشْرَاطُ السَّاعَةِ. (۱)

ترجمہ......: انہی (امورِ غیبیہ) میں سے علاماتِ قیامت بھی ہیں۔

تشریح......: (۱) مستقبل کی وہ غیبی خبریں جن پر ایمان لانا واجب ہے علاماتِ قیامت بھی انہیں میں سے ہیں۔

أشـــراط: یہ "شَــرْط" کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے۔ علامت جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ٥﴾ (محمد: ۱۸)

"تو وہ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں سوائے قیامت کے کہ وہ ان پر اچانک آ جائے۔ پس یقیناً اس کی نشانیاں آ چکیں۔ پھر ان کے لیے ان کی نصیحت کیسے ممکن ہوگی، جب وہ ان کے پاس آ جائے گی۔"

یعنی قیامت کے قائم ہونے کی علامات آ چکی ہیں اور اس کا وقوع بہت قریب ہے۔ جب یہ قائم ہو جائے گی تو اس وقت ان کے لیے ایمان لانے اور تصدیق کا کوئی راستہ نہیں رہے گا اور نہ ہی ان کی توبہ قبول ہوگی۔ قیامت کی بہت سی علامات ہیں۔ ان میں سے بعض ابتدائی، بعض درمیانی اور بعض آخری دور کی ہیں۔ ابتدائی علامات تو پوری ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ایک نبی معظم محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہے۔ کیونکہ آپ قیامت (کے قریب مبعوث ہونے والے) نبی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ .))

"مجھے قیامت کے ساتھ اس طرح مبعوث کیا گیا ہے جیسے یہ دو (انگلیاں) ہیں۔"

اور آپ ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کیا۔ [1]

[1] مسند احمد (۱۹/۲۷۱) (۱۲۲۴۵)۔ بخاری (۶۵۰۴)۔ مسلم (۲۹۵۱)، ترمذی (۲۲۱۴) راوی انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں۔

آپ ﷺ نبی الساعۃ ہیں۔ یعنی آپ کے بعد قیام قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ مسلمانوں کو حاصل ہونے والی فتوحات، اسلام کا پھیلاؤ، اس کی کامیابی، لوگوں کے درمیان فتنوں اور جنگوں کا ظہور اور خونریزی، یہ سب قیامت کی علامات ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی خبر دی ہے۔

علامات متوسطہ:

ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کے عجائبات پے در پے رونما ہو رہے ہیں اور ہم ایسے دور سے گزر رہے ہیں جو مسلسل جدت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ نئے نئے عجائبات ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ یہ نئی نئی ایجادات، تیز ترین ذرائع مواصلات اور ممالک کا ایک دوسرے کے قریب ہو جانا یہ سب علامات قیامت ہی تو ہیں جو ظاہر ہو چکی ہیں۔

آخری علامات:

پھر آخری زمانے میں دس علامات پے در پے ظاہر ہوں گی۔

پہلی علامت:

امام مہدی رحمہ اللہ کا خروج ہے جو رسول اللہ ﷺ کے آل بیت اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہوں گے۔ ان کا نام رسول اکرم ﷺ کی طرح محمد بن عبد اللہ ہوگا۔ وہ اسلام کو پھیلائیں گے اور عدل کو عام کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے دین اسلام کی مدد فرمائیں گے۔ زمین اس طرح عدل سے بھر جائے گی جیسے پہلے ظلم سے بھری ہوئی تھی۔ پھر انہی کے زمانے میں مسیح دجال کذاب نکلے گا، جو بھینگا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ایک حکمت کے تحت اس کے ہاتھوں سے بہت بڑا فتنہ ظاہر کروائیں۔

(۲)...... پھر دجال کے آخری زمانے میں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام آسمان سے اتریں گے۔ دجال کو قتل کریں گے اور اسلامی حکومت قائم کریں گے۔ یعنی شریعت محمدیہ ﷺ کے مطابق فیصلے کریں گے۔ آپ ایک عرصہ تک زندہ رہیں گے پھر جب ان کی موت کا وقت جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقرر کیا ہے آ پہنچے گا تو وہ فوت ہو جائیں گے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ ۚ وَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا ۚ﴾ (النساء: ۱۵۹)

''اور اہل کتاب میں کوئی نہیں مگر اس کی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لائے گا اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا۔''

یعنی تمام اہل کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں گے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ آخری زمانے میں فوت ہوں گے اور آپ علیہ السلام کو باقی انبیاء کی طرح دفن کیا جائے گا۔

(۳)...... پھر یاجوج و ماجوج کا خروج ہوگا۔ یہ انسانوں میں سے ہی دو قبیلے ہوں گے۔ یہ بہت فتنہ پرور، خونریزی کرنے والے اور اہل ایمان کو تنگ کرنے والے ہوں گے۔

(۴)...... پھر سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور یہ بڑی علامات میں سے آخری علامت ہے۔ لہٰذا جب سورج مغرب سے طلوع ہو جائے گا تو ایمان اور توبہ کی قبولیت کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

(۵)...... پھر عدن کی گھاٹی سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو شام کی طرف جمع کر دے گی۔ وہ جہاں رات گزاریں گے یہ بھی ان کے ساتھ ٹھہرے گی۔ جہاں وہ دن کو آرام کریں گے یہ بھی وہیں رکی رہے گی حتیٰ کہ انہیں میدان محشر میں پہنچا دے گی۔

❀❀❀❀❀

مِثْلَ خُرُوْجِ الدَّجَّالِ (۱) وَنُزُوْلِ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ عليهما الصّلٰوةُ وَالسَّلَامُ فَيَقْتُلَهُ.

ترجمہ......: مثلاً دجال کا نکلنا، عیسیٰ بن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نزول اور دجال کو قتل کرنا۔

تشریح......: (۱) دجال دجل سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے جھوٹ۔ چونکہ دجال بہت زیادہ

جھوٹا ہوگا، اس لیے اس کو دجال کہتے ہیں۔ اور اس کو مسیح اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ زمین میں بہت تیزی سے چلے گا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کو مسیح اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ بھینگا ہوگا۔ اس کی ایک آنکھ (مٹی ہوئی) خراب ہوگی۔ وہ دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ ہے۔ حالانکہ اللہ بھینگا نہیں ہے۔ مزید برآں اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ''کافر'' لکھا ہوا ہوگا، ہر ایک اسے پڑھے گا۔ الغرض وہ خبیث، فسادی اور گمراہی کا سوداگر ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ ہدایت کے مسیح جناب عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو بھیجے گا۔ ان کو مسیح کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مریض کے جسم پر ہاتھ پھیریں گے تو وہ اللہ کے حکم سے شفایاب ہوجائے گا۔ یعنی فقط حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پھیرنے سے ہی وہ اللہ کے حکم سے تندرست ہوجائے گا۔

پھر مسیح ہدایت گمراہی کے مسیح کو قتل کردے گا۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام اسے تلاش کریں گے۔ فلسطین میں باب لُد کے قریب اسے قتل کردیں گے۔ لُد فلسطین میں ایک بستی کا نام ہے۔ پھر آپ علیہ السلام شریعت اسلامیہ کے مطابق فیصلے کریں گے۔ صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ کا اختیار ختم کردیں گے۔ الغرض آپ شریعت محمدیہ کے پیروکار بن کر حکومت کریں گے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع بن کر رہیں گے۔

❀❀❀❀❀

وَخُرُوْجُ يَأْجُوْجُ وَمَأْجُوْجُ. (۱)

ترجمہ......: اور یاجوج و ماجوج کا نکلنا۔

تشریح......: (۱) یاجوج اور ماجوج انسانوں کے ہی دو قبیلے ہیں۔ قرآن کریم میں ان کا قصہ یوں بیان ہوا ہے کہ ایک عظیم مومن بادشاہ ذوالقرنین کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں حکومت بخشی۔ چنانچہ وہ اسلام اور توحید کی دعوت کو پھیلانے کے لیے اطراف واکناف عالم میں پھرے اور جہاد فی سبیل اللہ کرنے کے لیے نکلے۔ جب وہ سدین (دو عظیم پہاڑ) کے درمیان پہنچے تو وہاں ان کا سامنا ایسے لوگوں سے ہوا جو بالکل کوئی بات نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں ڈرانے

دھمکانے والے یاجوج و ماجوج تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ﴾ (الکھف: ۹۴تا۹۵)

''انھوں نے کہا: اے ذوالقرنین! بے شک یاجوج اور ماجوج اس سرزمین میں فساد کرنے والے ہیں، تو کیا ہم تیرے لیے کچھ آمدنی طے کر دیں، اس (شرط) پر کہ تو ہمارے درمیان اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دے۔ اس نے کہا: جن چیزوں میں میرے رب نے مجھے اقتدار بخشا ہے وہ بہتر ہیں۔''

یعنی حضرت ذوالقرنین نے ان سے اجرت لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا کچھ دے رکھا ہے جو میرے لیے کافی ہے۔ پھر آپ نے ان سے کہا مطلوبہ سامان لادو۔ پھر اس نے دونوں بڑے پہاڑوں کے درمیان ایک اتنی بڑی اور مضبوط دیوار کھڑی کر دی کہ کوئی اسے توڑ سکتا تھا اور نہ ہی پھلانگ سکتا تھا۔ یہ دیوار انسانیت پر اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک انعام کی صورت اختیار کر گئی۔ اسی لیے ذوالقرنین نے فرمایا: یہ میرے رب کی رحمت ہے۔

لیکن آخری زمانے میں یاجوج و ماجوج اس دیوار کو توڑنے کے لیے کمر ہمت باندھیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝ وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ﴾ (الکھف: ۹۷تا۹۹)

''پھر نہ ان میں یہ طاقت رہی کہ اس پر چڑھ جائیں اور نہ وہ اس میں کوئی سوراخ کر سکے۔ کہا: یہ میرے رب کی طرف سے ایک رحمت ہے۔ پھر جب میرے رب کا وعدہ آ جائے گا تو وہ اسے زمین کے برابر کر دے گا۔ اور میرے رب کا

وعدہ ہمیشہ سے سچا ہے۔ اور اس دن ہم ان کے بعض کو چھوڑیں گے کہ بعض میں ریلا مارتے ہوں گے۔''

یعنی اس دیوار پر کوئی نہیں چڑھ سکتا لیکن آخری زمانے میں اللہ تعالیٰ انہیں اس دیوار کو توڑنے کی قدرت بخشیں گے۔ وہ اہل زمین کے خلاف نکل کھڑے ہوں گے جس سے خونریزی، فساد اور ایسے ایسے مسائل جنم لیں گے جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ وہ احادیث میں مذکور ہیں جبکہ انسانوں کے پاس ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ انہیں ایک بیماری لگا دے گا جس سے ان کی گردنوں میں کیڑوں جیسے پیدا ہوجائیں گے۔ وہ سب ہلاک ہوجائیں گے، مسلمانوں کو ان سے نجات مل جائے گی۔ زمین کے کیڑے مکوڑے ان کے جسموں کو کھا کے موٹے ہوجائیں گے اور اللہ کا شکر ادا کریں گے۔ الغرض یہ علاماتِ قیامت میں سے بڑی بڑی علامات ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَخُرُوْجُ الدَّابَّةِ (۱) وَطُلُوْعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِها (۲)

ترجمہ......: دابہ کا نکلنا، سورج کا اپنے مغرب سے طلوع ہونا۔

تشریح......: (۱) قیامت کی ایک علامت زمین سے ایک چوپائے کا نکلنا بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ﴾ (النمل: ۸۲)

''اور جب ان پر بات واقع ہو جائے گی تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے، جو ان سے کلام کرے گا کہ یقیناً فلاں فلاں لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔''

اگرچہ اس کے متعلق بہت سی احادیث ہیں لیکن اس کی حقیقت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ وہ

ایک چوپایہ ہوگا جو زمین سے نکلے گا۔ مگر اس کے نکلنے کی کیفیت، مقام، جگہ کا اللہ ہی کو علم ہے۔

(۲)...... سورج مشرق سے طلوع ہوتا اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ سورج کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا کائنات میں یہ طریقہ ہے کہ وہ ہمیشہ اور مسلسل زمین کے گرد مشرق سے مغرب کی جانب گردش کرتا ہے نہ کہ زمین سورج کے گرد گھومتی اور سورج ساکن ہے۔ جیسا کہ بعض ملحدین کا نظریہ ہے۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یعنی زمین ساکن ہے اور شمس وافلاک اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے بتلایا ہے اور مشاہدے سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ الغرض یہ مشرق سے طلوع ہوکر مغرب میں غروب ہوتا ہے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے کہا تھا۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۝﴾ (البقرہ: ۲۵۸)

''کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، اس لیے کہ اللہ نے اسے حکومت دی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے۔ اس نے کہا میں زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا: پھر اللہ تو سورج کو مشرق سے لاتا ہے، پس تو اسے مغرب سے لے آ۔ تو وہ جس نے کفر کیا تھا حیرت زدہ رہ گیا اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

جب نمرود نے دعویٰ کیا کہ وہ رب ہے اور مارتا اور زندگی عطا کرتا ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے اس کے سامنے اس عظیم معجزے کا تذکرہ کیا جس نے اسے بوکھلا دیا، کہ اللہ تعالیٰ تو سورج کو مشرق سے لاتا ہے اگر تو اپنے آپ کو رب سمجھتا ہے تو اسے مغرب سے لاکر دکھا۔ یعنی اللہ کے ارادے کے برعکس کرکے دکھا۔

﴿فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ﴾ (البقرہ: ۲۵۸)

"تو وہ جس نے کفر کیا تھا حیرت زدہ رہ گیا۔"

کیونکہ وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا اور یہ کام صرف اللہ ہی کرسکتا ہے۔

چنانچہ سورج کے بارے میں اللہ کی سنت ہے کہ وہ مشرق سے آتا اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ یعنی زمین کے گرد گردش کرتا ہے۔ وہ جس طرف ہوتا ہے زمین کو روشن کرتا ہے اور دن بن جاتا ہے۔ جب وہ اس جانب سے غائب ہوجاتا ہے تو رات چھا جاتی ہے۔ تاوقتیکہ وہ دوسری مرتبہ چکر لگائے اور یوں زمین کے گرد سورج کی گردش کی بناء پر دن رات کا سلسلہ جاری ہے جو کہ اللہ کی قدرت کا مظہر ہے۔

جب یہ نظام خراب ہوجائے گا اور اللہ تعالیٰ اس دنیا کو ختم کرنا چاہے گا تو سورج کی گردش الٹ کردی جائے گی۔ وہ مغرب سے طلوع ہونے لگے گا اور اس کا مغرب سے طلوع قیامت کے قریب ہونے، اس کائنات کے نظام کے خاتمے، دنیا کی انتہا اور آخرت کی ابتداء کی علامت ہوگا۔

❀❀❀❀❀

وَأَشْبَاهُ ذَالِكَ مِمَّا صَحّ بِهِ النَّقْلُ. (۱)

ترجمہ......: اور اس جیسی دیگر احادیث جو صحیح سند کے ساتھ منقول ہیں۔

تشریح......: (۱) مصنف رحمہ اللہ کی ذکر کردہ ان مثالوں کے علاوہ دیگر بھی علامات قیامت ہیں جو صحیح احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔

"مِمَّا صَحّ بِهِ النَّقْلُ" یہ ایک انتہائی ضروری شرط ہے۔ کیونکہ غیبی امور صرف صحیح دلیل سے ہی ثابت ہوتے ہیں۔ اسلامی عقیدہ میں ضعیف دلیل یا ایسی دلیل جو درجہ صحت تک نہ پہنچتی ہو قابل اعتماد نہیں۔ بلکہ صرف صحیح دلائل پر ہی اعتماد کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ متواتر ہوں یا آحاد۔

اہل سنت والجماعۃ سلفی حضرات کا عقیدہ یہی ہے کہ وہ متواتر اور آحاد میں فرق نہیں

کرتے۔ بلکہ محض صحت پر دارومدار ہے۔ چنانچہ جب کوئی صحیح حدیث مل جائے تو اس میں بیان ہونے والی بات پر ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہوکر ایمان لانا واجب ہے۔ کیونکہ یہ اس پاک ہستی کا کلام ہے جو اپنی خواہش سے نہیں بولتا تھا۔ لہٰذا جب سند صحیح ثابت ہو جائے تو اس پر ایمان نہ لانے کا کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔

❀❀❀❀❀

وَعَذَابُ الْقَبْرِ وَنَعِيمُهُ حَقٌّ. (۱)

ترجمہ......: نیز عذاب قبر اوراس کی نعمتیں حق ہیں۔

تشریح......: (۱) اسی طرح جن باتوں کی رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے ان میں سے قبر کا عذاب اوراس کی نعمتیں بھی ہیں۔ اس بارے میں تواتر سے احادیث منقول ہیں۔ لیکن معتزلہ اپنی خراب عقلوں کی بناء پر قبر کی نعمتوں اوراس کے عذاب کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہمیں قبر میں کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

ہم ان سے پوچھتے ہیں: کیا تمام معاملات کی بنیاد تمہارے مشاہدے اوراحساسات پر ہے یا اللہ کی قدرت پر؟ حقیقت یہ ہے کہ تمہاری عقلوں اوراحساسات کواس میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔ عذاب قبر کتاب وسنت اوراہل سنت والجماعت کے اجماع سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (السجدہ : ۲۱)

''اور یقیناً ہم انھیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے، تاکہ وہ پلٹ آئیں۔''

مفسرین کہتے ہیں: ''ادنیٰ عذاب سے مراد عذاب قبر یا دنیا میں پیش آنے والے مصائب وشدائد ہیں۔'' ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد عذاب قبر ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مصائب، ذلت اور مسلمانوں کا ان پر غلبہ، ان کا قتل اور گرفتاریاں وغیرہ ہیں۔ دونوں معنی مراد

لینے سے کوئی مانع نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کے بارے میں کہا:

﴿النَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِo﴾ (المومن: ٤٦)

''جو آگ ہے، وہ اس پر صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں۔ اور جس دن قیامت قائم ہوگی، (کہا جائے گا) آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿النَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا﴾ سے مراد عذاب قبر ہے۔ پھر فرمایا: ﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ﴾ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صبح و شام کے عذاب سے مراد دنیا کا عذاب ہے اور یہ قبر میں ہوتا ہے۔ جب قیامت آجائے گی تو پھر وہ سخت ترین عذاب میں داخل ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس آیت میں عذاب قبر کی دلیل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی متواتر احادیث بھی اس پر دال ہیں۔

❁❁❁❁❁

وَقَدِ اسْتَعَاذَ النَّبِيُّ ﷺ مِنْهُ وَأَمَرَ بِهِ فِيْ كُلِّ صَلوٰةٍ. (۱)

ترجمہ......: اور بلاشبہ نبی اکرم ﷺ اس سے پناہ مانگتے تھے اور ہر نماز میں اس سے پناہ مانگنے کا حکم دیتے تھے۔

تشریح......: (۱) رسول اکرم ﷺ کا عذاب قبر سے پناہ مانگنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حق اور مسلمہ حقیقت ہے۔ ورنہ اللہ کے رسول ﷺ اس سے پناہ نہ مانگتے۔ نبی کریم ﷺ نے ہر نماز میں عذاب قبر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

((اِسْتَعِيْذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ أَرْبَعٍ: مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ.))

"چار چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کرو۔ جہنم کے عذاب سے، قبر کے عذاب سے، زندگی اور موت کے فتنے سے اور مسیح دجال کے فتنے سے۔"[1]

اس میں ہمارا مقصود یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عذاب قبر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عذاب ایک حقیقت ہے اور پیش آ کر رہتا ہے۔ مومن اس سے پناہ مانگتے ہیں۔

عذاب قبر کے کچھ اسباب ہیں حتیٰ کہ بعض اہل ایمان کو بھی ان اسباب کی وجہ سے قبر میں عذاب ہوتا ہے۔ ان میں غیبت، چغلی اور پیشاب سے نہ بچنا ہیں۔

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کا دو قبروں کے پاس سے گزر ہوا تو آپ نے فرمایا:

((إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَان، وَمَا يُعَذَّبَان فِي كَبِيرٍ، أَلَا إِنَّهُ لَكَبِيرٌ، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَبْرِئُ مِنْ بَوْلِهِ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيْمَةِ.))

"بے شک ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور انہیں (بظاہر) کسی بڑے گناہ پر عذاب نہیں دیا جا رہا۔ لیکن یاد رکھو (درحقیقت) یہ بڑے گناہ ہیں۔ ان میں سے ایک تو اپنے پیشاب سے بچاؤ نہیں کرتا تھا جبکہ دوسرا چغل خور تھا۔"[2]

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مومن کو بھی ان گناہوں کے سبب عذاب قبر ہوتا ہے جن کا وہ دنیا میں ارتکاب کرتا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ فِي قَبْرِهٖ بِمَا نِيْحَ عَلَيْهِ.))

"بے شک میّت کو اس پر نوحہ کیے جانے کی وجہ سے قبر میں عذاب دیا جاتا ہے۔"[3]

---

[1] مسند احمد (۱۲/۱۷۶۔۱۷۷)، (۷۲۳۷)، مسلم (۵۸۸)۔ ابوداؤد (۹۸۳)۔ نسائی (۳/۵۸)، (۱۳۰۹) راوی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

[2] بخاری (۶۰۵۵)، مسلم (۲۹۲)، راوی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہیں۔

[3] یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ بخاری (۱۲۹۲)، مسلم (۹۲۹/۱۷)

اس سے معلوم ہوا کہ میّت پر نوحہ کرنا اس کے لیے عذاب کا سبب بنتا ہے۔ اور یہ عذاب قبر کے جملہ اسباب میں سے ایک سبب ہے۔

❀❀❀❀❀

وَفِتْنَةُ الْقَبْرِ حَقٌّ وَسُؤَالُ مُنْكَرٍ وَنَكِيْرٍ حَقٌّ. (۱)

ترجمہ......: امتحان قبر، منکر ونکیر کا سوال کرنا حق ہے۔

تشریح......: (۱) قبر میں پیش آنے والے معاملات میں سے منکر اور نکیر فرشتوں کے سوال بھی ہیں۔ جب میّت کو اس کی قبر میں رکھا جاتا ہے، قبر برابر کر دی جاتی ہے اور احباب واپس پلٹتے ہیں تو مردہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے۔ تب اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اس کی روح اس کے جسم میں لوٹا دی جاتی ہے۔ لیکن یہ برزخی زندگی ہوتی ہے اور روح کا لوٹنا ایسے نہیں ہوتا جیسے دنیاوی زندگی میں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی حقیقت کا صرف اللہ ہی کو علم ہے۔

الغرض اس کی روح اس کے جسم میں لوٹا دی جاتی ہے۔ فرشتے اسے بٹھا لیتے ہیں اور کہتے ہیں:

((مَنْ رَبُّكَ ، وَمَا دِيْنُكَ وَمَنْ نَبِيُّكَ .))

''تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور تیرا نبی کون ہے؟''

مومن کہتا ہے:

((رَبِّىَ اللّٰهُ ، وَالْإِسْلَامُ دِيْنِىْ ، وَنَبِيِّي مُحَمَّدٌ .))

''میرا رب اللہ، میرا دین اسلام اور میرے نبی محمد ﷺ ہیں۔''

وہ اس میں ذرا بھی ہچکچاہٹ یا تردد کا اظہار نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ دنیا میں مومن تھا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا تھا۔ دین اسلام کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ جبکہ منافق چونکہ اس دنیا میں شک کی زندگی گزارتا ہے، وہ زبان سے اسلام کا دعویٰ کرتا ہے لیکن دل سے اس کا منکر ہوتا ہے، اس لیے وہ قبر میں سوالوں کے جواب نہیں دے پائے

گا۔ بلکہ حیرت زدہ ہو کر کہے گا۔

((هَاهْ هَاهْ ، لَا أَدْرِيْ ، سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ شَيْئًا فَقُلْتُهُ . فَالْأَوَّلُ يُنْعَمُ ، وَيُفْتَحُ لَهُ بَابٌ إِلَى الْجَنَّةِ ، وَهٰذَا يُعَذَّبُ وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ فِي قَبْرِهٖ حَتَّى تَخْتَلِفَ أَضْلَاعُهُ ، وَيُفْتَحُ لَهُ بَابٌ إِلَى النَّارِ .))

''ہائے ہائے میں نہیں جانتا، میں نے لوگوں کو جو کچھ کہتے سنا وہ کہہ دیا۔ لہٰذا اوّل الذکر کو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے اور اس کے لیے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ جبکہ اس (دوسرے کو) عذاب قبر دیا جاتا ہے اور اس کی قبر تنگ کر دی جائے گی۔ حتیٰ کہ اس کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں اور اس کے لیے آگ کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔'' [1]

ہم اللہ سے ثابت قدمی طلب کرتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۗ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ۝﴾

(ابراهيم : ۲۷)

''اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے، پختہ بات کے ساتھ خوب قائم رکھتا ہے، دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی۔ اور اللہ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

یہ آیت مبارکہ عذاب قبر اور دو فرشتوں منکر و نکیر کے سوال کرنے کی دلیل ہے۔ اسی

[1] دیکھئے: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث۔ صحيح بخاری (۱۳۳۸، ۱۳۷٤)، مسلم (۲۸۷۰)، مسند احمد (۲۸۹/۱۹۔ ۲۹۰)، ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے (۱۰۷۱) اور ابوداؤد میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (۴۷۵۳)۔ دیکھئے: جامع الأصول لإبن الاثير (۱۷۳/۱۱۔ ۱۷۹) فتنہ قبر اور منکر و نکیر کے سوال کے متعلق بحث میں۔

لیے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ جب مردے کو دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو اس کی قبر پر کھڑے ہو جاتے اور آپ ﷺ فرماتے:

((اِسْتَغْفِرُوْا لِأَخِيْكُمْ ، وَاسْأَلُوْا لَهُ التَّثْبِيْتَ ، فَإِنَّهُ الْآنَ يُسْأَلُ .))

''اپنے بھائی کے لیے بخشش طلب کرو اور اس کے لیے ثابت قدمی کا سوال کرو کیونکہ اب اس سے سوال کیے جائیں گے۔'' [1]

لہٰذا یہ مستحب ہے کہ مسلمان جب مردے کو دفن کر کے فارغ ہوں تو اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو جائیں۔ اس کے لیے ثابت قدمی اور بخشش کی دعا کریں۔ جلدی سے نہ لوٹیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس دعا سے اسے فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی دعا قبول ہوتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عذاب قبر حق ہے۔ صرف ملحدین ہی اس کا انکار کرتے ہیں۔ مگر معتزلہ نے اپنی عقل کی بنیاد پر اس کا انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ عقل کو منقول (قرآن وسنت وغیرہ) پر ترجیح دیتے ہیں۔ لہٰذا جب ان کی عقل عذاب قبر کو نہ سمجھ سکی تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا اور احادیث کو جھٹلایا۔ ہم اللہ سے عافیت مانگتے ہیں۔

غیبی اُمور اور آخرت کے معاملات میں عقل کا کوئی دخل نہیں۔ نہ ہی عقل انہیں سمجھ سکتی ہے بلکہ ان کی بنیاد سچی خبروں پر ہے۔ ہم سچی خبروں کی بنیاد پر ہی ان پر ایمان لاتے ہیں۔ ہم آخرت اور قبر کے معاملے میں صرف وہی بات کہتے ہیں جس کی کتاب وسنت سے کوئی صحیح دلیل مل جائے۔ کیونکہ یہ غیبی امور ہیں جنہیں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

یہ ایمان بالآخرۃ کا حصہ ہے کیونکہ قبر، آخرت کی پہلی منزل ہے۔

❀❀❀❀❀

---

[1] اس کو ابوداوٗد نے بیان کیا ہے (۳۲۲۱) اس کی سند صحیح ہے۔ حاکم نے مستدرک میں اسے صحیح کہا ہے (۵۲۶/۱)، (۱۳۷۲) اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، راوی عثمان بن عفان ہیں۔ رضی اللہ عنہ

وَالْبُعْثُ بَعْدَ الْمَوْتِ حَقٌّ (۱)

ترجمہ......: اورموت کے بعد دوبارہ جی اٹھنا حق ہے۔

تشریح......: (۱) جن چیزوں پر ایمان لانا واجب ہے، ان میں سے ایک آخرت یعنی دوبارہ جی اٹھنے پر ایمان لانا بھی ہے۔

بعث سے مراد مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا ہے۔ یعنی وہ مٹی، ہڈیاں اور راکھ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہوکر اپنی قبروں میں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے انہیں پہلی حالت پر لوٹا دے گا۔ تاکہ ان کے اعمال کا انہیں بدلہ دے۔ چنانچہ دنیا کارخانہ عمل ہے اور آخرت جزاء کا گھر۔

جزاء اور حساب کے لیے دوبارہ زندہ ہونا ضروری ہے۔ معاملہ صرف دنیا پر ہی ختم نہیں ہوجاتا۔ بلکہ ایک آخرت کا گھر بھی ہے جو جزاء کا گھر ہے۔

اگر جزاء کے لیے دوبارہ جی اٹھنا نہ ہوتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا کہ اللہ تعالیٰ کے افعال بے مقصد اور بے نتیجہ ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ○ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ○﴾

(المومنون: ۱۱۵تا۱۱٦)

”تو کیا تم نے گمان کرلیا کہ ہم نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کیا ہے اور یہ کہ بے شک تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟ پس بہت بلند ہے اللہ، جو سچا بادشاہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، عزت والے عرش کا مالک ہے۔“

تو اللہ تعالیٰ پاک ہے عبث کام کرنے سے اور اس سے کہ مخلوق کو عبث پیدا کرتا۔ بلکہ اس نے انہیں ایک حکمت اور نتیجہ کے پیش نظر بنایا ہے۔ اور وہ ہے دوبارہ زندہ کرنا اور اچھے

اعمال کا اچھا اور برے اعمال کا برا بدلہ دینا۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کے جسموں کو دوبارہ پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔ مٹی اور ہڈیوں سے انہیں جمع کر کے پہلے کی طرح ان کے جسم بنا دیں گے۔

پھر اس کے بعد اسرافیل علیہ السلام کو صور میں پھونکنے کا حکم دیں گے اور وہ صور میں پھونک دیں گے۔ صور اس سینگ کو کہتے ہیں جس میں ارواح ہیں۔ چنانچہ ہر روح اڑ کر اپنے جسم میں پہنچ جائے گی اور اس کو زندہ کر دے گی۔ وہ حرکت کرنے لگے گا۔ پھر سب لوگ اپنی قبروں سے نکل کر میدان حشر کی طرف چلیں گے۔ وہ اجداث یعنی قبروں سے نکل کر بکھری ہوئی ٹڈیوں کی طرح میدان حشر میں جائیں گے۔ وہ اس میں اس پکارنے والے کی طرف دوڑ کر جائیں گے جو انہیں حشر کی طرف بلا رہا ہوگا۔ کوئی بھی پیچھے نہیں رہے گا۔

﴿يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ۝ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝﴾ (المعارج: ٤٣تا٤٤)

''جس دن وہ قبروں سے تیز دوڑتے ہوئے نکلیں گے، جیسے وہ کسی گاڑے ہوئے نشان کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی، ذلت انھیں گھیرے ہوئے ہوگی۔ یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔''

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۫ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝﴾ (یٰسین: ٥١تا٥٣)

''اور صور میں پھونکا جائے گا تو اچانک وہ قبروں سے اپنے رب کی طرف تیزی سے دوڑ رہے ہوں گے۔ کہیں گے ہائے ہماری بربادی! کس نے ہمیں ہماری سونے کی جگہ سے اٹھا دیا؟ یہ وہ ہے جو اللہ الرحمٰن نے وعدہ کیا اور رسولوں نے

سچ کہا تھا۔نہیں ہوگی مگر ایک ہی چیخ۔تو اچانک وہ سب ہمارے پاس حاضر کیے ہوئے ہوں گے۔''

اور مشرکین نے دوبارہ جی اٹھنے کا انکار کیا:

﴿وَ اِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ وَ اُولٰٓئِكَ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ وَ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ﴾ (الرعد: ۵)

''اور اگر تو تعجب کرے تو ان کا یہ کہنا بہت عجیب ہے: کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم یقیناً ایک نئی پیدائش میں ہوں گے۔یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کا انکار کیا اور یہی ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور یہی آگ والے ہیں۔وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

یعنی مٹی کیسے لوٹ سکتی ہے؟ اس میں دوبارہ زندگی کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟ اور فنا شدہ ہڈیاں کیونکر حالت اصلی پر لوٹ سکتی ہیں؟ یہ بکھرے ریشے، یہ کٹا پھٹا گوشت کیونکر دوسری مرتبہ جمع ہوسکتے ہیں؟

وہ اس کو بعید سمجھتے تھے، انہوں نے اپنی عقلوں کی بنیاد پر اس کا انکار کردیا۔حالانکہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ جس ذات نے انہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہ انہیں دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِیۡ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُهٗ وَ هُوَ اَهۡوَنُ عَلَیۡهِ وَلَهُ الۡمَثَلُ الۡاَعۡلٰی فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ﴾

(الروم: ۲۷)

''اور وہی ہے جو خلق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور وہ اسے زیادہ آسان ہے اور آسمانوں اور زمین میں سب سے اونچی شان اسی کی ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ﴾

(لقمان : ۲۸)

''نہیں ہے تمھارا پیدا کرنا اور نہ تمھارا اٹھانا مگر ایک جان کی طرح۔ بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

اللہ کو کوئی چیز عاجز نہیں کرسکتی۔ وہ اپنی پہلی مرتبہ تخلیق پر تعجب کیوں نہیں کرتے۔ حالانکہ زمانۂ ماضی میں وہ عدم تھے۔ نہ ان کی ہڈیاں تھیں اور نہ ہی چمڑے اور نہ ہی کوئی اور چیز۔

﴿قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْـًٔاo﴾ (مریم : ۹)

''کہا ایسے ہی ہے۔ تیرے رب نے فرمایا ہے یہ میرے لیے آسان ہے اور یقیناً میں نے تجھے اس سے پہلے پیدا کیا جب کہ تو کچھ بھی نہ تھا۔''

جب ہڈیاں اور گوشت کچھ نہ تھا تو اس وقت اللہ نے تمہیں عدم سے وجود بخشا۔ چنانچہ جو ذات انہیں عدم سے وجود میں لاسکتی ہے کیا وہ ان کے جسموں، ہڈیوں اور راکھ کو پہلی حالت میں نہیں لاسکتا؟ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو کوئی عاجز نہیں کرسکتا۔ جب اسرافیل صور میں پھونکیں گے تو لوگ اس طرح قبروں سے اٹھیں گے۔

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَo﴾

(یس : ۵۱)

''اور صور میں پھونکا جائے گا تو اچانک وہ قبروں سے اپنے رب کی طرف تیزی سے دوڑ رہے ہوں گے۔''

اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ صور میں تین مرتبہ پھونکا جائے گا۔

پھلا نفخه......: نفخہ فزع (گھبراہٹ والا) ہوگا۔

﴿وَ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ

اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ وَ کُلٌّ اَتَوْہُ دٰخِرِیْنَ۝﴾ (النمل : ۸۷)

''اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، گھبرا جائے گا مگر جسے اللہ نے چاہا۔ اور وہ سب اس کے پاس ذلیل ہو کر آئیں گے۔''

دوسرا نفخہ......: نفخہ صعق (جس سے سب لوگ مرجائیں گے۔)

تیسرا نفخہ......: نفخہ بعث (دوبارہ جی اٹھنے کا نفخہ) ہوگا۔

دوسرے اور تیسرے نفخے کا ذکر سورۃ زمر کے آخر میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ﴾

یعنی اس نفخہ (پھونک) سے آسمان وزمین کی تمام موجودات مرجائیں گی۔

﴿ثُمَّ نُفِخَ فِیْہِ اُخْرٰی﴾

یہ تیسرا نفخہ یعنی نفخۃ البعث ہوگا۔

❀❀❀❀❀

وَذَالِكَ حِیْنَ یُنْفِخُ اِسْرَافِیْلُ عَلَیْهِ السَّلَامُ فِی الصُّوْرِ. (۱) ﴿فَاِذَا هُمْ مِنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ۝﴾ (یس : ۵۱) وَیُحْشَرُ النَّاسُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا بُهْمًا. (۲)

ترجمہ......: اور یہ اس وقت ہوگا جب اسرافیل علیہ السلام صور میں پھونکیں گے: ''تو اچانک وہ قبروں سے اپنے رب کی طرف تیزی سے دوڑ رہے ہوں گے۔'' اور لوگوں کو قیامت کے دن اس حالت میں جمع کیا جائے گا کہ وہ ننگے پاؤں، ننگے بدن، بغیر ختنہ کیے ہوئے اور خالی ہاتھ ہوں گے۔

تشریح......: (۱)...... اسرافیل علیہ السلام ایک فرشتہ ہیں اور ان کو صور میں پھونکنے پر مقرر کیا گیا ہے۔

(۲)...... الأَجْدَاثُ: قبریں، یَنْسِلُوْنَ: وہ ان سے نکلیں گے۔

(۳)...... ''حشر'' بھی ان چیزوں میں سے ہے جن پر ایمان لانا واجب ہے۔ ''حشر'' لوگوں کو قبروں میں سے نکلنے کے بعد ان کو جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ اپنی قبروں سے نکل کر محشر کی طرف چلیں گے۔ محشر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ اگلے پچھلے تمام لوگوں کو جمع کریں گے۔ یہ ایک چٹیل میدان ہوگا جس میں کوئی اونچی جگہ، پہاڑ یا ٹیلہ نہیں ہوگا اور لوگ یہاں جمع ہوں گے۔ ❶ بلانے والا ان کا جواب سن سکے گا اور نظر ان سب کا احاطہ کر سکے گی۔ تمام مخلوقات اس میدان حشر میں جمع ہوں گی۔

حفاة: ننگے پاؤں، عراة: ننگے بدن، غرلا: بغیر ختنہ کیے ہوئے۔ دنیا میں ختنہ کے ذریعے جو گوشت اتارا جاتا ہے وہ اپنی جگہ واپس آجائے گا۔ بُهـمًا: ان کے پاس قطعاً کوئی چیز نہیں ہوگی سوائے اعمال کے۔ سب لوگ حشر کے میدان میں کھڑے ہوں گے۔ ❷

﴿هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ○ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ○ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ○﴾ (المرسلات: ۳۸ تا ۴۰)

''یہ فیصلے کا دن ہے، ہم نے تمھیں اور پہلوں کو اکٹھا کر دیا ہے۔ تو اگر تمھارے پاس کوئی خفیہ تدبیر ہے تو میرے ساتھ کر لو۔ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے۔''

❀❀❀❀❀

فَيَقِفُوْنَ فِيْ مَوْقِفِ الْقِيَامَةِ، حَتَّى يَشْفَعَ فِيْهِمْ نَبِيُّنَا مُحَمَّدٌ (ﷺ). (۱)

ترجمہ......: چنانچہ لوگ قیامت کے دن میدان محشر میں کھڑے رہیں گے حتیٰ کہ ہمارے نبی محمد ﷺ ان کی سفارش کریں گے۔

---

❶ دیکھیے: بخاری میں سہل بن سعد کی روایت (۶۵۲۱) اور مسلم میں (۲۷۹۰).

❷ دیکھیے: عبداللہ بن انیس کی حدیث مسند احمد میں (۲۵/ ۴۳۱-۴۳۲)، الأدب المفرد (۹۷۰)۔ اور یہ حدیث حسن ہے۔

تشریح......: (ا) لوگ بہت دیر تک میدان محشر میں کھڑے رہیں گے۔ سورج بہت قریب ہوگا۔ ان سے پسینہ ٹپک رہا ہوگا اور ہر ایک اس میں اعمال کے مطابق غرق ہوگا۔

الغرض لوگ شدید گرمی اور پچاس ہزار سال کا طویل عرصہ کھڑے رہنے کی وجہ سے شدید تھکاوٹ کا شکار ہوں گے۔ تب وہ اس لمبے عرصے کے قیام اور اس کے شدائد سے چھٹکارا پانے کے لیے باہم گفتگو کریں گے اور کہیں گے سفارش کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں۔ کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو تمہارے رب کے پاس تمہاری سفارش کر کے تمہیں اس مصیبت سے چھٹکارا دلائے۔ چنانچہ وہ انسانوں کے باپ آدم کے پاس جائیں گے اور ان سے مطالبہ کریں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کی سفارش کریں۔ یاد رہے کہ زندہ اور قدرت رکھنے والے شخص سے اس بات کا مطالبہ کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ رب کے ہاں آپ کی سفارش کرے بایں معنی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے آپ کے حق میں دعا کرے۔ کیونکہ دعا کی درخواست کو بھی سفارش ہی کہتے ہیں۔ لیکن آدم علیہ السلام معذرت کرلیں گے۔ پھر لوگ سب سے پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ وہ بھی معذرت کرلیں گے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے وہ بھی عذر پیش کریں گے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے وہ بھی اظہار اعتزار کریں گے۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے وہ بھی معذوری ظاہر کریں گے۔ بالآخر وہ آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائیں گے۔ الغرض وہ پانچوں اولوالعزم پیغمبروں آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سے سفارش کی درخواست کریں گے۔ لیکن صرف نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''میں ہی اس کا حقدار ہوں گا۔'' [1]

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے حق میں سفارش قبول تو کی جائے گی لیکن ابتداء میں اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی اس کے سامنے سفارش نہیں کرے گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوجائیں گے، اپنے رب سے دعا کریں گے اور اس کے سامنے گڑگڑاتے رہیں گے حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سر اٹھانے کا حکم دیا جائے گا۔ آپ سے کہا جائے گا: آپ

---

[1] اسے بخاری (۷۵۱۰) اور مسلم (۱۹۳/۳۲۶) نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔

مانگیں، آپ کو دیا جائے گا۔ پھر نبی معظم محمد رسول اللہ ﷺ تمام مخلوقات کی سفارش کریں گے کہ ان کا فیصلہ کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی سفارش کو قبول فرما لیں گے۔

پھر اللہ عزوجل اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے تشریف لائیں گے اور بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے اپنی ذات کے ساتھ حقیقی طور پر تشریف لائیں گے جیسے چاہیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّاo وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّاo﴾ (الفجر: ۲۱ تا ۲۲)

''ہرگز نہیں، جب زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی۔ اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے، جو صف در صف ہوں گے۔''

اور جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُo﴾ (البقرہ: ۲۱۰)

''وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس اللہ ربّ العالمین بادل کے سائبانوں میں آ جائے اور فرشتے بھی۔ اور کام تمام کر دیا جائے۔ اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔''

بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہ آمد اس طرح ہوگی جیسے اس کی ذات اور عظمت کے لائق ہوگی۔ ہم اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو مانتے ہیں جیسے اس نے اپنے لیے اس کا اثبات کیا ہے اور ہم تاویل کرتے ہوئے یہ نہیں کہیں گے کہ اس کا مطلب ہے: اس کا حکم آئے گا، کیونکہ یہ ایک باطل تاویل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اقدس کے ساتھ تشریف لائے گا جیسے وہ چاہے گا اور جیسے اس کی عظمت کے لائق ہوگا۔

جہاں تک کیفیت کا تعلق ہے تو ہم اس کے پیچھے نہیں پڑیں گے کہ وہ کیسے آئے گا۔ لیکن ہم اس بات کا اثبات کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل آئیں گے اور اپنی ذات کے ساتھ آئیں

گے۔ جیسا کہ اس نے خبر دی ہے۔ اور اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائیں گے۔

"حَتّٰی یَشْفَعُ فِیْھِمْ نَبِیُّنَا مُحَمَّدٌ ﷺ" سے مراد شفاعت عظمیٰ ہے۔ جبکہ نبی اکرم ﷺ بہت سی سفارشات کریں گے۔ ان میں سے بعض سفارشیں تو آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہیں اور بعض آپ ﷺ اور انبیاء و صالحین کے درمیان مشترکہ ہیں۔

جو سفارش صرف آپ ﷺ ہی کریں گے وہ شفاعت عظمیٰ ہے جو محشر میں کھڑے ہوئے لوگوں کے حق میں ہوگی۔ یہی وہ مقام محمود ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں تذکرہ کیا ہے۔

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ (الاسراء: ۷۹)

"اور رات کے کچھ حصے میں پھر اس کے ساتھ بیدار رہ، اس حال میں کہ تیرے لیے زائد ہے۔ قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر کھڑا کرے۔"

اس کو مقام محمود اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اگلے پچھلے تمام لوگ آپ ﷺ کی تعریف کریں گے۔ یہ شفاعت عظمیٰ ہے اور شفاعت کی باقی اقسام کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔

❁❁❁❁❁

وَيُحَاسِبُهُمُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى . (۱)

ترجمہ......: اور اللہ تبارک وتعالیٰ ان کا محاسبہ کریں گے۔

تشریح......: (۱) حساب سے مراد اللہ تعالیٰ کا بندوں کو ان کے اعمال کی وجہ سے ٹھہرانا، ان سے پوچھ گچھ کرنا اور ان کے اعمال کا ان سے اقرار کروانا ہے۔ کفار کا حساب اس طرح نہیں ہوگا کہ ان کی نیکیوں اور برائیوں کے درمیان موازنہ کیا جائے۔ کیونکہ ان کی تو نیکیاں ہی نہیں، بلکہ ان سے صرف اقرار کروایا جائے گا۔ وہ اپنے اعمال کا اقرار اور اپنے جرائم کا

اعتراف کریں گے۔ جبکہ اہل ایمان کا حساب اس طرح ہوگا کہ ان کی نیکیوں اور برائیوں کے درمیان موازنہ کیا جائے گا۔

اہل ایمان میں سے بعض ایسے بھی ہوں گے جن سے بالکل حساب لیا ہی نہیں جائے گا۔ وہ حساب اور عذاب کے بغیر ہی جنت میں داخل ہوجائیں گے جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ: ستر ہزار لوگ حساب اور عذاب کے بغیر ہی جنت میں داخل ہوجائیں گے۔ [1]

بعض ایسے ہوں گے جن سے پوچھ گچھ کی جائے گی اور حساب ان پر گراں ہوگا۔ چنانچہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ عُذِّبَ .))

''یعنی جس سے پوچھ گچھ کرکے حساب لیا گیا اسے عذاب بھی ہوگا۔'' [2]

الغرض حساب کے اعتبار سے اہل ایمان کی درج ذیل قسمیں ہیں۔ (۱)......جن سے حساب نہیں لیا جائے گا اور وہ حساب و عذاب کے بغیر ہی جنت میں داخل ہوجائیں گے۔ (۲)......جن سے آسان حساب لیا جائے گا۔ (۳)......جن سے پوچھ گچھ کی جائے گی ان پر حساب مشکل ہوجائے گا اور ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے عذاب بھی دیا جائے گا۔

جبکہ کفار سے حساب اس طرح نہیں لیا جائے گا کہ ان کی نیکیوں اور برائیوں کے درمیان موازنہ کیا جائے۔ کیونکہ ان کی تو نیکیاں ہوں گی ہی نہیں۔ چنانچہ ان سے حساب کے ذریعے صرف ان کے گناہوں کا اقرار کروایا جائے گا اور وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے۔

❁❁❁❁❁

[1] اسے امام مسلم نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے (۱۹۱) اور احمدؒ نے مسند میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے (۱۹۹۱۳) بیان کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

[2] اسے بخاری (۶۵۳۶) اور مسلم (۲۸۷۶) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا ہے۔

وَتُنْصَبُ الْمَوَازِيْنُ. (۱)

ترجمہ……: اور ترازو قائم کیے جائیں گے۔

تشریح……: (۱) قیامت کے دن کاموں میں سے ایک اعمال کے ترازو کا رکھا جانا بھی ہے اور یہ ترازو حقیقی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ○﴾ (الاعراف: ۸ تا ۹)

''اور اس دن وزن حق ہے۔ پھر وہ شخص کہ اس کے پلڑے بھاری ہوگئے، تو وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ اور وہ شخص کہ اس کے پلڑے ہلکے ہوگئے تو یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا۔ اس لیے کہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے۔''

نیکیاں ایک پلڑے میں اور برائیاں دوسرے پلڑے میں رکھی جائیں گی اور یہ اللہ تعالیٰ کے کامل عدل کا اظہار ہوگا۔ پھر جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ خوش نصیب اور کامیاب ہوگا اور جس کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا اور برائیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ نقصان اور خسارے میں رہے گا۔

﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ○ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ○ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ○ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ○ وَمَا اَدْرٰكَ مَاهِيَهْ ○ نَارٌ حَامِيَةٌ ○﴾

(القارعه: ٦ تا ١١)

''چنانچہ وہ شخص جس کے پلڑے بھاری ہوگئے۔ تو وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا۔ اور لیکن وہ شخص جس کے پلڑے ہلکے ہوگئے۔ تو اس کی ماں ہاویہ ہے۔ اور تجھے کیا معلوم کہ وہ کیا ہے؟ ایک سخت گرم آگ ہے۔''

فَأُمُّهُ هَاوِيَه: اُم الشئی اس کو کہا جاتا ہے جس کی طرف کسی چیز کو لوٹایا جائے۔ چنانچہ

جس کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوگا اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ امہ سے مراد اس کے دماغ کی جڑ ہے۔ گویا اسے سر کے بل آگ میں پھینکا جائے گا۔

یہ وزن حقیقی ہوگا، حقیقی ترازو میں کیا جائے گا جس کے دو حسی پلڑے ہوں گے۔ جیسا کہ احادیث میں مذکور ہے۔ لیکن اس کی کیفیت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ یہ آخرت کے امور میں سے ہے۔ البتہ اس کا معنی معلوم ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ترازو حقیقی ہوگا جس کے دو پلڑے ہوں گے۔ نیکیاں ایک پلڑے میں جبکہ برائیاں دوسرے پلڑے میں رکھی جائیں گی۔ جو پلڑا بھاری ہوگا اسی حساب سے ہر شخص کے ساتھ اچھا یا برا سلوک کیا جائے گا۔ یہ بات قرآن کریم، احادیث رسول ﷺ سے ثابت ہے اور اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔

معتزلہ کا مذہب:

معتزلہ کہتے ہیں: ''یہ حقیقی ترازو نہیں ہوگا بلکہ یہ قیام عدل سے کنایہ ہے۔'' یہ ان کے خبیث منہج یعنی عقل کو حاکم بنانے اور نصوص کی طرف توجہ نہ دینے کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک باطل اور گمراہ مذہب ہے۔

❀❀❀❀❀

وَتُنْشَرُ الدَّوَاوِيْنُ. (۱)

ترجمہ......: اور دفتر پھیلا دیے جائیں گے۔

تشریح......: (۱) الدّواوِین: ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن میں انسانوں کے اعمال رقم کیے جاتے ہیں۔ یہ اعمال کے صحیفے ہیں۔ کیونکہ انسان اس دنیا میں جو کام کرتا ہے وہ لکھ لیے جاتے ہیں۔ نگران فرشتے ہر اچھے اور برے عمل کو لکھ لیتے ہیں۔

﴿وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًاo اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًاo﴾

(الاسراء: ۱۳ تا ۱۴)

''اور ہر انسان کو، ہم نے اسے اس کا نصیب اس کی گردن میں لازم کر دیا ہے۔

اور قیامت کے دن ہم اس کے لیے ایک کتاب نکالیں گے، جسے وہ کھولی ہوئی پائے گا۔ (کہا جائے گا) اپنی کتاب پڑھ۔ آج تو خود اپنے آپ پر بطور محاسب کافی ہے۔''

ہر انسان کو اس کے اعمال سے بھری ہوئی کتاب دی جائے گی۔ وہ اسے پڑھے گا۔ مومن کو اس کی کتاب دائیں ہاتھ میں پکڑائی جائے گی۔

﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ ۝﴾

(الحاقه : ۱۹)

''سو جسے اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا لو پکڑو، میرا اعمال نامہ پڑھو۔''

سو وہ خوش ہوگا اور چاہے گا کہ لوگ اس کی کتاب کو دیکھیں۔ کیونکہ وہ خوش کن ہوگی اور جو چیز خوش کن ہوتی ہے انسان چاہتا ہے کہ لوگ اسے دیکھیں۔

﴿إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ﴾

''یقیناً میں نے سمجھ لیا تھا کہ بے شک میں اپنے حساب سے ملنے والا ہوں۔''

یعنی میں ایمان اور یقین رکھتا تھا کہ میرا حساب ہوگا۔ سو میں نے اس کے لیے نیک اعمال کر کے تیاری کی تھی۔

﴿فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ۝ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝﴾ (الحاقه : ۲۱ تا ۲۳)

''پس وہ ایک خوشی والی زندگی میں ہوگا۔ ایک بلند جنت میں۔ جس کے میوے قریب ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) خوب کھاؤ پیو۔''

کافر کو اس کی کتاب اس کی پشت کے پیچھے سے اس کے بائیں ہاتھ میں دی جائے گی۔

﴿وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ ۝﴾

''اور لیکن جسے اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا: اے

کاش! مجھے میرا اعمال نامہ نہ دیا جاتا۔''

وہ تمنا کرے گا کہ اسے اس کی کتاب نہ دی جاتی اور نہ پڑھائی جاتی۔ کیونکہ وہ اس کے لیے باعث رسوائی ہوگی۔

﴿وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝ يَالَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝﴾

''اور میں نہ جانتا تھا میرا حساب کیا ہے۔ اے کاش کہ وہ (موت) کام تمام کر دینے والی ہوتی۔''

یعنی وہ کہے گا: کاش مجھے دوبارہ زندہ نہ کیا جاتا اور میری موت ہی آخری موت ہوتی۔

﴿مَا اَغْنٰى عَنِّي مَالِيَهْ ۝﴾

''میرا مال میرے کسی کام نہ آیا۔''

یہ معاملہ صحائف کو دائیں یا بائیں ہاتھ میں پکڑانے کے بعد کیا جائے گا۔

﴿هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ ۝ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝﴾

(الحاقة: ۲۹۔۳۱)

''میری حکومت مجھ سے برباد ہوگئی۔ اسے پکڑو، پس اسے طوق پہنا دو۔ پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دو۔''

❀❀❀❀❀

وَتَتَطَايَرُ صَحَائِفُ الْأَعْمَالِ إِلَى الْأَيْمَانِ وَالشَّمَائِلِ. (۱) ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتَابَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝ وَيَنْقَلِبُ اِلٰى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتَابَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ فَسَوْفَ يَدْعُوْ ثُبُوْرًا ۝ وَيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝﴾ (الانشقاق: ۷تا۱۲) (۲)

ترجمہ......: اور اعمال کے صحیفے دائیں اور بائیں ہاتھوں میں آ جائیں گے۔ ''پس لیکن وہ شخص جسے اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا۔ سو عنقریب اس سے حساب لیا جائے گا، نہایت آسان حساب۔ اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف خوش خوش واپس آئے گا۔

اور لیکن وہ شخص جسے اس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا گیا۔ تو عنقریب وہ بڑی ہلاکت کو پکارے گا۔ اور بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا۔''

تشریح......: (۱) یہ صحائف اعمال، اللہ اور سنت رسول ﷺ سے ثابت ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا کمال عدل ہے کہ وہ نہ تو کسی پر ظلم کرے گا اور نہ ہی کسی کو اس کے ناکردہ گناہوں کی سزا دے گا۔

(۲)...... ایک آیت میں ہے کہ اس کو کتاب بائیں ہاتھ میں دی جائے گی اور ایک آیت میں ہے کہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دی جائے گی۔ دونوں آیتوں کو اس طرح جمع کیا جائے گا کہ اس کو اس کی کتاب بائیں ہاتھ میں اسے رسوا کرنے کے لیے پیٹھ کے پیچھے سے دی جائے گی (اللہ کی پناہ) گویا اس کے ساتھ دونوں طرح سلوک کیا جائے گا۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سننے میں آیا ہے: بعض گمراہ فرقے جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو اس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیتے ہیں تا کہ قیامت کے دن اس کا بایاں ہاتھ نہ ہو اور بائیں ہاتھ کی عدم موجودگی میں اس کو اس کی کتاب دائیں ہاتھ میں دی جائے۔ وہ اس بات پر ایمان نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اس ہاتھ کو جس کو وہ کاٹ دیتے ہیں پہلی حالت میں لوٹا دے گا۔ یہ گمراہ فرقوں کی مضحکہ خیز باتوں میں سے ایک بات ہے۔

❀❀❀❀❀

وَالْمِيْزَانُ لَهُ كَفَّتَانِ وَلِسَانٌ، تُوزَنُ بِهِ الْأَعْمَالُ. (۱) ﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولَٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا أَنفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ٥﴾ (المومنون: ۱۰۲ تا ۱۰۳) (۲)

ترجمہ......: ترازو کے دو پلڑے ہوں گے اور ایک زبان۔ اس کے ساتھ اعمال کو تولا جائے گا۔ ''جن کی ترازو کا پلڑا بھاری ہوگیا وہ تو نجات پانے والے ہوں گے۔ اور جن کے ترازو کا پلہ ہلکا ہوگیا، یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنا نقصان خود کرلیا ہے جو ہمیشہ کے لیے جہنم واصل

ہوئے۔‘‘

تشریح......: (۱) اس بات سے معتزلہ کا ردّ مقصود ہے کہ وہ حقیقی ترازو ہوگا جس کے دو پلڑے اور زبان ہوگی۔

(۲)...... امّ المومنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: ’’کیا آپ قیامت کے دن اپنے اہل بیت (ازواج مطہرات) والوں کو یاد رکھیں گے۔‘‘

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَمَّا فِيْ ثَلَاثَةِ مَوَاضِعَ ، فَلَا أَحَدٌ يَذْكُرُ أَحَدًا: عِنْدَ وَزْنِ الْأَعْمَالِ؛ حَتَّى يَعْلَمَ هَلْ تَرْجِحُ حَسَنَاتُهُ أَوْ سَيِّئَاتُهُ عِنْدَ تَطَايُرِ الصُّحُفِ؛ حَتَّى يَعْلَمَ هَلْ يُعْطَى صَحِيْفَتُهُ بِيَمِيْنِهٖ أَوْ بِشِمَالِهٖ . عَلَى الصِّرَاطِ .))

’’لیکن تین مواقع پر کوئی کسی کو یاد نہیں رکھے گا۔ اعمال کے وزن کے وقت حتیٰ کہ اسے علم ہوجائے کہ اس کی نیکیاں بھاری ہیں یا گناہ۔ دوسرا موقعہ صحیفوں کی تقسیم کے وقت حتیٰ کہ اسے علم ہوجائے کہ اس کا صحیفہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا یا بائیں میں۔ اور تیسرا مقام پل صراط ہے۔‘‘ [1] یعنی پل صراط سے گزرتے وقت حتیٰ کہ اسے علم ہوجائے کہ وہ نجات پائے گا یا نہیں۔

❀❀❀❀❀

---

[1] اسے احمدؒ نے مسند میں (۴۱/ ۲۲۵) (۲۴۶۹۶)، ابوداؤد (۴۷۵۵) اور حاکم (۴/ ۶۲۲) (۸۷۲۲) نے بیان کیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اگر اس میں حسن اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان ارسال نہ ہوتو یہ شیخین کی شرط پر ہے۔ اگرچہ صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ حسنؒ بچپن میں سیّدہ عائشہ اور اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہما کے گھر جایا کرتے تھے۔ امام ذہبیؒ نے بھی حاکم کی موافقت کی ہے۔

وَلِنَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ ﷺ حَوْضٌ فِي الْقِيَامَةِ (۱) مَاءُهُ أَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ، وَأَحْلَي مِنَ الْعَسَلِ. (۲)

ترجمہ......: ہمارے نبی محمد ﷺ کے لیے قیامت کے دن حوض ہوگا، جس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا۔

تشریح......: (۱) جن چیزوں پر ایمان لانا واجب ہے ان میں سے ایک نبی معظم ﷺ کا حوض بھی ہے۔

حوض پانی کے جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ ہمارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کو ایک حوض عطا ہوگا جو میٹھے پانی سے بھرا ہوگا۔ اس کا رنگ دودھ کی طرح سفید، ذائقہ شہد سے میٹھا اور برتن آسمان کے تاروں سے زیادہ ہوں گے۔ جو اس میں سے ایک گھونٹ پی لے گا اسے اس کے بعد کبھی پیاس نہیں لگے گی۔ ❶

لوگ محشر میں پیاسے ہوں گے، انہیں پانی کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا محمد رسول اللہ ﷺ کی امت میں سے صحیح ایمان والے لوگ آپ ﷺ کے حوض پر آ کر پانی پئیں گے۔

لیکن منافق اور بدعتی جب آپ ﷺ کے حوض کے پاس آئیں گے تو انہیں اس سے دور ہٹاتے ہوئے اس کے قریب آنے سے روک دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ فرمائیں گے:

((يَا رَبِّ أَصْحَابِي أَصْحَابِيْ ، فَيُقَالُ لَهُ: إِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَاذَا أَحْدَثُوْا بَعْدَكَ ، إِنَّهُمْ ارْتَدُّوْا بَعْدَكَ عَلَى أَدْبَارِهِمُ الْقَهْقَرَى .))

''اے میرے رب! یہ میرے ساتھی ہیں۔ یہ میرے ساتھی ہیں۔ آپ ﷺ سے کہا جائے گا: بے شک آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا بدعات ایجاد کر لی تھیں۔ بلاشبہ یہ لوگ آپ ﷺ کے بعد اُلٹے پاؤں (کفر کی طرف) واپس لوٹ گئے تھے۔'' ❷

---

❶ دیکھئے: ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح مسلم میں (۲۳۰۰) اور ترمذی میں (۲۴۴۵)۔

❷ اسے بخاری (۶۵۷۶، ۶۵۸۷) اور مسلم (۲۲۹۷) نے حضرت ابن مسعود اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے۔

الغرض یہ وہ حوض ہے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور ان اوصاف کو مانتے ہیں جو احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔

(۲)......اس میں کوثر گرے گی جو جنت کی نہروں میں سے ایک نہر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّآ أَعۡطَيۡنَٰكَ ٱلۡكَوۡثَرَ﴾ (الکوثر: ۱)

''بلاشبہ ہم نے تجھے کوثر عطا کی۔''

مشہور قول یہ ہے کہ کوثر سے مراد جنت کی ایک نہر ہے جو نبی مکرم محمد رسول اللہ ﷺ کے حوض میں گرے گی۔ ایک قول یہ ہے کہ کوثر سے مراد خیر کثیر ہے۔ اس میں نہر بھی داخل ہوجاتی ہے۔ کیونکہ وہ بھی ایک خیر ہے۔ لہٰذا یہ تفسیر عام ہے۔

❀❀❀❀❀

وَأَبَارِيقُهُ عَدَدُ نُجُومِ السَّمَاءِ (١) مَنْ شَرِبَ مِنْهُ شُرْبَةً لَا يَظْمَأُ بَعْدَهَا أَبَدًا (٢) وَالصِّرَاطُ حَقٌّ يَجوزهُ الْأَبرارُ، وَيَزِلُّ عَنهُ الْفُجّارُ.

ترجمہ......: اور اس کے پیالوں کی تعداد آسمان کے تاروں کے برابر ہوگی۔ جو شخص اس سے ایک گھونٹ پی لے گا، اس کے بعد اسے کبھی پیاس نہیں لگے گی۔ علاوہ ازیں (پل) صراط بھی حق ہے۔ نیکوکار اس سے گزر جائیں گے اور گنہگار اس سے پھسل جائیں گے۔

تشریح......: (۱) اباریق سے مراد وہ برتن ہیں جن میں پانی پیا جاتا ہے۔

(۲)......لہٰذا جو شخص حوضِ کوثر میں سے پی لے گا، اس کی پیاس بجھ جائے گی اور دوبارہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔

(۳)...... قیامت کے دن کے اعمال اور ہولناکیوں میں سے ایک پل صراط پر سے گزرنا بھی ہے۔

الصراط سے مراد وہ پل ہے جسے جہنم کے بالکل اوپر رکھا جائے گا۔ سب لوگ اس کو عبور

کریں گے اور اس کام میں ان کے اعمال کے علاوہ کوئی چیز ان کے لیے معاون ثابت نہیں ہوگی۔ لہٰذا بعض تو اس کو بجلی کے کوندنے کی طرح عبور کر جائیں گے۔

بعض اپنے اعمال کی قوت کے حساب سے تیز ہوا کی طرح۔

بعض ایک اچھے گھڑ سوار کی طرح۔

بعض اونٹوں کے قافلے کی طرح۔ بعض دوڑ کر، بعض چل کر اس کے اوپر سے جائیں گے۔ بعض پاؤں کے بل گھسٹتے ہوئے گزریں گے۔ جس قدر کسی کے اعمال کمزور ہوں گے اسی قدر وہ آہستگی سے گزرے گا۔

جبکہ بعض کو اچک کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ کیونکہ ان کے اعمال انہیں پل صراط پار کروانے کی طاقت نہیں رکھتے ہوں گے۔ چنانچہ وہ جہنم میں گر جائیں گے۔ [1]

اسی بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّاo ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّاo ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّاo وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّاo﴾ (مریم: ٦٨ تا ٧١)

”تو قسم ہے تیرے رب کی! بے شک ہم ان کو اور شیطانوں کو ضرور اکٹھا کریں گے۔ پھر بے شک ہم انھیں جہنم کے گرد ضرور گھٹنوں کے بل گرے ہوئے حاضر کریں گے۔ بے شک ہم ہر گروہ میں سے اس شخص کو ضرور کھینچ نکالیں گے جو ان میں سے اللہ الرحمٰن کے خلاف زیادہ سرکش ہے۔ پھر یقیناً ہم ان لوگوں کو زیادہ جاننے والے ہیں جو اس میں جھونکے جانے کے زیادہ حقدار ہیں۔ تم میں سے جو بھی ہے اس پر وارد ہونے والا ہے۔ یہ ہمیشہ سے تیرے رب کے ذمے قطعی بات ہے، جس کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔“

[1] دیکھئے: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث جو مسلم میں ہے (١٨٣)

وَإِنْ مِنْكُمْ: میں مومن اور کافر سب شامل ہیں۔

إِلَّا وَارِدُهَا: یعنی جہنم پر وارد ہوں گے۔اس وارد ہونے سے مراد پل صراط کے اوپر سے گزرنا ہے۔

﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا۝﴾ (مریم: ۷۲)

''پھر ہم ان لوگوں کو بچالیں گے جو ڈر گئے۔ اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔''

یعنی ظالم لوگ جہنم کی آگ میں گر جائیں گے۔

❀❀❀❀❀

وَيَشْفَعُ نَبِيُّنَا مُحَمَّدٌ ﷺ (۱) فِيمَنْ دَخَلَ النَّارَ مِنْ أُمَّتِهِ مِنْ أَهْلِ الْكَبَائِرِ.

ترجمہ……: اور ہمارے نبی محمد ﷺ اپنی امت میں سے کبیرہ گناہ کے مرتکب ان لوگوں کے بارے میں سفارش کریں گے جو جہنم میں داخل ہو جائیں گے۔

تشریح……: (۱) شفاعت: لغت میں شفاعت سے مراد کسی نیک کام میں واسطہ بننا ہے۔ اصل شفاعت یہی ہے۔ البتہ کبھی کبھی برائی میں واسطہ بننے کو بھی شفاعت کہتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا۝﴾ (النساء: ۸۵)

''جو کوئی سفارش کرے گا، اچھی سفارش، اس کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہوگا۔ اور جو کوئی سفارش کرے گا، بری سفارش، اس کے لیے اس میں سے ایک بوجھ ہوگا۔ اور اللہ ہمیشہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔''

مثلاً کسی کو حد سے بچانے کے لیے سفارش، ایک بری اور حکم باری تعالیٰ کے خلاف

سفارش ہے۔ سفارش کا اصل معنی وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ لیکن آخرت میں سفارش دعا کی صورت میں ہوگی۔ وہ یوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کی سفارش کسی کے حق میں قبول کرکے انہیں عزت بخشیں گے۔ سفارش دو شرطوں کے ساتھ قبول ہوگی:

(۱)...... اللہ تعالیٰ کسی کو سفارش کی اجازت دے اور جس کی سفارش کی جارہی ہو اس کے اہل توحید و ایمان میں سے ہونے کی وجہ سے اس پر راضی ہو۔

لٰہذا کافر کے حق میں سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔ بلکہ یہ صرف اہل ایمان کے لیے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اپنے کچھ بندوں کی عزت افزائی کے طور پر ان کی سفارش، وساطت اور دعا کو قبول کریں گے۔ الغرض جس کے حق میں سفارش کی جائے گی۔ سفارش اسے تب ہی فائدہ دے گی جب وہ اہل ایمان میں سے ہوگا۔

(۲)...... سفارش کی دوسری قسم صرف نبی مکرم ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔ آپ اہل جنت کے حق میں سفارش کریں گے کہ انہیں جنت میں داخل کردیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے جو شخص جنت کا دروازہ کھلوائے گا وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہوں گے۔ اور جو امت سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگی وہ امت محمدیہ ہے۔

سو آپ ﷺ اہل جنت کو جنت میں داخل کرنے کی سفارش کریں گے اور ان کے لیے آپ ﷺ کی سفارش کی وجہ سے جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

شفاعت کی جو قسمیں نبی کریم محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہیں ان میں سے ایک آپ کا اپنے چچا ابوطالب کی سفارش کرنا بھی ہے۔ یہ سفارش صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔ کیونکہ ابوطالب کافر تھا۔ کفر کی حالت میں عبدالمطلب کے دین پر فوت ہوا جو بتوں کی عبادت پر مبنی تھا۔ لیکن اس کے نبی کریم ﷺ کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہونے اور رسول اللہ ﷺ کا دفاع کرنے کی وجہ سے آپ ﷺ قیامت کے دن اس کے عذاب میں تخفیف کی سفارش کریں گے۔ آپ ﷺ اسے جہنم سے نکالنے کی سفارش نہیں کریں گے۔ کیونکہ کافر کا جہنم سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔ لٰہذا وہ ہلکی آگ میں ہوگا یا اس کے

پاؤں کے تلوے کے نیچے آگ کا ایک انگارہ رکھ دیا جائے گا جس سے اس کا دماغ کھولے گا۔ وہ سمجھے گا کہ جہنمیوں میں سے کسی کو اس سے سخت عذاب نہیں ہو رہا۔ حالانکہ اسے سب سے ہلکا عذاب دیا جائے گا۔ یہ سفارش رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے اور صرف ابوطالب کے لیے ہوگی۔ لیکن دوسرے کافروں کے لیے کوئی سفارش نہیں کرے گا اور نہ ہی انہیں کسی کی سفارش فائدہ دے گی۔

مشترکہ شفاعت:

مشترکہ شفاعتوں میں سے ایک وہ ہے جو جہنم میں داخلے کے مستحق کبائر کے مرتکب لوگوں کے بارے میں کی جائے گی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ، تمام انبیاء اور صالحین ان کے بارے میں سفارش کریں گے کہ انہیں جہنم میں داخل نہ کیا جائے۔ یا جب وہ جہنم میں چلے جائیں گے اور انہیں عذاب ہوگا تو ان کو جہنم سے نکالنے کی سفارش کریں گے۔

یہ سفارش نبی کریم ﷺ بھی کریں گے اور دیگر انبیاء و صالحین بھی۔

گویا آپ ﷺ اللہ کے سامنے عاجزی اور دعا کے ساتھ انہیں جہنم سے نکالنے کی سفارش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی سفارش قبول کرلیں گے اور انہیں جہنم سے نکال دیں گے۔ یہ سفارش کبائر کے مرتکب صرف اہل ایمان کے حق میں ہوگی۔

❀❀❀❀❀

فَيَخْرُجُوْنَ بِشَفَاعَتِهِ بَعْدَ مَا احْتَرَقُوْا وَصَارُوْا فَحْمًا وَحِماً (۱) فَيَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِشَفَاعَتِهِ.

ترجمہ......: چنانچہ وہ جل کر راکھ اور کوئلہ ہونے کے بعد آپ ﷺ کی سفارش کی بدولت جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

تشریح......: (۱) خوارج اور معتزلہ اہل کبائر کے حق میں سفارش کی نفی کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ کبیرہ گناہ کے مرتکب پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسے بندوں کو سفارش کوئی

فائدہ نہیں دے گی۔ یہ کہتے ہیں: جو جہنم میں چلا گیا پھر وہ اس سے نہیں نکلے گا۔

یہ باطل نظریہ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اہل توحید اور اہل ایمان میں سے جو کوئی بھی جہنم میں جائے گا وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ جہنم میں ہمیشہ صرف کافر اور مشرک ہی رہیں گے۔

لیکن اہل توحید میں سے گناہ گار اور کبائر کے مرتکب، اگرچہ اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں داخل تو ہوں گے لیکن ہمیشہ اس میں نہیں رہیں گے۔ بلکہ نکال لیے جائیں گے یا تو سفارش کرنے والوں کی سفارش کی وجہ سے، یا پھر ارحم الراحمین کی رحمت کی وجہ سے۔ یا عذاب پورا ہونے کی وجہ سے۔

الغرض وہ جہنم سے اس حالت میں نکلیں گے کہ جل کر کوئلے کی مانند سیاہ ہو چکے ہوں گے۔ پھر انہیں جنت کے دروازے پر ایک نہر یعنی نہر حیات میں ڈال دیا جائے گا، جس سے ان کے جسم اُگ آئیں گے۔ پھر انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے گی۔

❁❁❁❁❁

وَلِسَائِرِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلَائِكَةِ شَفَاعَاتٌ. (۱)

ترجمہ......: نیز تمام انبیاء، اہل ایمان اور فرشتوں کو سفارشوں کا حق ہوگا۔

تشریح......: (۱) ان جیسے لوگوں کے بارے میں (جن کا ذکر ابھی گزرا ہے) تمام انبیاء، اہل ایمان اور فرشتے سفارش کریں گے۔ یہ سفارش رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سب کے لیے مشترکہ ہوگی۔ انبیاء بھی سفارش کریں گے۔ فرشتے، اولیاء اللہ اور صالحین بھی سفارش کریں گے۔ لیکن اس کے لیے دو شرطوں کا پایا جانا ضروری ہوگا۔

(۱)...... سفارش اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوگی۔ (۲)...... جس کے بارے میں سفارش کی جائے وہ اہل توحید میں سے ہو۔ نیز سفارش اللہ تعالیٰ سے طلب کی جاتی ہے مخلوق سے نہیں۔ لہٰذا یوں کہنا چاہیے: اے اللہ! میرے بارے میں اپنے نبی اور مومن بندوں کی سفارش قبول فرما۔ اے اللہ! تو مجھے اپنے پیغمبر ﷺ، اپنے دیگر انبیاء علیہم السلام اور مومن بندوں

کی سفارش سے محروم نہ رکھ۔ الغرض سفارش صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کرنی چاہیے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ جیسا کہ اُس نے فرمایا ہے:

﴿اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ۭ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ؀ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ؀﴾ (الزمر: ٤٣ تا ٤٤)

''یا انھوں نے اللہ کے سوا کچھ سفارشی بنا لیے ہیں۔ کہہ دے! کیا اگرچہ وہ کبھی نہ کسی چیز کے مالک ہوں اور نہ عقل رکھتے ہوں؟ کہہ دے! شفاعت ساری کی ساری اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

لہٰذا جو لوگ قبروں اور مردوں کا رخ کرتے ہیں اور ان سے سفارش کی درخواست کرتے ہیں، ان کا یہ کام بہت بڑا شرک ہے۔ فوت شدگان سے تو سفارش طلب کرنی ہی جائز نہیں البتہ زندہ سے سفارش کی درخواست کی جاسکتی ہے۔ یعنی دعا کروائی جاسکتی ہے کہ وہ آپ کے حق میں اللہ کے حضور دعا کرے۔ زندہ لوگ بھی یہ سفارش یا تو اپنی زندگی میں کر سکتے ہیں یا آخرت میں کریں گے۔ لیکن موت کے بعد فوت شدگان سے نہ تو سفارش کی درخواست کی جاسکتی ہے، نہ دعا کی اور نہ ہی کسی اور چیز کی۔

لہٰذا جو لوگ قبروں کی طرف متوجہ ہو کر مُردوں سے سفارش کی درخواست کرتے، ان سے فریاد کرتے، ان کے لیے جانور ذبح کرتے ہیں، نذریں دیتے اور ان کی مٹی سے برکت حاصل کرتے ہیں، ان کا یہ کام سب سے بڑا شرک ہے جس کا ردّ کرنے کے لیے اللہ کے رسول آئے۔ اور جس کے خاتمے کے لیے جہاد کو مشروع کیا گیا۔

لہٰذا قبروں سے کوئی چیز نہیں مانگنی چاہیے۔ البتہ مومن مردوں کے لیے دعا کرنے کی خاطر اور عبرت حاصل کرنے کے لیے قبروں کی زیارت جائز ہے اور یہی مطلوب ہے۔ قبروں، گنبدوں اور مزاروں کی زیارت جو فوت شدگان سے شفاعت طلب کرنے کے لیے کی

جاتی ہے یا ان سے مدد طلب کرنے کے لیے یا رزق یا مانگنے کے لیے یا اولاد مانگنے کے لیے یا کوئی دکھ تکلیف دور کروانے کے لیے تو یہ سب سے بڑا شرک ہے۔ اور یہ ایسا گناہ ہے جس کی اللہ کے ہاں خالص توبہ کے بغیر بخشش نہیں ہوگی۔ یہی پہلے لوگوں کا شرک تھا کہ جن کی طرف نبی معظم محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۝﴾

(یوسف : ۱۸)

''اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ انھیں نفع دیتی ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

قَالَ تَعَالٰي ﴿وَ لَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ۝﴾ (الانبیاء: ۲۸) (۱) وَلَا تَنْفَعُ الْكَافِرَ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ (۲) وَالْجَنَّةُ وَالنَّارُ مَخْلُوْقَتَانِ وَلَا تَفْنِيَانِ. (۳)

ترجمہ......: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اور نہیں وہ شفاعت کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے۔ اور وہ اسی کے خوف سے ڈرنے والے ہیں۔'' اور کسی بھی کافر کو سفارش کرنے والوں کی سفارش فائدہ نہیں دے گی۔ نیز جنت اور جہنم دونوں مخلوق ہیں لیکن یہ فنا نہیں ہوں گی۔

تشریح......: (۱) یعنی فرشتے صرف اسی کی سفارش کریں گے جس کے لیے اللہ تعالیٰ پسند کریں گے۔ اس آیت مبارکہ میں فرشتوں کی سفارش کا ثبوت ہے۔ اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے ساتھ ہی ہوگی۔ جبکہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند کریں گے

جس کے بارے میں سفارش کی جائے گی۔ اس لیے کہ وہ اہل توحید میں سے ہوگا۔ لیکن کافر سے اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوگا۔

(۲)...... کافر کے لیے کسی کی سفارش مفید نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مومنوں کو بھی تبھی فائدہ دے گی جبکہ ان میں وہ شروط پائی جائیں جو اللہ تعالیٰ نے ذکر کی ہیں۔

(۳)...... یوم قیامت کے افعال میں سے جنت و جہنم کا پیش آنا بھی ہے۔ یہ دونوں باقی رہنے والے گھر ہیں جنت متقی لوگوں کا جبکہ جہنم کافروں کا گھر ہے۔ یہ دونوں مخلوقات اب بھی موجود ہیں۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ انہیں قیامت کے دن پیدا کیا جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ جنت کے متعلق فرماتے ہیں:

﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (آل عمران : ۱۳۳)

''جنت متقین کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

اور جہنم کے بارے میں فرمایا:

﴿أُعِدَّتْ لِلْكَٰفِرِينَ﴾ (البقرہ : ۲٤)

''وہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

''أُعِـــدَّتْ'' کا معنی یہی ہے کہ یہ دونوں مخلوق ہیں اور موجود ہیں۔ اسی طرح فرمان نبوی ﷺ ہے:

((إِنَّ مَا تَجِدُوْنَهُ مِنْ شِدَّةِ الْحَرِّ، وَشِدَّةِ الْبَرْدِ مِنْ أَنْفَاسِ جَهَنَّمَ، فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ.)) [1]

''بے شک جو تم گرمی اور سردی کی شدت محسوس کرتے ہو یہ جہنم کے سانسوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بلاشبہ گرمی کی شدت جہنم کے سانس کی وجہ سے ہے۔''

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں مخلوقات موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جہنم

---

[1] امام احمد نے ایسی ہی حدیث اپنی مسند میں بیان فرمائی ہے (۱۸۹/۱۲)، (۷۲۴۷)، بخاری (۵۳۷)، مسلم (۶۱۷)، راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

کے دو سانس بنائے ہیں۔ وہ ایک سانس سردی میں لیتی ہے۔ لوگوں کو جو سردی کی شدت محسوس ہوتی ہے وہ اسی وجہ سے ہوتی ہے اور ایک سانس گرمی میں لیتی ہے۔ لوگوں کو شدید گرمی اس وجہ سے محسوس ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ اچانک صحابہ نے ایک آواز سنی یعنی کسی چیز کے گرنے کی آواز۔ پیغمبر گرامی ﷺ نے فرمایا:

((أَتَـدْرُوْنَ مَـا هٰذَا؟ قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ، قَالَ: إِنَّهَا لَحَجَرٌ رُمِـيَ بِـهِ مِنْ شَفِيْرِ جَهَنَّمَ مُنْذُ سَبْعِيْنَ خَرِيْفًا ، فَالْآنَ وَصَلَ إِلَى قَعْرِهَا .))

''کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ''اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ تو سرور کونین ﷺ نے فرمایا: یہ ایک پتھر ہے جو جہنم کی منڈیر سے ستر سال پہلے پھینکا گیا تھا۔ وہ اب اس کی تہہ تک پہنچا ہے۔'' [1]

چنانچہ یہ حدیث بھی جہنم کے موجود ہونے کی دلیل ہے۔ اسی طرح جنت بھی موجود ہے۔ بے شک جب میّت کو اس کی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اس کے پاس یا تو جنت کی نعمتیں آتی ہیں یا جہنم کا عذاب آتا ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں موجود ہیں اور میّت کے لیے یا تو جنت کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے یا جہنم کا۔ یہ بھی ان کے وجود کی دلیل ہے لہٰذا اس پر ایمان لانا واجب ہے کہ یہ دونوں اب بھی موجود ہیں۔ اور یہ قول باطل ہے کہ انہیں قیامت کے دن پیدا کیا جائے گا۔

مزید برآں جنت و جہنم کبھی فنا نہیں ہوں گی۔ یہ دونوں ماضی میں بھی موجود تھیں اور ان کا وجود ابد تک رہے گا۔ ان میں جانے والے ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اہل جنت ہمیشہ جنت میں اور اہل جہنم جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

[1] مسند احمد (١٤/٤٣٣) (٨٨٣٩)، مسلم (٢٨٤٤/ ٣١)، ابن حبان (٧٤٦٩) راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

فَالْجَنَّةُ مَأْوَى أَوْلِيَائِهِ وَالنَّارُ عِقَابٌ لِأَعْدَائِهِ (۱) وَأَهْلُ الْجَنَّةِ فِيهَا يَخْلُدُونَ، وَالْمُجْرِمُونَ ﴿إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ۝﴾ (الزخرف: ۷٤تا۷٥) (۲) وَيُؤْتَى بِالْمَوْتِ فِي صُورَةِ كَبْشٍ أَمْلَحِ، فَيُذْبَحُ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ (۳) ثُمَّ يُقَالُ: ''يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ خُلُودٌ بِلَامَوْتٍ، وَيَا أَهْلَ النَّارِ خُلُودٌ بِلَامَوْتٍ.'' [1]

ترجمہ......: جنت اس کے دوستوں کا ٹھکانہ اور جہنم اس کے دشمنوں کے لیے سزا ہوگی۔ جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ (بے شک مجرم لوگ جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ وہ ان سے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور وہ اسی میں ناامید ہوں گے۔) اور موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں لاکر جنت اور جہنم کے درمیان ذبح کردیا جائے گا۔ پھر ارشاد ہوگا: ''اے اہل جنت! تم موت کے بغیر ہمیشہ اس میں رہو گے۔ اور اے جہنمیو! تم بھی جہنم میں رہو گے۔ تم کو بھی موت نہیں آئے گی۔''

تشریح......: (۱) جنت باری تعالیٰ کے دوستوں کو انعام میں ملنے والا گھر ہوگا۔ اور دوزخ اس کے دشمنوں کو ان کے کفر کے بدلے میں ملنے والا سزا کا گھر ہوگا۔

(۲)......جہنم کے ہمیشہ باقی رہنے کی ایک دلیل یہ بھی ہے۔

﴿إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝﴾ (الزخرف: ۷٤)

''بے شک مجرم لوگ جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

''الْخُلُود'' سے یہاں مراد ہمیشہ ٹھہرنا ہے جو کبھی ختم نہ ہو۔

﴿لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ۝﴾

''وہ ان سے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور وہ اسی میں ناامید ہوں گے۔''

یعنی وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہوجائیں گے۔

---

[1] مسند احمد (۱۷/ ۱۲۰)، (۱۱۰٦٦)، بخاری (٤۷۳۰)، مسلم (۲۸٤۹)، راوی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ۔

﴿وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ o وَنَادَوْا يَامَالِكُ﴾

''اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ خود ہی ظالم تھے۔ اور وہ پکاریں گے اے مالک!''

مالک جہنم کے داروغے کا نام ہے۔

وہ مالک سے درخواست کریں گے کہ وہ اللہ کے ہاں یہ سفارش کرے کہ وہ ان کی زندگی کا خاتمہ کر دے تاکہ وہ آرام حاصل کر سکیں۔ گویا وہ موت کی تمنا کریں گے اور موت ہی ان کی آرزو ہوگی۔ (اللہ کی پناہ)

جب وہ یہ کہیں گے:

﴿لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾

تو اس کا جواب کیا ہوگا:

﴿قَالَ اِنَّكُمْ مَاكِثُوْنَ﴾ (الزخرف: ۷۴ تا ۷۷)

''وہ کہے گا بے شک تم (یہیں) ٹھہرنے والے ہو۔''

یعنی وہ کہے گا کہ تم ہمیشہ ہمیشہ یہاں رہو گے۔ حتیٰ کہ وہ مایوس ہو جائیں گے۔

(۳)...... جب جنتی جنت میں، اہل دوزخ جہنم میں چلے جائیں گے تو موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں لا کر جنت و جہنم کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا۔ پھر کہا جائے گا: اے اہل جنت! یہ ہمیشہ کی زندگی ہے۔ اس میں موت نہیں۔ اور اے اہل دوزخ! یہ بھی ہمیشہ کی زندگی ہے، اس میں موت نہیں۔

تب جہنمی جہنم سے نکلنے سے مایوس ہو جائیں گے۔ یہاں موت سے مراد ملک الموت نہیں۔ ملک الموت (موت کا فرشتہ) نہ مرے گا اور نہ ہی اسے ذبح کیا جائے گا۔ بلکہ موت کو روزِ قیامت شکل دی جائے گی اور وہ مینڈھے کی صورت میں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ معنوی اور تصوراتی چیزوں کو اجسام عطا کر سکتا ہے اور انہیں ذات بنانے پر قادر ہے۔

❀❀❀❀❀

فصل نہم:

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کے حقوق کا بیان (۱)

(۱) مؤلف رحمہ اللہ نے اس عقیدہ (کی کتاب) کے آغاز میں ایمان باللہ، اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں، یوم آخرت اور تقدیر پر ایمان لانے کے بارے میں گفتگو فرمائی ہے۔اس کے بعد اب نبی اکرم ﷺ، آپ کے صحابہ کرام اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم اجمعین کے حقوق بیان کرنے کے لیے یہ فصل قائم کی ہے تاکہ ہر مسلمان کو ان مسائل کی بصیرت حاصل ہو جائے جن میں خواہش پرست اور بدعتی لوگوں نے صحابہ کرام اور ازواج پیغمبر رضی اللہ عنہم کے حق کے سلسلے میں اختلاف کیا ہے۔ اور تاکہ مسلمان ان گمراہ لوگوں کے خود ساختہ شبہات اور خواہشات سے متاثر نہ ہوں۔

نبی اکرم ﷺ، آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے حقوق کی صراحت کرنے کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ اور آپ ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم اجمعین کے حقوق نبی مکرم ﷺ کے حقوق میں داخل ہیں۔ اصل حق پیغمبر ﷺ کا ہے اور ان دیگر لوگوں کے حقوق آپ ﷺ کے حقوق میں ہی داخل ہیں۔ لہٰذا یہ ایک اہم فصل ہے۔ اس پر توجہ دینا اور اس کے احکام کی معرفت انتہائی اہم ہے۔

علاوہ ازیں مصنف رحمہ اللہ نے اس فصل میں مسلمانوں کے حقوق، کسی گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے مسلمان کی تکفیر نہ کرنے، لوگوں کے بارے میں غلو نہ کرنے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے کسی دلیل کے بغیر کسی کے جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ نہ دینے کا بھی ذکر کیا ہے۔ کیونکہ ان تمام مسائل میں اکثر گمراہ لوگ پڑے ہیں اور انہوں نے حق کی مخالفت کی ہے۔ لہٰذا اہل سنت والجماعت سلفی اہل حق پر واجب ہے کہ انہیں بیان کریں اور ان کی وضاحت کریں۔

وَمُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ. (۱)

ترجمہ......: اور محمد رسول اللہ ﷺ آخری نبی ہیں۔

تشریح......: (۱) محمد ﷺ خاتم النّبیین ہیں۔ آپ کے بعد تا قیام قیامت کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ (الاحزاب: ٤٠)

''محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں اور لیکن وہ اللہ کا رسول اور تمام نبیوں کا ختم کرنے والا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

خاتم سے مراد وہ ذات گرامی ہے جس کے بعد کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔ لیکن اس کی شریعت تا قیام قیامت باقی رہے گی۔ یہ شریعت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی صورت میں ہمارے پاس ایسی کامل شکل میں موجود ہے گویا کہ پیغمبر ﷺ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نئے نبی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ انبیاء کو اس وقت بھیجا جاتا تھا جب رسالت کے آثار مٹ جاتے تھے۔ گذشتہ امتوں میں جہالت عام ہو جاتی تھی تو ہر نبی کے بعد ایک نیا نبی آ کر دین کی تجدید کرتا تھا۔

جب رسول اللہ ﷺ یہ کامل، تغیر و تبدل سے محفوظ اور قیامت تک انسانوں کی ضروریات کو پورا کرنے والی شریعت لے کر آئے تو گویا آپ ﷺ زندہ ہی ہیں۔ لہٰذا لوگوں کے لیے ایک نئے رسول کی بعثت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِي: كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِي.))

''میں تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ ان میں سے ایک اللہ کی

کتاب اور دوسری میری سنت ہے۔“ ❶

لٰہذا رسالت کا سلسلہ آپ ﷺ پر ختم کر دیا گیا۔ آپ ﷺ کی رسالت و شریعت قیامت تک باقی اور قائم رہے گی۔ البتہ آپ کے بعد دین کی تجدید کرنے والے اہل علم آتے رہیں گے جو لوگوں کے سامنے شریعت کی وضاحت کرتے رہیں گے اور لوگوں کو ان چیزوں کی تعلیم دیتے رہیں گے جن سے لوگ جاہل ہوں گے۔ جیسا کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا .)) ❷

”بے شک اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر صدی کے آغاز میں ایک ایسے شخص کو کھڑا کرتے رہیں گے جو اس کے دین کی تجدید کرے گا۔“

نیز فرمایا:

((إِنَّمَا الْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ .)) ❸

”بے شک صرف علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں۔“

چنانچہ اس امت کے علماء شریعت کی وضاحت و بیان اور لوگوں کی رہنمائی کرنے میں رسول اللہ ﷺ کے قائم مقام ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور یہی قرآن میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾

”وہ اللہ کا رسول اور تمام نبیوں کا ختم کرنے والا ہے۔“

---

❶ ابن عبدالبر نے استذکار (۹/۵۵۶) اور حاکم نے مستدرک (۱۷۲/۱) (۳۱۹) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے۔ ایسی ہی حدیث حاکم نے حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی بیان کی ہے۔

❷ أخرجه أبوداؤد (٤٢٩١) من حديث أبي هريرة، وإسناده صحيح، وانظر: جامع الأصول ((١١/ ٣٢٠ـ ٣٢٤)

❸ أحمد في المسند (٥/ ٣٦٦ـ٤٥ـ٤٦) (٢١٧١٥)، وأبوداؤد (٣٦٤١)، وابن ماجه (٢٢٣)، والترمذي (٢٢١٩)، وهو حديث صحيح.

اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد پاک ہے:

((إِنَّهٗ سَيَأْتِي بَعْدِي كَذَّابُوْنَ ثَلاثُوْنَ كُلُّهُمْ يَدَّعِي أَنَّهٗ نَبِيٌّ، وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ، لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ .))

''بے شک عنقریب میرے بعد ۳۰ دجال آئیں گے۔ ان میں سے ہر ایک نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ حالانکہ میں آخری نبی ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔'' ❶

چنانچہ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی نبی آئے گا وہ کافر ہے۔ کیونکہ وہ اللہ و رسول کی بات کو جھٹلاتا ہے اور مسلمانوں کے اجماع کی مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی لیے اہل علم نے رسول اللہ ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے ہر شخص پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔ مثلاً مسیلمہ کذاب، اسود عنسی اور ان کے بعد بھی جو کوئی نبوت کا دعویٰ کرے گا وہ بھی کافر ہے۔

اسی طرح علماء نے قادیانیوں کو بھی کافر قرار دیا ہے جو پاکستان میں ہیں اور غلام احمد قادیانی کی نبوت کے قائل ہیں۔ یہ سب کافر اور ملت اسلامیہ سے خارج ہیں۔ کیونکہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ رسول اللہ کے بعد بھی کوئی رسول مبعوث ہوسکتا ہے۔ قادیانی غلام احمد کی طرف نسبت کرکے ہی اپنے آپ کو قادیانی کہلاتے ہیں۔

ہر مسلمان پر یہ عقیدہ رکھنا واجب ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ خاتم النّبیین ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اور جو کوئی آپؐ کے بعد دعویٰ نبوت کرے وہ جھوٹا ہے۔

جہاں تک آخری زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کی بات ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ہی شریعت لے کر آئیں گے۔ محمد ﷺ کے پیروکار ہوں گے اور آپ کی شریعت کے مطابق فیصلے کریں گے۔ اس کے علاوہ کوئی شریعت نہیں لائیں گے۔

---

❶ یہ حضرت ثوبان کی صحیح حدیث کا ٹکڑا ہے جو کہ مسند احمد (۳۷/۷۹ـ۷۸) (۲۲۳۹۵)، ابوداؤد (۴۲۵۲) اور ترمذی (۲۲۱۹) میں ہے۔

لہٰذا ان کو مجددین میں سے ہی شمار کیا جائے گا اور آپ ؐ کا پیروکار ہی سمجھا جائے گا۔

لہٰذا آخری زمانے میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کا آپ ؐ کے فرمان "أنا خاتم النبیین" کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں اور نہ ہی یہ اس آیت کے مخالف ہے۔

﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ (الاحزاب : ٤٠)

❀❀❀❀❀

وَسَیِّدُ الْمُرْسَلِیْن. (١)

ترجمہ......: اور رسولوں کے سردار ہیں۔

تشریح......: (١) محمد ﷺ تمام رسولوں کے سردار اور ان سب سے افضل ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ وَلَا فَخْرَ .)) ❶

''میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں اور یہ اظہار فخر نہیں۔''

اور اس فضیلت کا سبب یہ ہے کہ آپ سے پہلے ہر نبی کو صرف اس کی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ جبکہ آپ کو تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے اور آپ ﷺ نے معراج کی رات تمام انبیاء کو مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھائی۔ آپ کو تمام آسمانوں سے اوپر لے جایا گیا اور یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں پہنچا۔ لہٰذا آپ مطلق طور پر تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض انبیاء بعض انبیاء سے افضل ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ

---

❶ یہ حدیث صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مسند احمد (١٠/١٧) (١٠٩٨٧)، ابن ماجہ (٤٣٠٨) اور ترمذی (٣١٤٨)، (٣٦١٥) میں موجود ہے۔

مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ۝﴾

(البقرہ: ۲۵۳)

''یہ رسول، ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور ان کے بعض کو اس نے درجوں میں بلند کیا۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو واضح نشانیاں دیں اور اسے پاک روح کے ساتھ قوت بخشی۔ اور اگر اللہ چاہتا تو جو لوگ ان کے بعد تھے آپس میں نہ لڑتے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آ چکیں۔ لیکن انھوں نے اختلاف کیا۔ تو ان میں سے کوئی تو وہ تھا جو ایمان لایا اور ان سے کوئی وہ تھا جس نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے۔ اور لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

لیکن ہمارے لیے اس پیغمبر کو ناقص سمجھنا یا ناقص ثابت کرنے کے لیے یہ بحث کرنا جائز نہیں جس پر کسی پیغمبر کو فضیلت دی گئی ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کام سے منع فرمایا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:

((لَا تُفَاضِلُوْا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ .))

''تم انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو۔'' [1]

نیز فرمایا:

((لَا تُفَضِّلُوْنِي عَلٰى يُوْنَسَ بْنِ مَتَّى .))

''تم مجھے یونس بن متی پر فضیلت نہ دو۔'' [2]

لہٰذا مفضول انبیاء کی تنقیص جائز نہیں کیونکہ انبیاء کا اللہ کے ہاں ایک خاص مقام و مرتبہ

[1] یہ حدیث مسند احمد (۱۷/۴۵۹) (۱۱۳۶۵)، بخاری (۲۴۱۲) اور مسلم (۲۳۷۴)، میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

[2] بخاری (۳۴۱۶)۔ مسلم (۲۳۷۷).

ہے اور ان میں سے ایک کے دوسرے سے افضل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ مفضول ناقص ہے۔ بلکہ تمام انبیاء کرام کا اللہ کے ہاں وہ مقام ہے کہ کوئی دوسرا اس تک نہیں پہنچ سکتا۔

❀❀❀❀❀

لَا يَصِحُّ اِيْمَانُ عَبْدٍ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِرِسَالَتِهٖ (١) وَيَشْهَدُ بِنُبُوَّتِهٖ. (٢)

ترجمہ……: جب تک کوئی شخص آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان نہ لائے اور آپ ﷺ کی نبوت کی گواہی نہ دے وہ مومن نہیں ہوسکتا۔‘‘

تشریح……: (١) جب تک کوئی شخص آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کا اقرار نہ کرلے اس کا ایمان صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی بھی تردید ہے جو محمد ﷺ کی رسالت یا آپ ؐ کی رسالت کی عمومیت کا انکار کرنے کے باوجود بزعم خویش خود کو مومن اور انبیاء کے پیروکار سمجھتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں: محمد ﷺ نبی تو ہیں لیکن صرف عربوں کے۔ گویا وہ آپ کی رسالت کے عام ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ یہ اللہ کے ساتھ کھلا کفر ہے۔

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝﴾

(النساء: ٦٥)

’’پس نہیں! تیرے رب کی قسم ہے! وہ مومن نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ تجھے اس میں فیصلہ کرنے والا مان لیں جو ان کے درمیان جھگڑا پڑ جائے۔ پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی محسوس نہ کریں جو تو فیصلہ کرے۔ اور تسلیم کرلیں، پوری طرح تسلیم کرنا۔‘‘

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ (النساء: ٦٥)

’’اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے

والا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

سو جو شخص محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان نہیں لاتا وہ کافر ہے۔ خواہ وہ یہود و نصاریٰ کی طرح عیسیٰ یا موسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانے کا دعویدار ہو۔ اور اس میں ان لوگوں کی بھی تردید ہے جو تینوں ادیان کو قریب لانا چاہتے اور وحدت ادیان چاہتے ہیں۔ وہ وحدت ادیان کے پرچارک ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ تینوں ہی مبنی برحق ہیں۔ جبکہ اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾

''کہہ دے اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔''

لہٰذا ان کی یہ بات درست نہیں۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرما کر سب لوگوں کو آپ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔

﴿الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ (الاعراف: ۱۵۸)

''وہ (اللہ) کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اس کی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ پس تم اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر ایمان لاؤ۔ جو اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔''

نبی اکرم محمد ﷺ کی بعثت کے بعد آپ کی اتباع کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔ چنانچہ جو شخص آپ ﷺ کی مخالفت کرنے کے باوجود یہ سمجھتا ہے کہ وہ یہودیوں یا عیسائیوں کے دین پر برقرار ہے، وہ اللہ کے ساتھ کفر کرتا ہے۔ تاآنکہ محمد ﷺ کو تمام لوگوں کا رسول نہ مانے محض آپ کی رسالت کو مان لینا کافی نہیں۔ بلکہ آپ کو تمام لوگوں کا رسول ماننا ضروری ہے۔

(۲)...... گویا آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی لا الہ الا اللہ کی گواہی کے بعد آتی ہے۔ ان دونوں میں سے ایک گواہی دوسری کے بغیر درست نہیں ہوسکتی۔

وَلَا يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ فِيْ يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِلَّا بِشَفَاعَتِهِ (۱) وَلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ أُمَّةٌ إِلَّا بَعْدَ دُخُوْلِ اُمَّتِهِ (۲) صَاحِبُ لِوَاءِ الْحَمْدِ. (۳)

ترجمہ......: قیامت کے دن آپؐ کی سفارش کے بغیر لوگوں کو فیصلہ نہیں سنایا جائے گا۔ کوئی امت آپؐ کی امت سے پہلے جنت میں داخل نہیں ہوگی اور آپ ﷺ کے پاس حمد کا جھنڈا ہوگا۔

تشریح......: (۱) یہ باتیں آپ کے فضائل میں سے ہیں کہ: (۱)...... آپؐ کی بعثت کے بعد کوئی شخص آپؐ پر ایمان لائے بغیر اور آپؐ کی عام رسالت کا اقرار کیے بغیر مومن نہیں ہوسکتا۔ (۲)...... قیامت کے دن بندوں کے درمیان فیصلہ آپ ﷺ کی سفارش کے بغیر نہیں ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ جب میدان حشر میں کھڑے بہت عرصہ گزر جائے گا تو لوگ سفارش کے لیے انبیاء کے پاس جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ کردیں اور وہ اتنے لمبے قیام سے راحت پاسکیں۔ چنانچہ پہلے وہ آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ پھر نوح، پھر ابراہیم، پھر موسیٰ، پھر عیسیٰ علیہم السلام کے پاس آئیں گے۔ لیکن یہ سب پیغمبر معذرت کرلیں گے۔ پھر سب لوگ محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں گے۔ چنانچہ آپؐ سفارش کردیں گے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہار عاجزی اور دعا کرتے رہیں گے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کی سفارش کو قبول فرما کر لوگوں کا فیصلہ کردیں گے۔

لہٰذا شفاعت عظمیٰ آپ کے فضائل میں سے ہے اور مقام محمود بھی۔ یعنی جس پر تمام پہلے اور بعد والے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

(۲)...... امت محمدیہ اگرچہ سب سے آخر میں آئی ہے لیکن یہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگی۔ کوئی امت آپ ﷺ کی سفارش کے بغیر جنت میں نہیں جاسکے گی۔ آپ ﷺ ہی جنت کا دروازہ کھولیں گے اور جنت میں داخل ہونے والی سب سے پہلی امت یہی ہوگی۔

(۳)...... ''لواء'' اس علامت یا جھنڈے کو کہتے ہیں جسے امیر لشکر اختیار کرتا ہے تاکہ

اس کے پیروکار اس علامت پر جمع ہو جائیں۔ قیامت کے دن جھنڈا رسالت مآب نبی آخر الزمان محمد بن عبداللہ ﷺ کے پاس ہوگا۔ باقی تمام رسول آپ کے جھنڈے تلے ہوں گے۔ یہ آپؐ کی فضیلت کا اظہار ہوگا۔

❁❁❁❁❁

وَالْمَقَامُ الْمَحْمُوْدُ (۱) وَالْحَوْضُ الْمَوْرُوْدُ (۲) وَهُوَ إِمَامُ النَّبِيِّيْنَ وَخَطِيْبُهُمْ (۳) وَصَاحِبُ شِفَاعَتِهِمْ (۴).

ترجمہ……: آپ ﷺ مقام محمود پر فائز ہوں گے۔ اس حوض کے مالک ہوں گے جس پر تمام لوگ پانی پینے آئیں گے۔ آپ تمام انبیاء کے امام و خطیب ہیں اور ان کی سفارش کرنے والے ہیں۔

تشریح……: (۱)…… مقام محمود کی وضاحت شفاعت عظمیٰ کے بیان میں گزر چکی ہے۔ (۲)…… حوض کی بھی ہم وضاحت کر چکے ہیں۔ (۳)…… آپ تمام انبیاء کے امام ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ نے (معراج) اسراء کی رات ان سب کو نماز پڑھائی تھی۔ اور جب تمام انبیاء اکٹھے ہو کر اللہ تعالیٰ کے پاس جائیں گے تو آپ ﷺ ان کے خطیب ہوں گے۔ (۴)…… اس کے بارے میں گفتگو بھی مقام محمود کی تشریح میں ہو چکی ہے۔

❁❁❁❁❁

فصل ہشتم:

محمد رسول اللہ ﷺ کی امت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق بیان

أُمَّتُهُ خَيْرُ الْأُمَمِ (١) وَأَصْحَابُهُ خَيْرُ أَصْحَابِ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ. (٢)

ترجمہ......: نبی مکرم محمد رسول اللہ ﷺ کی امت تمام امتوں میں سے بہترین اور آپ کے صحابہ تمام انبیاء کے ساتھیوں سے اچھے ہیں۔

تشریح......: (۱) نبی معظم محمد رسول اللہ ﷺ کی امت تمام امتوں میں سے بہترین امت ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرہ: ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمھیں سب سے بہتر امت بنایا، تا کہ تم لوگوں پر شہادت دینے والے بنو اور رسول تم پر شہادت دینے والا بنے۔''

چنانچہ اس امت سے روز قیامت اس بات کی گواہی طلب کی جائے گی: کیا تمام انبیاء نے اپنی اپنی امتوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو امت محمدیہ علی صاحبہا التحیۃ والسلام گواہی دیں گے کہ بلاشبہ تمام رسولوں نے اپنی امتوں تک پیغام خالق پہنچا دیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ انہیں اس بات کا علم کیسے ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے یہ بات کتاب اللہ میں پڑھی ہوگی اور اللہ کی طرف سے نازل کردہ وحی سے جانی ہوگی۔ پھر رسول اللہ ﷺ اس امت کی گواہی دیں گے اور ان کی صفائی پیش کریں گے۔ یہی مطلب ہے اوپر مذکور آیت کا۔

ارشاد پروردگار ہے:

﴿وَ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ۠﴾ (الحج : ۷۸)

''اور اللہ کے بارے میں جہاد کرو جیسا اس کے جہاد کا حق ہے۔ اسی نے تمھیں چنا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی، اپنے باپ ابراہیم کی ملت کے مطابق۔ اسی نے تمھارا نام مسلمین رکھا، اس سے پہلے اور اس (کتاب) میں بھی۔ تاکہ رسول تم پر شہادت دینے والا بنے اور تم لوگوں پر شہادت دینے والے بنو۔ سو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑو۔ وہی تمھارا مالک ہے۔ سو اچھا مالک ہے اور اچھا مددگار ہے۔''

یہ امت محمدیہ علی صاحبہا التحیۃ والسلام کی فضیلت کی اور تمام امتوں کے بارے میں ان کی گواہی کے معتبر ہونے کی دلیل ہے۔ یہ ان کی فضیلت، پاکبازی اور ان کے مومن ہونے کی دلیل ہے۔

ارشاد مالک ارض وسما ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران : ۱۱۰)

''تم سب سے بہتر امت ہو، جو لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

یہ بھی امت محمدیہ علی صاحبہا التحیۃ والسلام کے سب سے بہترین امت ہونے کی اللہ کی طرف سے گواہی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی صفات بھی بیان کی ہیں کہ:

﴿تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

’’تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو۔‘‘

لہٰذا مصنف رحمہ اللہ کا دعویٰ ثابت ہو گیا۔

(۲)......محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین تمام انبیاء کے متبعین میں سے بہترین لوگ ہیں۔

اصحاب: یہ صاحب اور صحابی کی جمع ہے۔ صحابی اس کو کہتے ہیں: جس نے حالت ایمان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی ہو اور حالت ایمان پر ہی اسے موت آئے۔

اس تعریف سے پتہ چلا کہ وہ لوگ صحابی نہیں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ پر ایمان تو لے آئے لیکن آپ کا دیدار نہیں کر سکے۔ مثلاً نجاشی رحمہ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر آپ کے پیروکار بن گئے۔ لیکن چونکہ انہوں نے آپؐ کا دیدار نہیں کیا اس لیے انہیں صحابی نہیں کہا جائے گا بلکہ وہ تابعین میں شمار ہوں گے۔

اسی طرح وہ لوگ بھی صحابی نہیں ہیں جن کی آپؐ سے ملاقات تو ہوئی لیکن وہ آپ پر ایمان نہ لائے۔ اس کی مثال میں وہ تمام کفار پیش کیے جا سکتے ہیں جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا بھی اور آپ کے ساتھ ملاقات بھی ہوئی لیکن آپ پر ایمان نہیں لائے۔ لہٰذا محض رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملاقات ہو جانا کافی نہیں۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بھی از بس ضروری ہے۔

”ومات علی ذلك“ کہنے سے وہ لوگ بھی صحابہ کی صف سے نکل جائیں گے جنہوں نے آپؐ سے ملاقات کی، آپؐ پر ایمان لائے پھر مرتد ہو گئے (یعنی دین اسلام سے پھر گئے) اور ارتداد کی حالت میں ہی انہیں موت آ گئی۔ ان کا وصف صحابیت ختم ہو جاتا ہے اور ان کے تمام اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔ اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝﴾ (البقرہ: ۲۱۷)

''اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے، پھر اس حال میں مرے کہ وہ کافر ہو تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور یہی لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

اسی لیے بعض لوگ جب حوض پر پانی پینے آئیں گے تو انہیں روک لیا جائے گا۔ پیغمبر اسلام ﷺ فرمائیں گے:

((يَا رَبِّ أَصْحَابِيْ أَصْحَابِيْ . فَيُقَالُ لَهُ: إِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَاذَا أَحْدَثُوْا بَعْدَكَ ، إِنَّهُمُ ارْتَدُّوْا بَعْدَكَ عَلَى أَدْبَارِهِمُ الْقَهْقَرَىْ .))❶

اے میرے رب! یہ میرے ساتھی ہیں، یہ میرے ساتھی ہیں۔ تو آپؐ سے کہا جائے گا: آپ نہیں جانتے انہوں نے آپ کے بعد کیا کچھ کیا، یہ آپ کے بعد بلاشبہ الٹے پاؤں (اطنی خرافات وبدعات کی بناء پر کفر کی طرف) واپس لوٹ گئے تھے۔''

چنانچہ جو شخص اسلام سے مرتد ہو جائے اس کی صحبت رسول اور اس کے تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ الا یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آئے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ وہی ہیں جنہوں نے حالت ایمان میں آپؐ سے ملاقات کی اور اپنی وفات تک اسلام پر ثابت قدم رہے۔ یہی وہ صحابہ ہیں جو تمام انبیاء کے ساتھیوں اور متبعین سے بہتر ہیں۔ ان کی یہ فضیلت ان کے پیغمبر محمد ﷺ کی فضیلت اور اس امت کے باقی امتوں پر فضل ہونے کی وجہ سے ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

((خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِيْ ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ .))

''بہترین لوگ میرے ساتھی ہیں پھر وہ جو ان کے متصل بعد آئیں گے پھر وہ جو ان کے متصل بعد آئیں گے۔''❷

اس حدیث میں آپؐ نے اپنے عہد کو بہترین دور شمار فرمایا ہے اور اس لفظ میں تمام پہلے

---

❶ اس حدیث کی تخریج پیچھے گزر چکی ہے۔

❷ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بخاری (۲۶۵۲) اور مسلم (۲۵۳۳) میں مروی ہے۔

اور بعد میں آنے والے شامل ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَأَفْضَلُ أُمَّتِهِ أَبُوْبَكْرٍ الصَّدِيْقُ (رضی اللہ عنہ) . (۱)

ترجمہ......: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سب سے افضل ہیں۔

تشریح......: (۱) ایمان، جہاد، ہجرت اور نصرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مختلف درجات ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولٰٓئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ أَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌo﴾ (الحدید: ۱۰)

''اور تمھیں کیا ہے تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، جب کہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔ تم میں سے جس نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی وہ (یہ عمل بعد میں کرنے والوں کے) برابر نہیں۔ یہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور جنگ کی۔ اور ان سب سے اللہ نے اچھی جزا کا وعدہ کیا ہے اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، خوب باخبر ہے۔''

مذکور بالا اوصاف کی بنیاد پر اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں بھی باہم درجہ بندی ہے لیکن مجموعی اعتبار سے وہ تمام زمانوں کے لوگوں اور تمام امتوں سے افضل ہیں۔

باہم ان کے درجات یوں بنتے ہیں کہ مہاجرین، انصار سے افضل ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ

يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾ (الحشر : ۸)

''(یہ مال) ان محتاج گھر بار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔ وہ اللہ کی طرف سے کچھ فضل اور رضا تلاش کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔''

یہ آیت مبارکہ مہاجرین کے بارے میں ہے۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَّمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الحشر : ۹)

''اور (ان کے لیے) جنھوں نے ان سے پہلے اس گھر میں اور ایمان میں جگہ بنا لی ہے، وہ ان سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کی طرف آئیں۔ اور وہ اپنے سینوں میں اس چیز کی کوئی خواہش نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دی جائے اور اپنے آپ پر ان کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ انھیں سخت حاجت ہو۔ اور جو کوئی اپنے نفس کے حرص سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔''

یہ انصار کے متعلق ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو انصار سے پہلے ذکر کیا جو ان کے افضل ہونے کی دلیل ہے۔ یہ اسلوب قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:

﴿وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

(التوبہ : ۱۰۰)

''اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے سب سے پہلے لوگ اور وہ لوگ جو نیکی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہوگئے۔ اس نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (التوبہ: ۱۱۷)

''بلاشبہ یقیناً اللہ نے نبی پر مہربانی کے ساتھ توجہ فرمائی اور مہاجرین و انصار پر بھی، جو تنگ دستی کی گھڑی میں اس کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد کہ قریب تھا ان میں سے ایک گروہ کے دل ٹیڑھے ہو جائیں۔ پھر وہ ان پر دوبارہ مہربان ہوگیا۔ یقیناً وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

پھر مہاجرین کے بھی باہم مختلف درجات ہیں۔

ان میں سے خلفاء راشدین مطلق طور پر سب سے افضل ہیں۔ اور وہ یہ ہیں: (۱) ابوبکر صدیق (۲) عمر فاروق (۳) عثمان ذوالنورین (۴) علی رضی اللہ عنہم۔ لہٰذا خلفاء راشدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ساتھیوں سے مطلقاً افضل ہیں۔ پھر ان کے بعد ان دس صحابہ کا درجہ آتا ہے جنہیں رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زندگی میں ہی جنت کی بشارت دے دی تھی۔ (انہیں عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے) ان کے نام یہ ہیں:

(۱) ابوبکر (۲) عمر (۳) عثمان (۴) علی (۵) طلحہ (۶) زبیر (۷) سعد بن ابی وقاص (۸) سعید بن زید (۹) عبدالرحمٰن بن عوف (۱۰) ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم۔

پھر جو لوگ پہلے مسلمان ہوئے وہ بعد میں اسلام قبول کرنے والوں سے افضل ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی نص میں ہے۔

﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ لَا یَسْتَوِی مِنْکُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَ كُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ﴾ (الحدید: ۱۰)

''اور تمھیں کیا ہے تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، جب کہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔ تم میں سے جس نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی، وہ (یہ عمل بعد میں کرنے والوں کے) برابر نہیں۔ یہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور جنگ کی۔ اور ان سب سے اللہ نے اچھی جزا کا وعدہ کیا ہے اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، خوب باخبر ہے۔''

پھر ان کے بعد معرکہ بدر میں اور بیعت رضوان میں شامل ہونے والے صحابہ ہیں۔ ان کی فضیلت باقی تمام لوگوں سے بڑھ کر ہے۔ ان کے بہت بڑے فضائل ہیں۔

(۱)...... اسلام میں پہل (۲)...... جہاد اور ہجرت (۳)...... ان میں سے بعض کی رسول گرامی ﷺ نے ایسی خوبیاں بیان کی ہیں جو ان کے علاوہ کسی میں نہیں۔

خلفاء راشدین مطلقاً باقی تمام سے افضل ہیں اور ان کی یہ ترتیب خلافت وفضیلت میں مجموعی اعتبار سے ہے۔ ذیل میں ہم خلافت میں ان کی ترتیب ذکر کرتے ہیں:

خلفاء راشدین میں سب سے بڑھ کر فضیلت سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہے۔ آپ کا نام عبداللہ بن عثمان جبکہ کنیت ابوبکر تھی۔ اسی کے ساتھ آپ مشہور ہیں۔ آپ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ آپ کے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلقات معروف ہی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ ہجرت اور غار ثور میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے آپ رضی اللہ عنہ کو دوران ہجرت اپنی مصاحبت کے لیے منتخب فرمایا۔

﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ

سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ (التوبہ: ٤٠)

''اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو بلاشبہ اللہ نے اس کی مدد کی، جب اسے ان لوگوں نے نکال دیا جنھوں نے کفر کیا، جب کہ وہ دو میں دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے۔ جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر۔ بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو اللہ نے اپنی سکینت اس پر اتار دی اور اسے ان لشکروں کے ساتھ قوت دی جو تم نے نہیں دیکھے اور ان لوگوں کی بات نیچی کر دی جنھوں نے کفر کیا۔ اور اللہ کی بات ہی سب سے اونچی ہے۔ اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صحابی رسول ہونے کی گواہی دی ہے اور سفر ہجرت میں سیّد الانبیاء والرسل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت اختیار کرنے کی۔

ہجرت سے قبل مکہ میں بھی آپ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلقات، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع اور مدد کے لیے آپ رضی اللہ عنہ کا اپنے مال و جان کو لٹا دینا معروف ہے۔

آپ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفروں اور جنگوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے۔

جب وفات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کچھ لوگ اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو گئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے ساتھ جنگ کی حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ رضی اللہ عنہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو مضبوط کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے بہت سے فضائل ہیں۔ نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم آپ رضی اللہ عنہ سے شدید محبت کرتے تھے اور آپ رضی اللہ عنہ کی تعریف کیا کرتے تھے۔

❀❀❀❀❀

ثُمَّ الْفَارُوْقُ (١) ثُمَّ عُثْمَانُ ذُوالنُّوْرَيْنِ ثُمَّ عَلِيُّ الْمُرْتَضٰى رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ. (٢)

ترجمہ......: پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا، اس کے بعد عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا اور پھر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا مقام ہے۔

تشریح……: دوسرے خلیفہ راشد جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ: آپ کا مکمل نام عمر بن خطاب بن عمرو بن عدی بن نفیل العدوی ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد آپ کا رتبہ دوسرے نمبر پر ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فاروق کا نام دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے حق و باطل کے فرق کو واضح کر دیا۔ چنانچہ مسلمان مکہ میں کمزور تھے اور کفار انہیں ڈراتے دھمکاتے تھے۔ لیکن جب عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوگئے تو آپ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غالب کیا اور آپ کی قوت و بہادری اور ہیبت کی وجہ سے مسلمان مضبوط ہوگئے۔ آپ ابوبکر رضی اللہ عنہما کے بعد دوسرے خلیفہ بنے اور یہ ذمہ داری خود ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں سونپی تھی۔

عثمان ذوالنورین:

سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا مقام ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے دو مرتبہ ہجرت کی۔ پہلی دفعہ حبشہ کی طرف پھر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ آپ پہلے پہل اسلام قبول کرنے والوں میں سے ہیں۔ آپ کو ذوالنورین اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو بیٹیوں رقیہ اور اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہما کی شادی یکے بعد دیگرے جناب عثمان رضی اللہ عنہ سے کی تھی اور فرمایا تھا:

((لَوْ كَانَتْ عِنْدِيْ ثَالِثَةٌ لَزَوَّجْتُكَ إِيَّاهَا .))

''اگر میرے پاس تیسری بیٹی بھی ہوتی تو میں آپ کے ساتھ اس کی بھی شادی کر دیتا۔'' [1]

آپ ہر قسم کا مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے (غزوہ تبوک کے لیے) جیش العسرہ کو سامان دیا اور جناب خلیفہ راشد عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد کسی کو خلیفہ بنانے کے لیے جن حضرت کو شوریٰ کے لیے مقرر کیا انہوں نے بالاتفاق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا۔ یہ آپ رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی دلیل ہے۔ آپ کے اور بھی بہت سے فضائل ہیں۔ مثلاً مصحف کو ایک ہی طریقے پر لکھوانا۔

[1] ابن عساکر نے تاریخ دمشق (۳۹/۴۳۔۴۵) میں اسے کئی موصول اور مرسل سندوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔

جب مسلمانوں نے بہت سے علاقے فتح کر لیے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دور دراز کے ملکوں تک پھیل گئے، قراء کرام کی کثرت ہوگئی اور ان کے درمیان قراءات کا اختلاف پیدا ہوگیا تو آپ نے مختلف قراءات کو ایک حرف پر جمع کر دیا اور مشہور مصحف عثمانی لکھوا کر اسے مختلف شہروں میں بھیج دیا۔ چنانچہ آپ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم کے بارے میں پیدا ہونے والے فتنے کو ختم کر دیا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی کتاب کی حفاظت کا مظہر تھا۔ جیسا کہ اللہ ذوالجلال نے فرمایا ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الحجر: ۹)

''بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔''

گویا اس خلیفہ راشد کے فضائل میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ اس نے یہ عظیم کام سر انجام دیا۔ مصحف عثمانی کے ذکر کے ساتھ ہی آپ کا ذکر جمیل بھی ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

آپ رضی اللہ عنہ پر ظلم کرتے ہوئے آپ کو شہید کر دیا گیا اور اس بات کی پیشین گوئی رسول اللہ ﷺ پہلے ہی کر چکے تھے اور آپ رضی اللہ عنہ کو اس مصیبت کے پہنچنے پر جنت کی خوشخبری بھی سنا چکے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوگئی۔ چوتھے خلیفہ راشد سیّدنا علی بن ابوطالب رضی اللہ عنہ پھر عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت آئی اور علی رضی اللہ عنہ چوتھے خلیفہ بنے۔ آپ رضی اللہ عنہ نبی مکرم ﷺ کے چچا زاد بھائی، نبیؐ کی بیٹی سیّدہ فاطمہ الزہراء کے شوہر، نبیؐ کے نواسوں اور جنت میں نوجوانوں کے سرداروں حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے والد ماجد تھے۔ آپ کا جہاد، بہادری، علم اور عبادت و زہد معروف ہے۔

ان چاروں کو خلفائے راشدین کہا جاتا ہے۔

❀❀❀❀❀

لِمَا رَوَی عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: ((کُنَّا نَقُوْلُ۔ وَالنَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم حَیٌّ، أَفْضَلُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّنَا اَبُوْبَكْرٍ، ثُمَّ عُمَرُ، ثُمَّ عُثْمَانَ، فَيَبْلُغُ ذَالِكَ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَلَا يُنْكِرُهُ.)) ❶ (۱) وَصَحَّتِ الرِّوَايَةُ عَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ أَنَّهُ قَالَ ((خَيْرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّهَا اَبُوْبَكْرٍ ثُمَّ عُمَرُ، وَلَوْ شِئْتُ لَسَمَّيْتُ الثَّالِثَ))❷ (۲)

ترجمہ......: اس کی دلیل جناب عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ’’ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی یہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے نبی کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابوبکر ہیں، پھر عمر، پھر عثمان رضی اللہ عنہم۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ردّ نہیں کرتے تھے۔‘‘ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ ’’نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کا بہترین شخص ابوبکر ہے پھر عمر رضی اللہ عنہما اور اگر میں چاہوں تو تیسرے کا بھی نام بتادوں۔‘‘

تشریح......: (۱) یہ حدیث ان کی فضیلت میں مذکور بالا ترتیب پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی سب سے افضل ابوبکر ہیں۔ پھر عمر، پھر عثمان، پھر علی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ کیونکہ صحابہ کرام واضح طور پر یہ بات کہا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اس بات کی تردید نہیں کرتے تھے۔

(۲)...... دیکھیں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ گواہی دی ہے کہ اس امت میں سب سے افضل ابوبکر ہیں، پھر عمر رضی اللہ عنہما۔ تیسرے شخص کے بارے میں آپ رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت عثمان ہیں رضی اللہ عنہ۔ جب کہ دوسرے قول کے مطابق اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

❀❀❀❀❀

---

❶ صحیح بخاری (٣٦٩٨)۔ ابوداؤد (٤٦٢٧) (٤٦٢٨)۔ ترمذی (٣٧٠٧).

❷ معجم الأوسط للطبرانی (٢٣٩/٧) (٧٣٨٢)

وَرَوَی اَبُـو الدَّرُدَاءِ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ أَنَّـهُ قَالَ: ((مَـا طَلَعَتِ الشَّمْسُ، وَلَا غَـرُبَـتْ بَعْدَ النَّبِیّیْنَ وَالْمُرْسَلِیْنَ عَلَی أَفْضَلَ مِنْ أَبِیْ بَکْرٍ.))❶ (۱) وَهُـوَ أَحَـقُّ خَـلْـقَ الـلّٰهِ تَعَالَی بِالْخِلَافَةِ بَعْدَ النَّبِیِّ ﷺ (۲) لِـفَـضْلِهِ وَسَابِقَتِهِ وَتَقْدِیْمِ النَّبِیِّ ﷺ لَهُ فِی الصَّلَاةِ عَلَی جَمِیْعِ الصَّحَابَةِ رضی اللہ عنہم. (۳)

ترجمہ......: حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''انبیاء و رسل کے بعد سورج ابوبکر سے بڑھ کر فضیلت والے کسی شخص پر طلوع یا غروب نہیں ہوا۔'' آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلافت کے مخلوق الٰہی میں سے سب سے زیادہ حقدار تھے۔ کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ سب سے افضل، سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے شخص تھے۔ آپ ﷺ نے نماز پڑھانے کے لیے جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تمام صحابہ سے مقدم کیا۔

تشریح......: (۱) یہ رسول اللہ ﷺ کی گواہی ہے کے لیل ونہار نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے افضل کوئی شخص نہیں دیکھا۔

(۲)...... یہ خلافت میں خلفائے راشدین کی ترتیب ہے۔ چنانچہ اللہ کی تمام مخلوقات میں خلافت کے سب سے زیادہ حقدار ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں کیونکہ:

(۱)...... آپ رضی اللہ عنہ مطلقاً تمام صحابہ سے افضل ہیں۔

(۲)...... جب رسول اللہ ﷺ بیمار ہوئے تو آپ رضی اللہ عنہ کو ہی مسلمانوں کی امامت کے لیے منتخب کیا اور فرمایا: ''ابوبکر کو (میرا) حکم دو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔''❷

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا آپ کو لوگوں کی امامت کے لیے منتخب فرمانا اور آپ کا محراب رسول اللہ ﷺ میں کھڑا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ ہی خلافت کے سب سے زیادہ حقدار تھے۔ یہ گویا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اپنے بعد آپ رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف اشارہ تھا۔ لہٰذا جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی بیعت کرنے کا ارادہ کیا تو کہنے لگے:

---

❶ یہ حدیث عبد بن حمید نے اپنی مسند میں حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے۔ (۲۱۲)

❷ یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بخاری (۷۱۳) اور مسلم (۴۱۸/۹۴) میں مروی ہے۔

''کیا رسول اللہ ﷺ آپ کو ہمارے دین کے لیے تو پسند فرمائیں مگر ہم آپ کو اپنی دنیا کے لیے پسند نہیں کریں گے؟''

اسی بناء پر انہوں نے آپ کو خلافت کے لیے مقدم کیا اور آپ مسلمانوں کے بالاجماع خلیفہ بنے۔

(۳)...... سادا تنا ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم سمیت تمام جلیل القدر صحابہ موجود تھے لیکن سیّد المرسلین ﷺ نے پوری وضاحت کے ساتھ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آگے کرنے کا حکم دیا۔ اور جب آپ ﷺ کو اس ضمن میں کوئی اور مشورہ دیا گیا تو آپ ﷺ نے امامت نماز کے لیے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آگے بڑھانے پر ہی اصرار کیا۔

❀❀❀❀❀

وَإِجْمَاعُ الصَّحَابَةِ عَلٰى تَقْدِيمِهِ وَمُبَايَعَتِهِ (۱) وَلَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَجْمَعَهُمْ عَلٰى ضَلَالَةٍ (۲) ثُمَّ بَعْدَهُ عُمَرُ رضی اللہ عنہ (۳) لِفَضْلِهِ وَعَهْدِ أَبِي بَكْرٍ رضی اللہ عنہ إِلَيْهِ، ثُمَّ عُثْمَانُ رضی اللہ عنہ لِتَقْدِيمِ أَهْلِ الشُّوْرٰى لَهُ. (۴)

ترجمہ......: آپ کو مقدم کرنے اور آپ کی بیعت کرنے پر تمام صحابہ کا اجماع ہے۔ اگر یہ گمراہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انہیں اس پر جمع نہ کرتا۔ پھر ان کے بعد عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کی فضیلت کی وجہ سے سونپی تھی۔ پھر عثمان رضی اللہ عنہ اہل شوریٰ کے بنانے سے خلیفہ بنے۔

تشریح......: (۱) وفات پیغمبر ﷺ کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ کے دن تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، جن میں مہاجرین و انصار سبھی شامل تھے نے بالاتفاق سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا اور آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔

(۲)...... تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گمراہی پر اکٹھے نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ صحیح حدیث میں ہے:

((لَا تَجْتَمِعُ أُمَّتِي عَلٰى ضَلَالَةٍ .))

''میری امت گمراہی پر اکٹھی نہیں ہوسکتی۔''❶

ابتداءً کچھ اختلاف ہوا۔ پھر تمام صحابہ نے آپس میں مشورہ کیا تو اختلاف ختم ہوگیا اور انہوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اجماع کرلیا۔

(۳)...... ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے اور یہ ذمہ داری آپ رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سونپی تھی۔ چنانچہ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ فوت ہونے والے تھے تو آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنایا اور جب خلیفہ اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد کردے تو اس کی خلافت متعین ہوجاتی ہے۔ جیسا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی معروف فضیلت، قبولِ اسلام میں پہل، آپ رضی اللہ عنہ کی قوت ورعب اور اس بات کے پیش نظر آپ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنادیا کہ آپ اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈرتے تھے۔ پھر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ کو ہی مقدم کیا۔

(۴)...... تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ اس مجلس شوریٰ کے اجماع کی بنیاد پر خلیفہ مقرر ہوئے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفۃ المسلمین کے انتخاب کے لیے قائم کی تھی۔ اس کے چھ ارکان تھے: سادا تنا عثمان، علی، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ، زبیر اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم اجمعین۔ ان تمام لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بالاتفاق منتخب کرلیا اور مسلمانوں نے آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی۔

❀❀❀❀❀

ثُمَّ عَلِيٌّ رضي الله عنه لِفَضْلِهِ وَإِجْمَاعِ أَهْلِ عَصْرِهِ عَلَيْهِ. (۱)

ترجمہ......: پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کی فضیلت اور آپ رضی اللہ عنہ پر آپ کے زمانہ کے تمام مسلمانوں کے اجماع کی وجہ سے خلیفہ بنایا گیا۔

---

❶ امام حاکم نے مستدرک (۱/۲۰۲۔۱۹۹) (۳۹۷۔۳۹۱) میں اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے اور پھر اس کے شواہد بھی ذکر کیے ہیں۔ مسند احمد میں ابوبصرہ غفاری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی یہ ہے (۲۰۰/۴۵) (۲۷۲۲۴)۔ كشف الخفاء (۴۷۰/۲) (۲۹۹۹)

تشریح......: (۱) جب ظلم کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا گیا تو تمام مسلمانوں نے سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اتفاق کرلیا۔ کیونکہ گزشتہ تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد آپ ایسا وقت تمام مسلمانوں سے افضل تھے اور آپ خلافت کے حقدار اور اہل بھی تھے۔ لیکن آپ کے زمانے میں مسلمانوں کی صفوں میں چونکہ خواہش پرست اور دشمن لوگ داخل ہوچکے تھے اور مسلمانوں میں پھوٹ پڑ چکی تھی اس لیے آپ کے دور میں فتنوں نے سر اٹھایا۔ جنگیں ہوئیں اور مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔ لیکن آپ رضی اللہ عنہ کے خلیفۃ المسلمین ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔

آپ کے دور میں فتنوں کا پیدا ہونا آپ کی خلافت کا عیب نہیں۔ کیونکہ یہ کام آپ کی خواہش کے خلاف تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ان فتنوں کے خاتمے کے لیے بہت کوشش کی۔ جہاد کیا، خوارج کو تہ تیغ کیا اور اپنی تمام قوتیں صرف کردیں لیکن آپ کا مقصد پورا نہ ہوا۔ جن صحابہ سے آپ رضی اللہ عنہ کی جنگ ہوئی وہ بھی آپ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اختلاف نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ جنگ جمل میں اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر جنگ صفین میں جو لوگ آپ کے خلاف لڑے وہ آپ کی خلافت میں اختلاف نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ آپ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لیں۔

❀❀❀❀❀

وَهٰـؤُلَاءِ الْخُلَفَاءُ الرَّاشِدُوْنَ الْمَهْدِيُّوْنَ الَّذِيْنَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ فِيهِمْ ((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ ، عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ .)) [1] (۱)

ترجمہ......: یہی وہ ہدایت یافتہ خلفاء راشدین ہیں جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم پر میری سنت اور میرے بعد میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنا واجب ہے۔ اپنی داڑھوں کے ساتھ اسے مضبوطی سے (عملاً) پکڑے رکھنا۔''

---

[1] مسند الامام احمد: ۲۸/ ۳۷۵۔ ابوداؤد: ٤٦٠٧.

تشریح……: (۱) مذکورہ حدیث کے مصداق اور خلفاء راشدین یہی چار ہیں: ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم بالترتیب رسالت ماب ﷺ نے انہیں خلفاء بھی کہا اور راشدین (ہدایت یافتہ) بھی کہا اور اپنی سنت کے ساتھ ان کی سنت پر بھی عمل کرنے کا حکم دیا۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ: ((اَلْخِلَافَةُ بَعْدِيْ ثَلَاثُوْنَ سَنَةً .)) ❶ فَكَانَ آخِرُهَا عَلِيٌّ رضی اللہ عنہ (۱) وَنَشْهَدُ لِلْعَشَرَةِ الْمُبَشَّرِيْنَ بِالْجَنَّةِ كَمَا شَهِدَ لَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ ((أَبُوْبَكْرٍ فِي الْجَنَّةِ، وَعُمَرُ فِي الْجَنَّةِ، وَعُثْمَانُ فِي الْجَنَّةِ، وَعَلِيٌّ فِي الْجَنَّةِ، وَطَلْحَةُ فِي الْجَنَّةِ، وَالزُّبَيْرُ فِي الْجَنَّةِ، وَسَعْدٌ فِي الْجَنَّةِ، وَسَعِيْدٌ فِي الْجَنَّةِ، وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ فِي الْجَنَّةِ، وَأَبُوْعُبَيْدَةُ بْنُ الْجَرَّاحِ فِي الْجَنَّةِ .)) ❷ (۲)

ترجمہ……: اور فرمان نبوی ﷺ ہے: ''میرے بعد خلافت تیس سال تک رہے گی'' سو آخری خلیفہ علی رضی اللہ عنہ ہیں اور ہم ان دس صحابہ کے جنتی ہونے کی گواہی دیتے ہیں جن کے جنتی ہونے کی گواہی نبی کریم ﷺ نے دی ہے اور فرمایا: ''ابوبکر جنتی ہے، عمر جنتی ہے، عثمان جنتی ہے، علی جنتی ہے، طلحہ جنتی ہے، زبیر جنتی ہے، سعد جنتی ہے، سعید جنتی ہے، عبدالرحمٰن بن عوف جنتی ہے اور ابوعبیدہ بن جراح جنتی ہے۔'' رضی اللہ عنہم اجمعین

تشریح……: (۱) پیغمبر علیہ السلام نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ آپ ﷺ کے بعد عرصۂ خلافت تیس سال ہوگا اور یہ بات خلفاء اربعہ کی خلافت کے حق میں ثابت ہوچکی ہے کہ وہ تیس سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس کے بعد پھر ملوکیت کا دور شروع ہوگیا تھا اور خلفاء راشدین کے بعد

---

❶ ابوداؤد (٤٦٤٦) (٤٦٤٧)، ترمذی (٢٢٢٥) مسند احمد (٢٤٨/٣٦)، (٢١٩١٩)، یہ حدیث حسن ہے۔

❷ یہ حدیث حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے مروی ہے۔ دیکھئے: مسند احمد (٢٠٩/٣) (١٦٧٥)، ترمذی (٣٧٤٧)۔ اس حدیث کی سند قوی ہے اور مسلم کی شرط پر ہے۔

مسلمان بادشاہوں نے حکومت کی۔ ان میں سب سے عادل سب سے افضل اور سب سے بہتر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ تھے۔

(۲)...... یہ وہ دس خوش بخت صحابہ ہیں جن کے جنتی ہونے کی گواہی دی گئی ہے۔ ان کی گواہی کس ہستی نے دی ہے؟ اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنی خواہش سے نہیں بولتا تھا۔ یہ ان صحابہ کی فضیلت کی دلیل ہے۔ یہ سب قریشی تھے اور سبھی مہاجرین میں سے تھے۔ یہ ایک عظیم امتیاز ہے جو ان کے فضائل میں اضافہ کرتا ہے۔ بلکہ ان کی سب سے بڑی فضیلت یہی ہے۔

ان کے علاوہ بھی پیغمبر علیہ السلام نے بعض صحابہ کو جنت کی ضمانت دی ہے۔ مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عکاشہ بن محصن کے جنتی ہونے کی گواہی دی۔ چنانچہ جب انہوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! صلی اللہ علیہ وسلم ! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ مجھے بھی ان ستر ہزار لوگوں میں سے بنادے جو بلاحساب اور بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو بھی انہی میں سے ہے۔'' ❶

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے بھی جنتی ہونے کی گواہی دی۔ چنانچہ فرمایا:

((اَلْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ .))

''حسن و حسین نوجوان جنتیوں کے سردار ہیں۔'' ❷

اور آپ نے ثابت بن قیس بن شمائل انصاری کو بھی جنت کی ضمانت دی۔ اور فرمایا:

((أَنْتَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ .))

''تو اہل جنت میں سے ہے۔'' ❸

آپ رضی اللہ عنہ یمامہ کی جنگوں میں شہید ہوئے۔

❶ یہ حدیث حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مسند احمد میں منقول ہے (۱۴۳/۳۳) (۱۹۹۱۳) یہ صحیح حدیث ہے۔ اس کی مکمل تخریج مسند احمد میں دیکھیں۔

❷ مسند احمد: ۳۱/۱۷۔ اسنادہ صحیح رواہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ.

❸ صحیح مسلم: ۱۱۹۔ عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ.

وَكُلُّ مَنْ شَهِدَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ بِالْجَنَّةِ شَهِدْنَا لَهُ بِهَا، كَقَوْلِهِ: اَلْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ. ❶ وَقَوْلِهِ لِثَابِتِ بْنِ قَيْسٍ: إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ. ❷ وَلَا نُنَزِّلُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ جَنَّةً وَّلَا نَارًا. (۱)

ترجمہ......: اور ہر وہ شخص کہ جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے جنت کی گواہی دی ہے ہم بھی اس کے جنتی ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا ساداتنا حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے بارے میں ارشاد ہے: ''حسن وحسین ابناء علی رضی اللہ عنہم جنت کے نوجوانوں کے سردار ہوں گے۔'' اور آپؐ کا جناب ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمان ہے: ''بلاشبہ وہ جنتی ہیں۔'' اور ہم اہل قبلہ میں سے کسی کو جنتی یا جہنمی قرار نہیں دیتے۔

تشریح......: (۱) ہم کسی کو جنتی یا جہنمی نہیں کہیں گے سوائے ان لوگوں کے جن کے جنتی یا جہنمی ہونے کی رسول اللہ ﷺ نے گواہی دی۔ ان کے علاوہ ہم کسی معین شخص کے جنتی یا جہنمی ہونے کا فتویٰ نہیں دیں گے۔ البتہ ہم نیکوکار لوگوں کے جنت میں جانے کی امید رکھتے ہیں اور گنہگاروں کے جہنم میں جانے سے ڈرتے ہیں۔ کسی معین شخص کے جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ دینے کے لیے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے دلیل چاہیے۔ لہٰذا ہم دلیل کے بغیر کسی کو بالوثوق شہید یا جنتی نہیں کہتے۔ ہاں! جو شخص اللہ کے راستے میں قتل ہوتا ہے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرتا ہے ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ شہادت کا درجہ پالے گا۔ اسی طرح گنہگار، کافر، فاسق لوگوں کے بارے میں ہم ڈرتے ہیں کہ وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ لیکن ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ جہنمی ہیں۔ کیونکہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔

اہل قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔

❀❀❀❀❀

---

❶ دیکھئے: مذکور بالا حوالہ نمبر۲.

❷ دیکھئے مذکور بالا حوالہ نمبر۳.

إِلَّا لِمَنْ نَزَلَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ . لٰكِنَّا نَرْجُوْ لِلْمُحْسِنِ، وَنَخَافُ عَلَى الْمُسِيْئِ. (۱)

ترجمہ......: سوائے ان لوگوں کے جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے بتادیا ہے، لیکن ہم نیک کے (جنت کی) امید رکھتے ہیں اور برے پر (جہنم کے) عذاب سے ڈرتے ہیں۔

تشریح......: (۱) کیونکہ جنت وجہنم میں داخلے کا علم، علم غیب کا حصہ ہے جسے صرف اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ یا رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے بتانے سے علم ہوتا تھا۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہم نہ تو غیب جانتے ہیں اور نہ ہی یہ جانتے ہیں کہ فلاں شخص کا خاتمہ کس حالت میں ہوگا۔ اگر کوئی بظاہر نیکوکار اور اطاعت شعار ہو تو یہ اس کے جنتی ہونے کی یقینی دلیل نہیں۔ البتہ اس وجہ سے ہم اس کے لیے جنت کی امید کر سکتے ہیں اور اس کے متعلق حسن ظن رکھ سکتے ہیں۔

اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتَّى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ؛ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ؛ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ؛ فَيَدْخُلُهَا، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى لَا يَبْقٰى بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ؛ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا.))

''بے شک تم میں سے کوئی شخص جنتیوں والے اعمال کرتا رہتا ہے حتیٰ کے اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، مگر تقدیر اس پر غالب آجاتی ہے اور وہ جہنمیوں والے کام کرنے لگتا ہے۔ سو، جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور ایک شخص جہنمیوں والے کام کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ پھر تقدیر اس پر غالب

آ جاتی ہے اور وہ جنتیوں والے اعمال کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔'' ❶

جن اعمال پر موت آئے انجام انہی کے مطابق ہوتا ہے۔ جبکہ ہم نہیں جانتے کہ کون کس حالت میں مرے گا؟ لیکن یہ بات ہمیں کسی مسلمان کے بارے میں حسن ظن رکھنے اور اس کے اچھے انجام کی امید رکھنے سے نہیں روکتی۔ اور نہ ہی یہ کسی نافرمان یا فاسق آدمی کے بارے میں یہ گمان رکھنے سے مانع ہے کہ اس کا انجام برا ہوگا۔ کسی کو جنتی یا جہنمی کہنے کے بارے میں مسلمانوں کا یہی مؤقف ہے۔

❀❀❀❀❀

وَلَا نُكَفِّرُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ بِذَنْبٍ، وَلَا نُخْرِجُهُ عَنِ الْإِسْلَامِ بِعَمَلٍ. (ا)

ترجمہ......: ہم اہل قبلہ میں سے کسی پر کسی گناہ کی وجہ سے کفر کا فتویٰ نہیں لگاتے اور نہ ہی اسے کسی عمل کی وجہ سے اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں۔

تشریح......: (ا) یہ مسئلہ تکفیر ہے جو کہ ایک اہم اور گھمبیر موضوع ہے۔ بالخصوص عصر حاضر میں جبکہ جہالت کی وجہ سے اور ایسے مبلغین کی کثرت کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے لیے حق و باطل کے درمیان تمیز مشکل ہو چکی ہے، جنہوں نے اہل علم سے علم حاصل نہیں کیا بلکہ وہ اس معاملے میں دیوانے ہو چکے ہیں۔

لیکن جو شخص نواقض اسلام میں کسی کام کا مرتکب ہوتا ہے، مثلاً اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے، دین کا مذاق اڑاتا ہے، جادو کرتا ہے یا کتاب وسنت کی توہین کرتا ہے تو اس کے کفر میں کوئی شک نہیں۔ ایسے شخص پر ہم مرتد ہونے کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ اسے دین اسلام سے خارج سمجھتے ہیں اور کافر قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اسلام کے منافی عمل کا ارتکاب ایسے شخص کے کفر اور ارتداد کا مقتضی ہوتا ہے۔

❶ مسند احمد (٦/١٢٥)، (٢٦٢٤)، بخاری (٣٢٠٨)، مسلم (٢٦٤٣)، اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔

البتہ جس کا گناہ ارتداد سے چھوٹا ہو جیسے شراب نوشی، سود خوری، زنا کاری اور چوری جیسے اعمال تو یہ بھی اگرچہ بہت خطرناک، تباہ کن اور مہلک افعال ہیں لیکن ان کے مرتکب کو ہم کافر نہیں کہیں گے۔ بلکہ ہم کہیں گے کہ وہ اپنے ایمان لانے کی وجہ سے مومن ہے اور کبیرہ گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے فاسق ہے۔ یا ہم یوں کہیں گے کہ وہ ناقص ایمان والا مومن ہے۔ کبیرہ گناہوں کے مرتکب کے بارے میں اہل سنت والجماعت سلفی اہل حق کا یہی عقیدہ ہے۔ ہم ایسے لوگوں کو کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے کافر نہیں کہتے جب تک وہ شرک یا ارتداد کی حد تک نہیں نہ پہنچ جائیں۔ بلکہ ہم انہیں فاسق اور ناقص مومن کہتے ہیں، خوارج و معتزلہ کے برعکس۔ جو کہ شرک سے چھوٹے کبیرہ گناہوں کے مرتکب کو بھی کافر قرار دیتے ہیں۔ وہ شرابی، زانی، سود خور وغیرہ پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ لیکن یہ واضح گمراہی ہے۔

معتزلہ کہتے ہیں: ایسا شخص اسلام سے تو نکل جاتا ہے لیکن کفر میں داخل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ان دونوں حدوں کے درمیان ایک مقام پر ہوتا ہے۔ نہ تو وہ کافر ہے اور نہ ہی مسلمان۔ البتہ اگر وہ اسی حالت میں مر جائے تو کافر ہے اور جہنم میں رہے گا۔

یہی مؤقف خوارج کا ہے۔ دونوں فرقے ہی باطل اور گمراہ ہیں۔ چنانچہ بندۂ مومن اگرچہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کر بھی بیٹھے، اس کے اندر ایمان کی جڑیں باقی رہتی ہیں۔ البتہ کبیرہ گناہ اس کے ایمان میں نقص پیدا کر دیتا ہے اور اسے فاسق بنا دیتا ہے لیکن اسے کافر نہیں کہا جا سکتا۔ اس عظیم مسئلہ میں اہل سنت والجماعت سلفی اہل حق کا یہی مؤقف ہے۔

خوارج و معتزلہ کے برعکس مرجئہ فرقہ کے حاملین کہتے ہیں کہ ایمان و تصدیق دل میں ہوتے ہیں اور اعمال ان میں داخل نہیں۔ لہٰذا جب تک کوئی شخص قلبی طور پر مومن ہے اس کو کافر نہیں کہا جا سکتا، خواہ وہ جو بھی کرتا رہے۔ خواہ غیر اللہ کو پکارتا رہے اور شرک کا ارتکاب کرتا رہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک ایمان صرف دل سے تصدیق کرنے کو کہتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ جب تک کوئی شخص دل میں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے ہم اس پر کفر کا فتویٰ نہیں لگا سکتے۔ ایمان کے ہوتے ہوئے گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتے جیسا کہ کفر کے

ہوتے ہوئے نیکیاں فائدہ نہیں دیتیں۔ ایمان ایک ہی چیز کا نام ہے۔ اس کا تعلق دل سے ہے اور اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ لہٰذا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان ایک گناہ گار ترین انسان جیسا ہی ہے۔ لیکن یہ بھی واضح گمراہی ہے (اللہ اپنی پناہ میں رکھے)

اہل سنت والجماعت سلفی اہل حق ان دونوں گمراہ گروہوں کے درمیان میں میانہ روی کے راستے پر گامزن ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''کبیرہ گناہ ایمان کی موجودگی میں بھی نقصان پہنچاتے ہیں اور ایمان کو کم کر دیتے ہیں۔ کبائر کے مرتکب کو فاسق اور ناقص مومن کہا جائے گا۔ بخلاف اس کے جو مرجئہ کہتے ہیں۔ خوارج و معتزلہ کی طرح ہم اسے دین سے خارج بھی نہیں کہتے۔'' یہی مذہب صحیح ہے جو کتاب و سنت کے شانہ بشانہ چلتا ہے۔

ایک صحیح حدیث میں ہے کہ اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

((أُخْرِجُ مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ أَدْنَى أَدْنَى أَدْنَى مِثْقَالِ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَان .))

''میں روز قیامت آگ سے اس شخص کو بھی نکال دوں گا جس کے دل میں رائی کے دانے سے تین گنا کم بھی ایمان ہوا۔''❶

اسی طرح ایک حدیث میں ہے:

((مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ، ثُمَّ مَاتَ عَلٰى ذٰلِكَ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ . قُلْتُ: وَإِنْ زَنَا وَإِنْ سَرَقَ؟ قَالَ: وَإِنْ زَنَا وَإِنْ سَرَقَ . قُلْتُ: وَإِنْ زَنَا وَإِنْ سَرَقَ ؟ قَالَ: وَإِنْ زَنَا وَإِنْ سَرَقَ . قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَإِنْ زَنَا وَإِنْ سَرَقَ؟ قَالَ: وَإِنْ زَنَا وَإِنْ سَرَقَ ، وَعَلَى رَغْمِ أَنْفِ أَبِيْ ذَرٍّ . فكان اَبُوْ ذَرٍّ رضی اللہ عنہ إِذَا حَدَّثَ بِهٰذَا قَالَ: وَإِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِيْ ذَرٍّ .))

❶ اس کی تخریج پیچھے گزر چکی ہے۔

''جس شخص نے بھی لا الہ الا اللہ کہا پھر اس پر قائم رہتے ہوئے اسے موت آئی تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یارسول اللہ! خواہ وہ زانی ہو یا چور ہو؟ فرمایا: خواہ وہ زانی یا چور ہی ہو۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے پھر یہی سوال دوہرایا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی جواب دیا۔ انہوں نے تیسری مرتبہ یہی سوال دوہرایا تو پیغمبر کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خواہ وہ زانی یا چور ہی ہو اور اگرچہ ابوذر کی ناک خاک آلود ہی ہوجائے۔'' بعدازاں ابوذر رضی اللہ عنہ جب بھی یہ حدیث بیان کرتے تو ان الفاظ کو بھی بار بار دوہراتے: ''خواہ ابوذر کی ناک خاک آلود ہو۔''❶

❀❀❀❀❀

وُجُوْبُ الْحَجِّ وَالْجِهَادِ مَعَ كُلِّ إِمَامٍ بَرًّا كَانَ أَوْ فَاجِرًا، وَنَرَي الْحَجَّ وَالْجِهَادَ مَاضِيَيْنِ مَعَ كُلِّ إِمَامٍ. (۱)

ترجمہ......: اور ہر امام کی اقتداء میں حج اور جہاد کرنا واجب ہے، خواہ وہ نیک ہو یا گنہگار۔ اور ہم اس بات کی رائے رکھتے ہیں کہ حج اور جہاد ہر امام کی اقتداء میں جاری رہے گا۔

تشریح......: (۱) اہل سنت والجماعت کے اصولی عقائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے سربراہوں کی اطاعت واجب۔ ان کے خلاف جنگ کرنا، اللہ تعالیٰ کی معصیت کے علاوہ کسی کام میں ان کی مخالفت کرنا اور ان کی نافرمانی کرنا حرام ہے۔ کیونکہ ان کی اطاعت میں ہی مسلمانوں کا اتحاد اور ان کی یگانگت مضمر ہے۔ ان کی نافرمانی مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے اور دشمنوں کے غلبے کا باعث۔ اس کے علاوہ بھی اس کے کئی نقصانات ہیں۔ مسلمان حکمرانوں کے چند ایک حقوق درج ذیل ہیں:

ان کی اقتداء میں نماز پڑھنی چاہیے خواہ وہ فاسق ہی کیوں نہ ہوں۔ اگرچہ وہ ایسے کبیرہ

❶ بخاری (۵۸۲۷)، مسلم (۹٤)، (۱۵٤)، مسند احمد (۳۵) (۳۷۰) (۲۱٤٦٦)۔ اس کے راوی ابوذر رضی اللہ عنہ ہیں۔

گناہوں کا ارتکاب کرتے ہوں جو کفر کی حد تک تو نہ پہنچتے ہوں لیکن ان کے فاسق ہونے کی دلیل ہوں۔ جب تک وہ اسلام سے خارج نہ ہو جائیں ان کی حکومت باقی رہے گی اور ان کی اطاعت کرنا واجب ہوگا۔ جو شخص ان کی اقتداء میں نماز نہیں پڑھتا وہ بدعتی ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے مسلمان حکمران کی قیادت میں امت کو اتحاد و اتفاق سے رہنے کا حکم دیا ہے۔ خواہ وہ ذاتی طور پر فاسق ہو، ظالم ہو اور لوگوں کے مال لوٹتا ہو، ان کے خون بہاتا ہو۔ جب تک وہ کفر کی حد تک نہیں پہنچتا اس کی مخالفت اور اس کے خلاف جنگ کرنا جائز نہیں۔

بلاشبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے حکمرانوں کے پیچھے بھی نمازیں پڑھتے رہے جو ان کے نزدیک اللہ کے نافرمان اور کفر و شرک سے نیچے بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ مثلاً حجاج بن یوسف، مختار بن عبید اور ابن زیاد وغیرہ۔ صحابہ کرام اور ائمہ عظام میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے ان کی اقتداء میں نماز پڑھنی چھوڑ دی ہو۔ بالخصوص شعائر اسلام میں ان کی پیروی سے نکلے ہوں۔ مثلاً عیدین کی نماز، نماز جمعہ وغیرہ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے حکمرانوں کے ساتھ اور ان کی قیادت میں حج کرتے تھے۔ سلف صالحین نبی اکرم ﷺ کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اسی راہ پر چلتے تھے اور رسول اللہ ﷺ جب یہ ذکر کرتے تھے کہ امت میں اختلاف پڑ جائے گا تو اپنی امت کو یہی ہدایت دیتے تھے۔ چنانچہ فرمایا:

((مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ فَسَيَرٰى اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا؛ وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ .))

''تم میں سے جو زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا لیکن تم میرے طریقے کو اختیار کیے رکھنا۔''[1]

اس حدیث کے آغاز میں آپ ﷺ نے یہ فرمایا:

---

[1] مسند احمد (۲۸/۳۷۵-۳۷۶)، (۱۷۱۴۲)، (۱۷۱۴۴)، (۱۷۱۴۵)، اس حدیث کے راوی عرباض بن ساریہ ہیں رضی اللہ عنہ اور یہ حدیث اپنے طرق اور شواہد کے ساتھ صحیح ہے۔

((أُوْصِيكُمْ بِالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ ، وَإِنْ تَأَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ .))
''میں تمہیں سن کر عمل کرنے کی وصیت کرتا ہوں خواہ تم پر ایک غلام ہی امیر ہو۔'' ❶

ایک روایت میں ہے:
((وَإِنْ تَأَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبْشِيٌّ ، كَأَنَّ رَأْسَهُ زَبِيْبَةٌ .))
''اگرچہ تمہارا امیر ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو جس کا سر منقے جیسا ہو۔'' ❷

((أُوْصِيكُم بِالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ ، وَإِنْ تَأَمَّر عليكُم عَبْدٌ ، فَإِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ فَسَيَرى اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا ، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِي ، تَمَسَّكُوْا بِهَا ، وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ .))
''میں تمہیں بات سن کر اس پر عمل کی وصیت کرتا ہوں اگرچہ تمہارا امیر کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ جو تم میں سے زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا تو تم میرے طریقے کو لازم پکڑنا اور میرے بعد میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کے طریقے کو اختیار کرنا، اس کے ساتھ چمٹے رہنا، اپنے دانتوں کے ساتھ اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا اور دین میں نئے نئے کام پیدا کرنے سے بچنا۔'' ❸

مسلمان حکمرانوں کے خلاف جنگ کرنا، ان کی اقتداء میں نماز کی ادائیگی ترک کر دینا اور اس جیسے دیگر کاموں میں ان کی مخالفت کرنا بھی بدعت میں شمار ہوتا ہے۔

---

❶ دیکھئے گزشتہ تعلیق، مزید دیکھیں: صحیح مسلم (٦٤٨) (٢٤٠)، (١٢١٨) (٣١١).
❷ یہ حدیث حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں منقول ہے (٧١٤٢).
❸ مسند احمد (٢٨/٣٧٥۔٣٧٣) (١٧١٤٤) (١٧١٤٥)۔ اس حدیث کے راوی عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ حدیث صحیح ہے۔

سنت، ان کی اطاعت کرنا، ان کے پیچھے نماز پڑھنا اور ان کے ساتھ جہاد کرنا ہی ہے۔ جب وہ مسلمانوں کو جہاد کے لیے بلائیں یا کسی معین شخص کو جہاد کا حکم دیں تو اس پر حکمران کی اطاعت واجب ہے:

((وَإِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا .))

''جب تمہیں جہاد پر جانے کے لیے بلایا جائے تو تم نکل پڑو۔'' [1]

اسی طرح حکمران حج قائم کرواتے تھے۔ اگرچہ وہ کفر سے نیچے نیچے بہت سے گناہوں کے مرتکب ہوتے تھے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کی مخالفت کی اور نہ ہی کبھی یہ کہا کہ ان کے ساتھ حج قبول نہیں ہوتا۔ یہ اس عظیم مسئلے کی دلیل ہے برعکس ان گمراہ فرقوں کے جو بزعم خویش غیرت دینی کا نام لے کر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ غیرت ایسی نہیں ہوتی بلکہ یہ تو بدعت ہے۔

مناسب طریقے سے حکمرانوں کو نصیحت کرنا واجب ہے جس سے ان میں نیکی کی محبت پیدا ہو اور وہ ان برائیوں سے باز آ جائیں، گویا ان کو شرعی طریقوں سے نصیحت کرنا واجب ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان کی غلطیوں اور گناہوں پر خاموش رہنا چاہیے بلکہ ان کو مناسب طریقوں سے نصیحت کرنی چاہیے۔ جیسا کہ ہمارے اسلاف اپنے حکمرانوں کو نصیحت کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی مخالفت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اور مجلسوں میں ان پر کیچڑ نہیں اچھالنا چاہیے۔

یہ ہے سلف کی راہ اور ان کا منہج اگر لوگ اسے قبول کریں گے تو الحمد للہ۔ اور اگر نہیں مانیں گے تو ان کی ذمہ داری پوری ہو چکی اور اس انکار کی پوچھ گچھ انہی سے کی جائے گی۔

لیکن بہتری اسی میں ہے کہ ان کی جو باتیں حق کے مطابق ہوں ان میں ان کی موافقت اور اطاعت کی جائے۔ اس سے بہت سے عظیم فوائد جنم لیں گے اور ان کی بعض غلطیوں سے چشم پوشی کرنا دو خرابیوں میں سے بڑی خرابی کے خاتمے کے لیے چھوٹی کو

---

[1] مسند احمد (۳/۴۴۸) (۱۹۹۱)، بخاری (۲۷۸۳)، مسلم (۱۳۵۳)۔ یہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

برداشت کرنے کے قبیل سے ہے۔ کیونکہ ان کی اطاعت سے نکل جانے اور ان کے خلاف جنگ کرنے کا لازمی نتیجہ خونریزی، اتحاد کا خاتمہ اور ایسی برائیوں کا وجود میں آنا ہے جو حکمرانوں کی ذاتی برائیوں سے زیادہ ہوں گی۔

اسی لیے اسلاف رحمہم اللہ حکمرانوں کی مخالفت سے بچتے تھے۔ ان کے پیچھے نمازیں پڑھ لیتے تھے۔ ان کے ساتھ مل کر حج اور جہاد کر لیتے تھے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ خلفاء راشدین اور معاویہ رضی اللہ عنہم کے بعد ایسے حکمران آئے جن میں اچھائیاں بھی تھیں اور برائیاں بھی۔ ان میں سے بعض تو ایسے تھے جن میں عیوب کا پہلو غالب تھا لیکن ان تمام حقائق کے باوجود مسلمان اپنے ائمہ کے گرد جمع رہتے تھے۔ یہ تو اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے اور مخالف فرقوں کا ذکر عنقریب آئے گا۔

❀❀❀❀❀

بَرًّا كَانَ، أَوْ فَاجِرًا (۱) وَصَلٰوةُ الْجُمُعَةِ خَلْفَهُمْ جَائِزَةٌ (۲).

ترجمہ......: خواہ وہ نیک ہو یا بد اور ان کے پیچھے جمعہ کی نماز ادا کرنا جائز ہے۔

تشریح......: (۱) بَــرًّا: یعنی نیک کام کرنے والا اور اطاعت الٰہی پر کاربند رہنے والا۔ جس میں یہ صفت پائی جائے تو بلاشبہ یہ زیادہ اچھی بات ہے اور صفت کمال ہے۔

أَوْ فَــاجِـرًا: فاجر سے مراد فاسق آدمی ہے۔ یہاں فجور سے مراد فسق ہے نہ کہ کفر۔ کیونکہ اگر حکمران کافر ہو تو اس کی اطاعت جائز نہیں۔

(۲)...... ہمارے اسلاف (بزرگان) اپنے امراء کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے۔ امراء انہیں جمعہ اور عید کی نماز پڑھاتے تھے لیکن کسی بزرگ کے بارے میں منقول نہیں کہ وہ اپنے امیر کے فسق یا ظلم کی وجہ سے نماز سے پیچھے رہتا ہو۔ کیونکہ جب وہ اللہ کی اطاعت کریں تو آپ بھی ان کے ساتھ اطاعت الٰہی میں شریک ہو جائیں، ان کے ساتھ نماز ادا کریں۔ کیونکہ نماز عبادت ہے اور ان کے ساتھ نماز پڑھنے سے امت میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔

قَالَ اَنَسٌ رضی اللہ عنہ قَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم ثَلَاثٌ مِنْ اَصْلِ الْإِیْمَانِ: اَلْكَفُّ عَمَّنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ (۱) وَلَا نُكَفِّرُهُ بِذَنْبٍ، وَلَا نُخْرِجُهُ مِنَ الْإِسْلَامِ بِعَمَلٍ. (۲)

ترجمہ......: جناب انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین چیزیں ایمان کی بنیاد ہیں جو شخص لا الہ الا اللہ کا اقرار کرے اسے قتل کرنے سے ہاتھ کو روک لینا۔ اس لیے کسی گناہ کی وجہ سے ہم ایسے شخص کو کافر نہیں کہیں گے اور کسی عمل کی وجہ سے اسے اسلام سے خارج قرار نہیں دیں گے۔''

تشریح......: (۱) جو لا الہ الا اللہ کا اقرار کرلے اسے اس وقت تک نقصان پہنچانے سے رک جانا واجب ہے جب تک وہ کسی قسم کے ارتداد کا مرتکب ہو کر اس کلمے کی مخالفت نہ کرلے۔ جب وہ لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد کسی قسم کے ارتداد کا مرتکب ہو جائے تو ہم اس کے مرتد ہونے کا فتویٰ دے دیں گے۔

لیکن جب تک اس کی طرف سے کوئی ایسی چیز سامنے نہ آئے وہ مسلمان ہی رہے گا۔ اس کے مسلمانوں والے حقوق و فرائض ہوں گے۔ ہم دلوں کی کرید نہیں کریں گے کیونکہ دلوں کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسِ حَتَّى يَقُوْلُوْا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ. فَإِذَا قَالُوْهَا عَصَمُوْا مِنِّي دِمَاءَهُمْ، وَأَمْوَالَهُمْ، إِلَّا بِحَقِّهَا وحسابُهم على اللّٰه.)) ❶

''مجھے لوگوں سے اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار نہ کرلیں جب وہ یہ کلمہ پڑھ لیں گے تو مجھ سے اس کلمے کے حق کے علاوہ اپنے مال بھی بچالیں گے اور جانیں بھی۔''

---

❶ مسند احمد (۲۲۸۱۔ ۲۲۹) (٦٧)، بخاری (٦٩٢٤)، مسلم (٢٠) راوی ابو ہریرہ ہیں۔ رضی اللہ عنہ

لہٰذا ہم ظاہری حالت کے مطابق ہی فیصلہ کریں گے۔

(۲)......متن والی یہ حدیث ضعیف ہے۔لیکن اس کا کچھ حصہ صحیح احادیث کے مطابق ہے۔

''تین چیزیں اسلام کی بنیاد ہیں: اس شخص کو کوئی نقصان نہ پہنچانا جو لا الہ الا اللّٰہ پڑھ لے'' یہ اسلام کی بنیاد ہے حتیٰ کہ اس شخص سے اس کے مخالف کوئی کام سامنے آ جائے۔

''وَلَا نُكَفِّرُهُ بِذَنْبٍ'' جب تک وہ اس گناہ کو حلال نہ سمجھتا ہو یعنی شرک سے چھوٹے گناہوں کی وجہ سے ہم کسی کو کافر نہیں کہیں گے۔ مثلاً سود خوری، اگرچہ بہت بڑا گناہ ہے اور کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے لیکن اگر کوئی کہے کہ یہ حلال ہے تو وہ کافر ہے۔ کیونکہ اللّٰہ و رسول نے سود کو حرام کیا ہے اور اس کی حرمت پر امت کا اجماع ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص سود کی حرمت کا اعتراف کرتے ہوئے سود کھاتا ہے تو یہ فاسق ہے۔ اسی طرح چور، زانی، شراب نوش کو محض ان کے اعمال کی وجہ سے ہم کافر نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اگر وہ یہ عقیدہ رکھیں یا اسے حلال کہیں تو ہم اس کے کفر کا فتویٰ دیں گے۔ کیونکہ وہ اللّٰہ اور اس کے رسول ﷺ کو جھٹلاتا ہے۔

''اور ہم اسے کسی عمل کی وجہ سے اسلام سے خارج قرار نہیں دیں گے۔''

عمل سے مراد ایسا عمل ہے جو شرک کے علاوہ ہو۔

❀❀❀❀❀

وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ حَتّٰى يُقَاتِلَ اٰخِرُ أُمَّتِي الدَّجَّالَ (۱) لَا يُبْطِلُهُ جَوْرَ جَائِرٍ، وَلَا عَدْلَ عَادِلٍ وَالْإِيْمَانُ بِالْأَقْدَارِ (۲) رواہ ابوداود [1]
وَمِنَ السُّنَّهِ تَوَلِّيْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَمَحَبَّتِهِمْ. (۳)

ترجمہ......: جب سے اللّٰہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث کیا ہے تب سے جہاد جاری ہے اور جاری رہے گا حتیٰ کہ میری امت کا آخری گروہ دجال سے جنگ کرے گا۔ کسی ظالم کا ظلم یا کسی عادل کا عدل اسے مٹا نہیں سکے گا۔ اور تقدیر پر ایمان لانا۔ یہ روایت ابوداؤد کی ہے۔

[1] سنن ابی داؤد (۲۵۳۲).

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دوستی اور محبت سنت ہے۔

تشریح......: (۱) یہ باتیں بھی ایمان کا حصہ ہیں۔ مثلاً یہ کہ جہاد جاری رہے گا، حتیٰ کہ اس امت کا آخری گروہ دجال کے خلاف جنگ کرے گا۔ اس بات کی گواہی صحیح احادیث سے ملتی ہے۔

(۲)...... یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ تقدیر پر ایمان اصولِ ایمان میں سے ہے جیسا کہ حدیث جبریل میں ہے:

((وَأَنْ تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ .))

''ایمان یہ ہے کہ............تو اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لائے۔''

(۳)...... رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے تعلق اور محبت سنت ہے۔ ان سے مطلق طور پر محبت کرنی چاہیے کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کا ساتھی ہونے کا شرف بخشا اور اسلام میں پہل کرنے کا امتیاز عطا کیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر جہاد کرتے رہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے انہیں علم وعمل میں فضیلت عطا کی۔ لہٰذا وہ انبیاء کے بعد بہترین لوگ ہیں اور اس امت میں نبی معظم ﷺ کے بعد افضل ترین شخصیات ہیں۔

ان کا احترام کرنا واجب ہے، ان میں سے کسی کے بارے میں زبان درازی کرنا، ان کی غلطیاں تلاش کرنا اور لوگوں کے سامنے انہیں بیان کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ ان کے فضائل اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ ان کی چھوٹی موٹی غلطیوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور ان کی کوتاہیوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔

ہمیں تو ان سے محبت کرنے، ان کی تعریف کرنے اور ان کے ساتھ قلبی تعلق رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور ہمیں حکم ہے کہ ان کی غلطیوں کی ٹوہ نہ لگائیں اور ان میں سے کسی کی شان میں گستاخی نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ

هُمُ الصَّادِقُوْنَo﴾ (الحشر : ۸)

’’(یہ مال) ان محتاج گھر بار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔ وہ اللہ کی طرف سے کچھ فضل اور رضا تلاش کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔‘‘

یہ مہاجرین کے بارے میں ہے۔

اور انصار کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوْتُوا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَّمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَo﴾ (الحشر : ۹)

’’اور (ان کے لیے) جنھوں نے ان سے پہلے اس گھر میں اور ایمان میں جگہ بنا لی ہے، وہ ان سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کی طرف آئیں۔ اور وہ اپنے سینوں میں اس چیز کی کوئی خواہش نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دی جائے۔ اور اپنے آپ پر ان کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ انھیں سخت حاجت ہو۔ اور جو کوئی اپنے نفس کی حرص سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔‘‘

ایک مقام پر ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (الفتح : ۲۹)

’’محمد اللہ کا رسول ہے اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں کافروں پر بہت سخت ہیں۔ آپس میں نہایت رحم دل ہیں۔ تو انھیں اس حال میں دیکھے گا کہ رکوع کرنے والے ہیں، سجدے کرنے والے ہیں، اپنے رب کا فضل اور (اس کی) رضا ڈھونڈتے ہیں۔ ان کی شناخت ان کے چہروں میں (موجود) ہے، سجدے کرنے کے اثر سے۔ یہ ان کا وصف تورات میں ہے۔ اور انجیل میں ان کا وصف اس کھیتی کی طرح ہے جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا، پھر وہ موٹی ہوئی، پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ کاشت کرنے والوں کو خوش کرتی ہے۔ تاکہ وہ ان کے ذریعے کافروں کو غصہ دلائے۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے بڑی بخشش اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔‘‘

یہ بھی ارشاد پاک ہے:

﴿وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

(التوبہ: ۱۰۰)

’’اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے سب سے پہلے لوگ اور وہ لوگ جو نیکی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے۔ اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہوگئے۔ اور اس نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔‘‘

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ

سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (التوبہ: ۱۱۷)

''بلاشبہ یقیناً اللہ نے نبی پر مہربانی کے ساتھ توجہ فرمائی اور مہاجرین و انصار پر بھی۔ جو تنگ دستی کی گھڑی میں اس کے ساتھ رہے، اس کے بعد کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل ٹیڑھے ہو جائیں۔ پھر وہ ان پر دوبارہ مہربان ہو گیا۔ یقیناً وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

ان کی تعریف و توصیف کے بارے میں بہت سی آیات مبارکہ ہیں۔

احادیث میں بھی ان کے بہت سے فضائل مروی ہیں۔ چنانچہ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَسُبُّوْا أَصْحَابِيْ ، فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَوْ أَنْفَقَ أَحَدُكُمْ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيْفَهُ .))

''تم میرے صحابہ کو گالیاں نہ دو۔ کیونکہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو ان کے ایک مد بلکہ نصف مد کے برابر اجر کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔''[1]

یعنی اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ کوئی اور بندۂ مومن اللہ کے راستے میں احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کردے، اس کا یہ عمل ریاکاری اور شہرت سے پاک اور صرف رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ہو تب بھی وہ اجر و ثواب اور فضیلت میں کھانے کے ایک مد کو بھی نہیں پہنچ سکتا جو کسی صحابی نے صدقہ کیا ہو۔ بلکہ وہ صحابی کے خرچ کردہ نصف مد کو بھی نہیں پا سکتا۔

گویا اتنا بڑا پہاڑ اگر سونے کا خرچ کر دیا جائے تو وہ ایک مد کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔ ایک مد، ایک چوتھائی صاع کے برابر وزن کو کہتے ہیں۔

---

[1] مسند احمد (۱۷/۱۳۸۔۱۳۷) (۱۱۰۷۹)، بخاری (۳۶۷۳)، مسلم (۲۵۴۰) راوی ابوسعید رضی اللہ عنہ ہیں۔

اگر آج کوئی اٹھ کر صحابہ کرام کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں تلاش کر کے انہیں لوگوں کے سامنے اچھالتا پھرے تو یہ ہرگز جائز نہیں۔ ان کے اس باہمی اختلاف کے بارے میں بھی زبان درازی جائز نہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ان کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ یہ ایک آزمائش تھی اور جب کوئی آزمائش آن پڑتی ہے تو اس کا خطرہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اسی فتنے نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا اور آپ کو ظالمانہ انداز میں شہید کر دیا گیا۔ جب سیّدنا علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کی گئی تو آپ رضی اللہ عنہ فتنے کی وجہ سے ہی قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص نہ لے سکے۔

لوگ فتنے کھڑے کرنے لگے حتیٰ کہ انہی دشمنوں کی وجہ سے جنگیں برپا ہوئیں۔ انہوں نے سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔ پھر یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں گھس گئے۔ پھر انہوں نے جمل اور صفین کے واقعات میں جنگ کو ہوا دی۔ یہ سازشی عناصر صحابہ میں سے نہیں تھے بلکہ یہ تو وہ لوگ تھے جو فتنے برپا کرنے والے اور دشمنی بھڑکانے والے تھے۔ وہ اختلافات پیدا کرتے رہے حتیٰ کہ انہیں مطلوبہ نتائج حاصل ہو گئے۔

اگر صحابہ میں سے کوئی اس میں شریک بھی تھا تو وہ حق کی تائید کی غرض سے شریک ہوئے۔ انہوں نے اجتہاد کیا۔ وہ سب مجتہد تھے خواہ وہ صحیح بات تک پہنچے یا ان سے غلطی ہوئی۔ ہر حال میں ان کی اجتہادی غلطی معاف ہے۔ ان کے فضائل و مناقب اتنے زیادہ ہیں کہ وہ ان کی غلطیوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور ان کا کفارہ ادا کر دیتے ہیں۔

الغرض ہمارے لیے ان جنگوں کی گہرائی میں جانا جائز نہیں سوائے اس کے کہ ہم ان کے لیے عذر پیش کریں۔

اہل سنت سلفی جماعت حقہ کے لوگ صحابہ کی غلطیاں تلاش نہیں کرتے۔ بلکہ وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی طرف سے عذر پیش کرتے ہیں۔ وہ صرف مجبوری کی حالت میں ہی اس موضوع پر بات کرتے ہیں۔ افضل یہی ہے کہ ان موضوعات کو نہ چھیڑا جائے لیکن اگر کوئی مجبور ہو جائے تو اسے چاہیے کہ باطل مؤقف کی تردید کرے۔ اور بے دینوں سے بحث

کرے کہ صحابہ کے فضائل کو ماننا چاہیے اور ان سے جو چند ایک غلطیاں ہوئی تھیں، وہ بخش دی گئی ہیں۔

اسی لیے جب اللہ تعالیٰ نے مہاجرین وانصار کا ذکر کیا تو فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الحشر: ۱۰)

"اور (ان کے لیے) جو ان کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی۔ اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ جو ایمان لائے۔ اے ہمارے رب! یقیناً تو بے حد شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے۔"

اس قاعدے کو یاد رکھیں، اسے اپنا نصب العین بنالیں اور اس سے تجاوز نہ کریں۔

❀❀❀❀❀

وَذِكْرُ مَحَاسِنِهِمْ، وَالتَّرَحُّمِ عَلَيْهِمْ، وَالْإِسْتِغْفَارُ لَهُمْ، وَالْكَفُّ عَنْ ذِكْرِ مَسَاوِئِهِمْ وَمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (١) وَاعْتِقَادُ فَضْلِهِمْ وَمَعْرِفَةِ سَابِقَتِهِمْ (٢) قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى ﴿وَالَّذِيْنَ جَاءُوا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الحشر: ١٠) (٣) وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالَى ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح: ٢٩) (٤)

ترجمہ......: ان کے محاسن کا تذکرہ کرنا، ان کے لیے رحمت کے جذبات رکھنا، ان کے لیے استغفار کرنا، ان کی غلطیوں اور باہمی اختلافات کے تذکرے سے باز رہنا، ان کی افضلیت کا عقیدہ رکھنا اور ان کی اوّلیت کو پہچاننا بھی سنت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور (ان کے لیے) جو ان کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو

بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ جو ایمان لائے۔ اے ہمارے رب! یقیناً تو بے حد شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے۔'' نیز فرمایا: ''محمد اللہ کا رسول ہے (ﷺ) اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم دل ہیں۔''

تشریح......: (۱) یعنی ان کے اختلافات کا تذکرہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان کا یہ اختلاف ان کے اجتہاد کا نتیجہ تھا جو انہوں نے حق اور سچ کی تلاش میں کیا تھا۔ لہٰذا اگر وہ صحیح راہ تک پہنچ گئے تو ان کے لیے دوگنا اجر ہے اور اگر ان سے غلطی ہوگئی تھی تو وہ انہیں معاف ہے۔ کیونکہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ فَأَصَابَ؛ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ فَأَخْطَأَ؛ فَلَهُ أَجْرٌ.))

''جب قاضی فیصلہ کرے اور اس کا اجتہاد درست ہو جائے تو اس کو دوگنا اجر ملے گا اور اگر فیصلہ کرنے میں اس کا اجتہاد غلط ہو جائے تو اسے ایک اجر ملتا ہے۔''[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس رعایت کے زیادہ مستحق ہیں۔

(۲)......یعنی محض زبان سے ان کی فضیلت بیان کر دینا یا ان کی فضیلت کے بارے میں کچھ لکھ دینا کافی نہیں، بلکہ اس کو دل کی گہرائیوں سے ماننا بھی ضروری ہے۔

(۳)......اہل ایمان کا اپنے پیغمبر ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق یہی رویہ ہے کہ وہ ان کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ ایمان و اسلام میں ان کی برتری کا اعتراف کرتے ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کے دلوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں غل یعنی بغض اور نفرت کا خاتمہ کر دے۔

[1] مسند احمد (۲۹/۳۰۸) (۱۷۷۷٤)، بخاری (۷۳۵۲)، مسلم (۱۷۱٦)، یہ حضرت عمرو بن عاص اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

(۴)...... جو لوگ محمد ﷺ کے ساتھی ہیں یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی صفات حسنہ یہ ہیں کہ وہ کفار کے لیے سخت مزاج ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے معاملے میں کسی کی ملامت سے نہیں ڈرتے اور وہ کفار کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے ان سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے خلاف جہاد کرتے ہیں اور ان سے اظہار لاتعلقی کرتے ہیں۔

لیکن آپس میں وہ انتہائی نرم رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کا باہمی تعلق ایسا ہوتا ہے جیسے وہ ایک ہی جسم کے اعضاء ہوں۔ یا وہ ایک دیوار کی مانند ہوتے ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط بناتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں تشبیہ دی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صفت یہ ہے کہ وہ کافروں کے لیے سخت اور باہم ایک دوسرے کے لیے نرم خو تھے۔ اللہ کے حضور سر کو جھکانا، نمازوں کی کثرت، رات کو بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہونا اور دن کو اس کی راہ میں جہاد کرنا ان کا شیوہ تھا۔

وہ اللہ کی خوشنودی کے طلبگار رہتے تھے۔ ان کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشانات ان کی پہچان تھے۔ ان کی یہ علامت تورات میں بھی رب ذوالجلال نے بیان فرمائی ہے۔

الغرض اس امت کے یہ اوصاف تورات میں مذکور ہیں جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی تھی۔ اگرچہ یہودیوں نے تورات میں تحریف کر کے اس امت کا انکار کر دیا ہے۔ لیکن تورات کے نازل کرنے والے رب ذوالجلال نے ہمیں بتا دیا ہے کہ اس برکت کا ذکر تورات میں موجود تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کردہ کتاب انجیل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثال یہ بیان کی گئی ہے:

﴿كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْـَٔهُۥ فَـَٔازَرَهُۥ فَٱسْتَغْلَظَ فَٱسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِۦ يُعْجِبُ ٱلزُّرَّاعَ﴾

''اس کھیتی کی طرح ہے جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا، پھر وہ موٹی ہوئی، پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ کاشت کرنے والوں کو خوش کرتی ہے۔''

ابتداء میں اسلام کمزور تھا، صحابہ کرام کی تعداد کم تھی اور انہیں کمزور سمجھا جاتا تھا جیسا کہ

شروع شروع میں کھیتی کمزور ہوتی ہے۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مضبوط ہو گئے جیسا کہ کھیتی پک جاتی اور مضبوط ہو جاتی ہے۔

﴿اَخۡرَجَ شَطۡئَهٗ فَاٰزَرَهٗ﴾

پھر اللہ تعالیٰ اس کی کونپلیں نکالتا ہے اور اسے مضبوط بنا دیتا ہے۔

﴿شَطۡءٌ﴾ کھیتی کی کونپل کو کہتے ہیں۔

﴿فَاسۡتَغۡلَظَ فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِهٖ﴾

پھر اس کے پٹھے مضبوط ہو جاتے ہیں اور اپنے تنوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سُوۡقٌ جمع ہے ساق کی اور یہ تنے کو کہتے ہیں۔

﴿یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ﴾

''وہ کھیتی والوں کو اچھا لگتا ہے۔''

یعنی جب کھیتی تیار ہو جاتی ہے تو کسان اس کی قوت، پھل اور کثرت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

﴿لِیَغِیۡظَ بِهِمُ الۡکُفَّارَ﴾

''تا کہ ان کے ساتھ کفار کا دل جلائے۔''

معلوم ہوا کہ کفار صحابہ سے جلتے ہیں اور ان سے نفرت کرتے ہیں۔

بعض ائمہ کرام نے اس آیت سے رافضیوں (شیعہ) کے کفر کی دلیل لی ہے۔ کیونکہ شیعہ روافض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نفرت کرتے ہیں۔ اور مذکورہ الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ جو کوئی بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نفرت کرتا ہے وہ کافر ہے۔

❀❀❀❀❀

وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ ((لَا تَسُبُّوْا أَصْحَابِيْ، فَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَوْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ اَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيْفَهُ.)) ❶ وَمِنَ السُّنَّةِ التَّرَضِّيُّ عَنِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ (١) اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ (٢).

❶ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

ترجمہ......: اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''تم میرے صحابہ کو گالیاں نہ دو۔ کیونکہ بلاشبہ اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کر دے تو ان کے مد یا نصف مد (کے اجر) کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔'' اور نبی مکرم ﷺ کی بیویوں یعنی امہات المومنین کے ساتھ راضی رہنا بھی سنت ہے۔

تشریح......: (۱) رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے بلکہ افضل ترین اور خاص صحابہ میں سے نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات بھی ہیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت میں سے ہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی بیویوں کا تذکرہ کیا، انہیں گھروں میں ٹھہرے رہنے اور سنگھار سے باز رہنے کا حکم دیا۔ قیام نماز، ادائیگی زکوٰۃ اور اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا تو فرمایا:

﴿وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا﴾ (الاحزاب: ۳۳)

''اور اپنے گھروں میں ٹکی رہو اور پہلی جاہلیت کے زینت ظاہر کرنے کی طرح زینت ظاہر نہ کرو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو۔ اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے گندگی دور کر دے اے گھر والو! اور تمھیں پاک کر دے، خوب پاک کرنا۔''

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کی بیویاں آپ ﷺ کے اہل بیت میں سے ہیں۔

(۲)...... وہ امہات المومنین ہیں۔ یہ ان کے حقوق میں سے ہے کہ وہ احترام و توقیر اور ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے بعد شادی کے حرام ہونے میں تمام مومنین کی مائیں

ہیں۔ان کے امہات المومنین ہونے کی دلیل قرآن کریم کی یہ نص ہے:

﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ﴾

(الاحزاب: ٦)

''یہ نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھنے والا ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے یہ خصوصی احکام کیوں ہیں؟ (تو اس کا جواب یہ ہے کہ) وہ جنت میں بھی نبی مکرم ﷺ کی بیویاں ہوں گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اختیار دیا تھا کہ وہ چاہیں تو پیغمبر ﷺ انہیں طلاق دے دیں اور وہ کسی اور سے نکاح کر لیں۔ یا وہ فقر و فاقہ اور تنگدستی کی حالت میں صبر کر کے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہ لیں۔ چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور آخرت کے گھر کو اختیار کیا اور پریشانیوں پر صبر کیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ انعام عطا کیا کہ وہ دنیا میں بھی آنحضرت ﷺ کی بیویاں رہیں گی اور آخرت میں بھی۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے انہی تک محدود کر دیا تھا۔ فرمایا:

﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا﴾ (الاحزاب: ٥٢)

''تیرے لیے اس کے بعد عورتیں حلال نہیں اور نہ یہ کہ تو ان کے بدلے کوئی اور بیویاں کر لے، اگرچہ ان کا حسن تجھے اچھا لگے۔ مگر جس کا مالک تیرا دایاں ہاتھ بنے اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری طرح نگران ہے۔''

سو، جب انہوں نے اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور آخرت کے گھر کو اختیار کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بھی انہی تک محدود کر دیا۔ جہاں تک پردے کا، غیر محرم ہونے کا اور ان کے ساتھ خلوت اختیار کرنے کا مسئلہ ہے تو ان مسائل میں وہ دیگر تمام مسلمان اجنبی

عورتوں کی مانند ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں پردے کا حکم دیا:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ قُل لِّأَزْوَٰجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ ٱلْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَـٰبِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰٓ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ ٱللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾ (الاحزاب: ۵۹)

''اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی چادروں کا کچھ حصہ اپنے آپ پر لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچانی جائیں۔ سو، انھیں تکلیف نہ پہنچائی جائے اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انہیں امت کے مردوں سے پردے کا حکم دیا اگرچہ وہ ان کی مائیں ہیں۔ لیکن اس بات کی دلیل موجود ہے کہ وہ محرم نہیں ہیں۔ اور محرم ہونے کے اعتبار سے مائیں نہیں ہیں۔ پردہ ترک کرنے اور خلوت نشینی کے اعتبار سے مائیں نہیں ہیں بلکہ دیگر تمام مسلمان عورتوں کی مانند ہیں۔ انہیں پردے کا حکم دیا گیا ہے اور کسی کے ساتھ خلوت نشینی سے منع کیا گیا ہے۔

امہات المومنین میں سب سے پہلے نمبر پر سیّدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا ہیں۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بعثت سے پہلے شادی کی، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر بنایا۔ اس وقت سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں۔ اور جب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پہلی مرتبہ وحی اور فرشتے کے نزول سے گھبرا گئے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ایک نئی چیز تھی اور آپؐ پہلے اس سے واقف نہ تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس کا ذکر کیا اور فرمایا:

((قَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي .))

''مجھے اپنی جان کا ڈر لاحق ہو گیا ہے۔''

تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

((وَاللّٰهِ لَا يُخْزِيكَ اللّٰهُ ، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ ، وَتُعِينُ عَلٰى نَوَائِبِ الدَّهْرِ .))

''ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا، بے شک آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، (ناتواں لوگوں کا) بوجھ اٹھاتے ہیں اور مصائب زمانہ پر لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔'' [1]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو مسلسل تسلیاں دیتی رہیں تا آنکہ آپ کا خوف ختم ہوگیا۔ پھر آپ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی مکی زندگی میں ان کی مدد اور تائید کرتی رہیں اور کفار کی طرف سے دی جانے والی اذیتوں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہیں۔

رسالت مآب ﷺ ان سے بڑی شدید محبت کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کی زندگی میں کسی اور عورت سے شادی نہیں کی۔ ابراہیم کے علاوہ نبی معظم ﷺ کی تمام اولاد انہی کے بطن سے ہے۔ ابراہیم ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے جو رسول اللہ ﷺ کی لونڈی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ان کی سہیلیوں کی عزت کیا کرتے اور ان کا ذکر خیر کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ پیغمبر ﷺ کی بعض بیویوں کو زبان نبوت سے خدیجہ رضی اللہ عنہا کا کثرت سے ذکر سن کر رشک آتا تھا۔

پیغمبر گرامی ﷺ کی دوسری بیوی کا نام سودہ بنت زمعہ ہے۔ آنجناب ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ان سے بھی مکہ میں ہی شادی کی تھی۔ وہ تادم آخر نبی کریم ﷺ کے عقد میں ہی رہیں۔ اور جب رسول اللہ ﷺ انہیں طلاق دینے لگے تو انہوں نے فرمایا: میں اپنا حق آپ سے ساقط کر کے عائشہ کو ہبہ کرتی ہوں اور آپ کے عقد میں ہی رہنا چاہتی ہوں۔ وہ امہات المومنین میں سے ہونے کا اعزاز گنوانا نہیں چاہتی تھیں۔ چنانچہ آنجناب ﷺ نے انہیں طلاق نہ دی اور وہ آپ ﷺ کے ساتھ ہی رہیں۔

---

[1] مسند احمد (۴۳/ ۱۱۲، ۲۵۹۵۹)۔ بخاری (۳)۔ مسلم (۱۶۰)، راویہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی تیسری بیوی زینب بنت خزیمہ الہلالیہ ہیں رضی اللہ عنہا۔ رسول گرامی ﷺ نے ان سے شادی کی لیکن وہ کچھ عرصہ بعد ہی فوت ہوگئیں۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں آپ کی دو بیویاں فوت ہوئیں۔

(۱)......خدیجہ رضی اللہ عنہا (۲)......زینب بنت خزیمہ الہلالیہ رضی اللہ عنہا

چوتھی بیوی کا نام عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) ہے جو کہ سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی لخت جگر تھیں۔ ان سے رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے بعد شادی کی اور جب ان کی رخصتی ہوئی تو یہ ۹ سال کی تھیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے علاوہ کسی کنواری لڑکی سے شادی نہیں کی۔ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ رہتے ہوئے جو فضائل انہیں حاصل ہوئے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ پر وحی آپ رضی اللہ عنہا کے بستر پر نازل ہوتی تھی۔ پیغمبر ﷺ ان سے شدید محبت کرتے تھے۔ یہ رسالت مآب ﷺ کی سب سے محبوب بیوی تھیں اور ان کے والد محترم پیغمبر ﷺ کو تمام مردوں سے زیادہ محبوب تھے۔ جب نبی کریم علیہ السلام بیمار ہوئے تو آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات سے علالت کے دن عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں گزارنے کی اجازت طلب کی۔ جس پر انہوں نے اجازت دے دی۔ آپ ﷺ اس حالت میں فوت ہوئے کہ آپ کا سر مبارک سیّدہ وصدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں تھا۔

انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بہت سی احادیث اور شرعی احکام نقل کیے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہا تمام عورتوں سے بڑھ کر فقیہہ تھیں۔ آپ کو فتویٰ دینے والے اصحاب رسول میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روایت میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اسی طرح فتوی میں بھی آپ رضی اللہ عنہا صحابہ کرام کا مرجع تھیں۔

اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں یا خدیجہ؟

درست بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے اپنے فضائل ہیں جو دوسری کے نہیں۔ ان کے درمیان افضلیت کا معاملہ ظاہر نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں کے فضائل برابر ہیں۔ اگر خدیجہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ کی مدد کرنے اور پہلی بیوی ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہ

رسول اللہ ﷺ کی تمام اولاد کی والدہ ہیں تو عائشہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ سے علم حاصل کرنے اور سیکھنے کا شرف حاصل ہے۔ علاوہ ازیں ان کی یہ بھی فضیلت ہے کہ انہوں نے امت کو دین کے مسائل کی تعلیم دی۔ لوگ آپ رضی اللہ عنہا کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ان سے قرب اور رسالت مآب کی ان سے شدید محبت ان کی فضیلت کی دلیل ہیں۔ پانچویں بیوی کا نام میمونہ بنت حارث الہلالیہ ہے۔ رضی اللہ عنہا۔ چھٹی بیوی کا نام حفصہ بنت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہا ہے۔ ساتویں بیوی کا نام زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا ہے، ان سے نبی معظم ﷺ کی شادی اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں سے اوپر کی اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کے عقد نکاح میں اللہ تعالیٰ خود ان کے ولی بنے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا﴾ (الاحزاب: ۳۷)

''پھر جب زید بن حارثہ نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے تجھ سے اس کا نکاح کر دیا۔''

سو ان کا نکاح کرنے والے اللہ رب العزت ہیں۔ اور یہ اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی بیویوں پر فخر کیا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں۔

((زَوَّجَكُنَّ أَهَالِيكُنَّ وَزَوَّجَنِي اللّٰهُ مِنْ فَوْقِ سَبْعِ سَمٰوَاتٍ .))

''تمہاری شادیاں تمہارے گھر والوں نے کی ہیں اور میری شادی اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں سے اوپر کی ہے۔'' [1]

آٹھویں بیوی بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا ہیں۔

نویں بیوی اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

دسویں بیوی، اُمّ حبیبہ رملہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا ہیں۔

گیارھویں بیوی محترمہ صفیہ بنت حیی بن اخطب تھیں۔ رضی اللہ عنہا

ان میں سے ۲ نبی کریم ﷺ سے پہلے فوت ہوئیں اور ۹ آپ ﷺ کی وفات کے بعد۔

[1] بخاری (۷٤۲۰) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

اَلْمُطَهَّرَاتُ الْمُبَرَّآتُ مِنْ كُلِّ سُوْءٍ (۱) أَفْضَلُهُنَّ خَدِيْجَةُ بِنْتِ خُوَيْلِدٍ وَعَائِشَةُ الصِّدِّيْقَةُ بِنْتِ الصِّدِّيْقِ. (۲)

ترجمہ......: یہ سب پاکدامن اور ہر گناہ سے بری ہیں۔ان میں سب سے افضل خدیجہ بنت خویلد اور عائشہ صدیقہ بنت صدیق رضی اللہ عنہم ہیں۔

تشریح......: (۱) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے تمام عورتوں سے افضل اور پاکیزہ عورتوں کا ہی انتخاب فرمایا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْخَبِيْثَاتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولَٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ (النور: ۲٦)

''گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے ہیں۔ اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں۔ یہ لوگ اس سے بری کیے ہوئے ہیں جو وہ کہتے ہیں، ان کے لیے بڑی بخشش اور باعزت روزی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا ان کو اپنے نبی کے لیے منتخب کر لینا ہی ان کے امت کی تمام عورتوں سے افضل ہونے کی دلیل ہے۔

(۲)......پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے سیّدہ عائشہ افضل ہیں یا خدیجہ رضی اللہ عنہا؟ اس بارے میں دو مختلف قول ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں توقف کیا جائے اور (یہ عقیدہ رکھا جائے کہ) ان میں سے ہر ایک کے پاس جو فضیلت ہے وہ دوسری کے پاس نہیں۔

❀❀❀❀❀

اَلَّتِیْ بَرَّأَهَا اللّٰهُ فِیْ کِتَابِهٖ (۱) زَوْجُ النَّبِیِّ ﷺ فِی الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، فَمَنْ قَذَفَهَا بِمَا بَرَّأَهَا اللّٰهُ مِنْهُ فَقَدْ كَفَرَ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ (۲) وَمُعَاوِيَةُ خَالُ الْمُؤْمِنِيْنَ. (۳)

ترجمہ......: جس کا بے گناہ ہونا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے، جو دنیا و آخرت میں نبی اکرم ﷺ کی زوجہ محترمہ ہیں۔ سو جو شخص آپ رضی اللہ عنہا پر اس کام کی تہمت لگائے گا جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بری قرار دیا ہے تو یقیناً اس نے اللہ بلند و بالا کے ساتھ کفر کیا، اور معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما مومنوں کے ماموں ہیں۔''

تشریح......: یہ بات اس فرمان باری تعالیٰ میں بھی بیان ہوئی ہے۔

﴿اَلْخَبِيْثَاتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ (النور: ٢٦)

''گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے ہیں۔ اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں۔ یہ لوگ اس سے بری کیے ہوئے ہیں جو وہ کہتے ہیں۔ ان کے لیے بڑی بخشش اور باعزت روزی ہے۔''

جو شخص صدیقہ کائنات سیّدہ عائشہ بنت الصدیق رضی اللہ عنہما کو بے گناہ نہیں مانتا وہ کافر ہے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور اجماع مسلمین کو جھٹلاتا ہے۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس معاملے سے شدید پریشان ہوتیں تو فرماتیں:

''مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں قرآن نازل کریں گے جس کی تلاوت کی جائے گی۔ بلکہ میرا خیال یہ تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ خواب دیکھیں گے جو مجھے اس معاملے سے بری قرار دے گا۔''[1]

---

[1] بخاری (٤٧٥٠)، فتح الباری (٨/٥٧٤ـ٦١١).

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی فضیلت اور براءت کے بارے میں قرآن عظیم نازل کردیا جسے قیامت تک تلاوت کیا جاتا رہے گا۔

(۲)...... کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو جھٹلاتا ہے، جیسا کہ روافض (شیعوں) کا شیوہ ہے۔ وہ فتنے بھڑکاتے ہیں اور ایسی باتوں کو اپنی کتابوں اور مجلسوں میں پھیلاتے ہیں۔ کیونکہ وہ منافق ہیں مسلمان نہیں ہیں۔ وہ بظاہر تو مسلمان بنتے ہیں لیکن درحقیقت وہ منافق ہیں جو جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوں گے۔

(۳)...... معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے بہت سے فضائل ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ مومنوں کے ماموں ہیں۔ کیونکہ ان کی بہن رملہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کی زوجہ ہیں۔ چونکہ اُمّ المومنین ہیں اور معاویہ ان کے بھائی ہیں لہٰذا معاویہ رضی اللہ عنہ فضیلت کے اعتبار سے مومنوں کے ماموں ہیں نہ کہ نسبت کے اعتبار سے۔

ان کی ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں کاتب وحی بنایا تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے وحی لکھنے والے صحابہ میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے لیے کتابت وحی کی خاطر صرف امانت دار شخص کا ہی انتخاب فرمایا تھا۔

انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جہاد بھی کیا اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں یہ شام کے گورنر رہے۔ جب سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں فتنہ اٹھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا گیا، ان کے بعد حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی گئی اور سیّدنا حسن رضی اللہ عنہ نے خیال کیا کہ وہ بار خلافت نہیں اٹھا سکتے تو وہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہوگئے تاکہ مسلمانوں کے خون کی حفاظت کی جائے اور وہ متحد رہیں۔ اس بات کی خبر رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی دے دی تھی جو کہ آپ ﷺ کا معجزہ ہے۔ آپ ﷺ نے سیّدنا حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا تھا:

((إِنَّ ابْـنِـيْ هٰذَا سَيِّدٌ، وَسَيُصْلِحُ اللّٰهُ بِهٖ بَيْنَ طَائِفَتَيْنِ عَظِيْمَتَيْنِ

مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ .))

"بے شک میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان صلح کرائے گا۔" ❶

سیّدنا حسن رضی اللہ عنہ کے ان کے حق میں دستبردار ہونے میں مسلمانوں کے بہت عظیم فوائد مضمر تھے۔ پھر تمام لوگ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق ہو گئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں پر عدل وحکمت کے ساتھ اور شرعی طریقے پر حکومت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں عقل، دانائی اور مسلمانوں پر نرمی کے اوصاف ودیعت کر رکھے تھے۔

جناب معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما گمراہ فرقوں کے حلق کا کانٹا بن گئے اور ان کے گلے کی ہڈی بن گئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ان کا راستہ بند کر دیا اور جس سال حسن رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہوئے اسے مسلمانوں نے "عام الجماعۃ" کا نام دیا ہے۔ کیونکہ اس سال مسلمانوں کی جماعت بن گئی اور سب متحد ہو گئے۔ یہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی فیاضی کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے اتحاد اور ان کے فائدے کو اپنے فائدے پر ترجیح دی، جس سے ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی صادق آئی کہ "اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کی صلح کروائے گا۔"

❀❀❀❀❀

وَكَاتِبُ وَحْيِ اللّٰهِ وَأَحَدُ خُلَفَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ رضی اللہ عنہ . (۱)

ترجمہ......: کاتب وحی ہیں اور مسلمانوں کے خلفاء میں سے ایک خلیفہ ہیں رضی اللہ عنہ۔

---

(۱) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بہت سے فضائل ہیں:

۱......آپ رضی اللہ عنہ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لہٰذا آپ کو شرف صحابیت حاصل ہے۔

۲......آپ رضی اللہ عنہ نبی کریم علیہ السلام کی ایک زوجہ محترمہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بھائی ہیں۔ چنانچہ آپ

---

❶ مسند احمد (۳۳/۳٤) (۲۰۳۹۲)۔ بخاری (۲۷۰٤) راوی حضرت ابوبکرہ ہیں۔ رضی اللہ عنہ

مومنوں کے ماموں ہیں۔

۳......آپ رضی اللہ عنہ نے پیغمبر علیہ السلام کی معیت میں جہاد کیا۔

۴......خلیفہ ثانی سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انہیں سلطنت اسلامیہ کے ایک عظیم صوبے شام کا گورنر بنایا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے بہت اچھے انداز سے حکمرانی کی اور لوگ آپ کے حسن سیاست کی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ سے بہت محبت کرتے تھے۔

۵......ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متحد کیا اور آپ رضی اللہ عنہ کے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ نے شہادت عثمان سے لے کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دستبرداری تک مسلمانوں میں بھڑکنے والے فتنوں کو ختم کیا۔

۶......آپ رضی اللہ عنہ کے جملہ فضائل میں سے ایک آپ رضی اللہ عنہ کا کاتب وحی ہونا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل ہونے والی وحی کی کتابت کے لیے صرف امانتدار شخص کو ہی منتخب فرمایا تھا۔

❀❀❀❀

فصل نہم:

حکمرانوں کے اپنی رعایا پر حقوق

وَمِنَ السُّنَّةِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ لِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ، وَأُمَرَاءِ الْمُؤْمِنِيْنَ بَرِّهِمْ وَفَاجِرِهِمْ (۱) مَالَمْ يَأْمُرُوْا بِمَعْصِيَةِ اللّٰهِ (۲) فَإِنَّهُ لَاطَاعَةَ لِأَحَدٍ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ. (۳)

ترجمہ......: مسلمان حکمرانوں اور مومنوں کے حکام کی بات سن کر ان کی اطاعت کرنا بھی سنت ہے۔ خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ جب تک وہ معصیت الٰہی کا حکم نہ دیں۔ کیونکہ اللہ کی معصیت میں کسی کی اطاعت جائز نہیں۔

تشریح......: (۱) یہ گذشتہ صفحات میں بیان ہونے والی بحث ''ہر مسلمان حکمران کی معیت میں جہاد اور حج کرنا واجب ہے، خواہ وہ اچھا ہو یا برا'' کا ہی تکملہ ہے۔ یعنی اسی طرح سمع و طاعت (سن کر عمل کرنا بھی) واجب ہے۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''میں تمہیں اللہ کے تقویٰ اور امیر کی بات کو سن کر اس پر عمل کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ خواہ کسی غلام کو ہی تمہارا امیر بنا دیا جائے۔'' ❶

(مسلمان) حکمرانوں کی بات سن کر اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ

---

❶ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾

(النساء: ۵۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں۔ پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔''

مسلمان حکمرانوں کے احکامات کو سن کر ان پر عمل کرنا اہل سنت کا مذہب ہے۔ اور ان کی بات پر توجہ نہ دینا اور اطاعت نہ کرنا اہل بدعت کا مذہب ہے۔

(۲)...... مسلمان حکمرانوں کی بات ماننا اس وقت تک واجب ہے جب تک وہ معصیت الٰہی یعنی کسی حرام کام کے ارتکاب یا کسی فرض کو چھوڑنے کا حکم نہ دیں۔ جب وہ کسی گناہ کا حکم دیں تو اس گناہ کے کام میں ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ اس کے علاوہ باقی امور میں ان کی اطاعت جاری رکھی جائے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب وہ معصیت الٰہی کا حکم دے دیں تو ان کی خلافت ختم ہو جائے گی۔ یا ان کے خلاف جنگ جائز ہو جائے گی۔ بلکہ ہم اس معصیت کے کام سے اجتناب کریں گے اور اس کے علاوہ باقی امور میں اس کی اطاعت پر کاربند رہیں گے۔

(۲)...... کیونکہ ارشاد پیغمبر ﷺ ہے:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ .))

''خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔''[1]

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اگر شرک کے علاوہ بھی کسی گناہ کا حکم دے دیں تو ہم ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیں۔ بلکہ ہم معصیت الٰہی سے باز رہیں گے اور اطاعت امیر پر

[1] بغوی نے اسے حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے شرح السنہ (۱۰/۴۴) میں بیان کیا ہے اور اس کا شاہد مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے (۱۰۹۵، ۲۰۶۵۳، ۲۰۶۵۶) جو حضرت حکم بن عمرو الغفاری سے مروی ہے۔

بھی کاربند رہیں گے۔

❀❀❀❀❀

وَمَنْ وَلِيَ الْخَلَافَةَ وَاجْتَمَعَ عَلَيْهِ النَّاسُ، وَرَضُوْا بِهِ أَوْ غَلَبَهُمْ بِسَيْفِهِ حَتّٰى صَارَ الْخَلِيْفَةَ وَسُمِّيَ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَجَبَتْ طَاعَتُهُ، وَحَرُمَتْ مُخَالِفَتُه، وَالْخُرُوْجُ عَلَيْهِ، وَشُقّ عَصَا الْمُسْلِمِيْنَ. (۱)

ترجمہ......: جسے خلیفہ بنادیا جائے اور لوگ اس پر متفق اور راضی ہوجائیں یا وہ تلوار کے ساتھ ان پر غلبہ پالے حتیٰ کہ وہ خلیفہ بن جائے اور اس کا نام امیر المومنین رکھ دیا جائے تو اس کی اطاعت واجب ہوجاتی ہے۔ اس کی مخالفت اور اس کے خلاف جنگ کرنا حرام ہے اور مسلمانوں کی بغاوت کو کچل دیا جائے گا۔

تشریح......: (۱) اسلام میں خلافت، ولایت یا امامت تین طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے منعقد ہوتی ہے۔

۱...... اہل حل وعقد اسے منتخب کرلیں جیسا کہ سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلافت ملی اور ان کی بیعت اہل حل وعقد کے اجماع سے مکمل ہوئی تھی۔

۲...... جب خلیفہ یہ ذمہ داری اپنے بعد کسی کو سونپے تو اس کی اطاعت واجب ہے جیسا کہ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ذمہ داری سونپ دی تھی۔

۳...... جب حکمران بزور شمشیر مسلمانوں پر غالب آجائے اور انہیں اپنی اطاعت پر مجبور کردے، جیسا کہ عبدالملک بن مروان اور دیگر مسلمان بادشاہ لوگوں کو بزور شمشیر محکوم بنالیتے تھے اور لوگ ان کے مطیع ہوجاتے تھے تو ایسے حکمران کی اطاعت بھی مسلمانوں پر واجب ہے۔ تاکہ اتحاد باقی رہے، اختلاف پیدا نہ ہو اور مسلمان خونریزی سے محفوظ رہیں۔ ان تین طریقوں سے ہی کسی کی حکومت قائم ہوسکتی ہے۔

❀❀❀❀❀

وَمِنَ السُّنَّةِ هِجْرَانِ أَهْلِ الْبِدْعَةِ . (۱)

ترجمہ......: اور اہل بدعت سے ترک تعلق بھی سنت ہے۔

تشریح......: (۱) مصنف رحمہ اللہ کی یہاں سنت سے مراد رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے خواہ وہ اقوال و افعال کی صورت میں ہو یا تقریر (سکوت) کی صورت میں۔ یہاں سنت سے مراد مستحب نہیں ہے۔ کیونکہ اہل بدعت سے بائیکاٹ واجب ہے محض مستحب نہیں۔

سنت کا لفظ کبھی مطلق بول کر اس سے طریقہ رسول ﷺ مراد لیا جاتا ہے اور کبھی اس سے مراد مستحب ہوتا ہے۔ لیکن اکثر طور پر پہلا معنی ہی مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کہا جائے "من السنة كذا" تو اس سے مراد طریقہ رسول ﷺ ہی ہوتا ہے۔

"هجر أهل البدعة" ہجر کا معنی ہے: ترک کرنا اور چھوڑنا۔ اپنے دین کی حفاظت کے لیے دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنا بھی اسی سے ماخوذ ہے۔ اس کو ہجرت اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی وطن کو دین میں فتنے کے ڈر سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ (المدثر: ۵) "اور پلیدگی کو پس چھوڑ دے۔"

"الرجز" سے مراد بت ہیں اور "واهجر" کا معنی ہے "تو چھوڑ دے۔" یعنی آپ بتوں کی عبادت اور بتوں کے پجاریوں کو چھوڑ دیں۔

اور ارشاد رسالت مآب ﷺ ہے:

((وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ .))

"مہاجر وہ ہے جو اللہ کے منع کردہ کاموں کو چھوڑ دے۔" [1]

چنانچہ ہجرت کا معنی اہل بدعت کی دوستی، ہم نشینی، ملاقات اور ان سے علم کے حصول کو ترک کردینا ہے۔ البتہ نصیحت اور بیان (حق) کے لیے ان سے تعلق رکھنا جائز ہے۔ لیکن ان

[1] یہ حدیث حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مسند احمد (۱۱/۶۶) (۶۶۱۵)۔ بخاری (۱۰) اور ابوداؤد (۲۴۸۱) میں مروی ہے۔

سے محبت وانس کا تعلق جائز نہیں۔ کیونکہ اس میں ان کی بدعات کی پسندیدگی ظاہر ہوتی ہے اور ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور ان کو اپنے کاموں میں مزید تقویت ملتی ہے۔

ان سے قطع تعلقی اس وقت تک واجب ہے جب تک لوگ ان کے شر کو پہچان کر ان سے دور نہیں ہوجاتے۔ کیونکہ عموماً بدعتی لوگ نصیحت کو قبول نہیں کرتے اور نہ ہی وہ اللہ کے حضور توبہ کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود کو حق پر سمجھتے ہیں۔ شیطان ان کے سامنے بدعت کو خوبصورت کر کے پیش کرتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں ہے کہ شیطان کو بدعت معصیت الٰہی سے بھی زیادہ پسند ہے۔ کیونکہ بدعتی اپنی بدعت سے توبہ نہیں کرتا۔ جبکہ گنہگار کو علم ہوتا ہے کہ وہ حرام کام کا ارتکاب کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ بدعتی کے برعکس شرمندہ ہو کر اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے اور اللہ کے حضور توبہ کر لیتا ہے۔ جبکہ بدعتی خود کو حق پر سمجھتا ہے اور اپنے کام کو جائز سمجھتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی بدعت سے باز نہیں آتا۔ بدعت کی تعریف یہ ہے:

"اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کرنا جو اس میں نہ ہو۔" چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ، فَهُوَ رَدٌّ.))

"جس نے ہمارے اس دین میں ایسی چیز ایجاد کی جو اس میں نہیں ہے تو وہ عمل مردود ہے۔" ❶

دوسرا ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ))

ترجمہ......: "جس نے کوئی عمل کیا جس کا ہم نے حکم نہیں دیا تو اس کا وہ عمل مردود ہے۔" ❷ اور آپؐ نے یوں بھی فرمایا ہے:

((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ مِنْ

---

❶ مسند احمد: ۱۵۷/۴۳۔ صحیح البخاری: ۲۶۹۷.

❷ مسند احمد: ۶۱/۴۲۔ صحیح مسلم: ۱۸/۱۷۱۸۔ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا.

بَعْدِي، تَمَسَّكُوا بِهَا، وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ .))

ترجمہ......: ''تم پر میری اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت کو پکڑنا واجب ہے، اسے داڑھوں سے مضبوطی سے تھام لو۔ اور (دین میں) نئے کام ایجاد کرنے سے بچو۔ کیونکہ ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔'' [1]

اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے کہ ان کے مشروع کردہ اعمال کے علاوہ کسی عمل کے ساتھ اس کا قرب حاصل کیا جائے۔ کیونکہ دین مکمل ہو چکا ہے۔ (الحمد للہ)

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ: ۳)

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ اس وقت فوت ہوئے جب اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے دین مکمل کر دیا تھا۔ لہٰذا اس میں اضافہ اور پسند کی چیزیں داخل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

اور جو کوئی بدعت ایجاد کرتا ہے وہ درحقیقت دین پر ناقص ہونے کا الزام لگاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو جھٹلاتا ہے ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾

بدعت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ بدعت اصلیہ:

کوئی شخص ایسی عبادت ایجاد کر لے جس کی دین میں کوئی بنیاد نہ ہو۔ جیسے میلاد النبی کی محفلیں منعقد کرنا۔ اس کی دین میں کوئی بنیاد نہیں۔ نہ رسولوں کے میلاد منانے کی اور نہ ہی ان کے علاوہ اولیاء اور نیک لوگوں کے میلاد منانے کی۔ اگرچہ لوگ اس کو اچھا سمجھتے ہیں، اس میں

[1] مسند احمد: ۲۸/۳۷۵۔ ابوداؤد: ۴۶۰۷۔ الترمذی: ۲۶۷۶.

رغبت رکھتے ہیں اور اس بات کو پھیلاتے ہیں کہ یہ نیکی ہے۔ لیکن یہ بدعت اور گناہ ہے۔ کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مخالف ہے۔ ”فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ.“ خواہ لوگ اسے بدعت حسنہ کہتے ہیں۔

الغرض حدیث رسول کی نص اس بات کی دلیل ہے کہ تمام بدعات گمراہی ہیں۔ سو جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کچھ بدعات حسنہ بھی ہیں وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو جھٹلاتا ہے۔ کیونکہ دین میں کوئی بدعت حسنہ نہیں بلکہ دین وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے مشروع کیا ہے۔ جبکہ بدعات شیطان کی گمراہیوں میں سے ہیں۔

اگر ہم اس راہ کو کھول دیں گے تو دین کا حلیہ بگڑ جائے گا۔ ہر شخص اپنی پسند کی چیزیں ایجاد کر لے گا اور ہر کوئی اپنی منشاء کے مطابق عمل کر کے سنتوں کا انکار کرے گا۔ کیونکہ سنت اور بدعت کبھی جمع نہیں ہوسکتیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

((مَا أَحْدَثَ النَّاسُ بِدْعَةً إِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ.))

”جب کبھی لوگ بدعت ایجاد کر لیتے ہیں تو اس کی مثل ایک سنت اٹھالی جاتی ہے۔“ [1]

تو دین سنتوں کی بجائے بدعات اور من گھڑت چیزوں میں تبدیل ہو جائے گا۔ لہٰذا بدعت کا دروازہ کبھی نہیں کھولنا چاہیے اور نہ ہی اس میں کبھی سستی کرنی چاہیے۔

۲۔ بدعت نسبی:

بدعت نسبی یہ ہے کہ وہ چیز اصلاً تو مشروع ہو لیکن اس کو کسی ایسے وقت یا جگہ کے ساتھ خاص کر دیا جائے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے مشروع نہیں کیا۔ مثلاً بعض خاص دنوں کے روزے رکھنا۔ جیسے پندرہ شعبان کا روزہ یا رجب کے مہینے کو خاص کر کے اس میں روزے رکھنا، یہ بدعت ہے۔

روزہ تو دین میں مشروع ہے۔ لیکن اسے بلا دلیل کسی جگہ، کسی وقت کے ساتھ خاص کر دنیا

[1] امام احمدؒ نے اسے حضرت غضیف بن حارث الثمالی سے مسند احمد (۲۸/۲،۱۷۲،۱۷۳) (۱۶۹۷۰) میں بیان کیا ہے۔

دین میں بدعت ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ شرعی عبادات کے لیے کسی جگہ یا زمانے کو خاص کرنے کی دین میں کوئی دلیل نہیں۔ اسے بدعت اضافی (بدعت نسبی) کہتے ہیں۔ کیونکہ آپ نے ایک شرعی عبادت کے ساتھ ایک بدعت کو ملا دیا۔ بدعت خواہ اصلیہ ہو یا اضافیہ اسے بدعتی کی طرف ہی لوٹا دیا جائے گا۔ اس سے اور اس کو ایجاد کرنے والے سے بچنا چاہیے۔

جن دنوں ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کوفہ کے امیر تھے، وہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ کے مفتی اور قاضی تھے۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ابوعبدالرحمٰن میں نے ایک عجیب چیز دیکھی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا وہ کیا؟ فرمایا: ابھی آپ بھی دیکھ لیں گے۔ دونوں حضرات مسجد کی طرف چل دیے۔ مسجد میں انہوں نے کچھ لوگوں کو اکٹھے بیٹھے دیکھا۔ ان کے پاس کنکریوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک شخص بتا رہا تھا کہ ایسے ایسے سبحان اللہ کہو اور وہ کنکریوں پر اسے شمار کر رہے تھے۔ اتنی مرتبہ لا الہ الا اللہ پڑھو، اتنی مرتبہ اللہ اکبر پڑھو اور باقی لوگ اللہ اکبر، سبحان اللہ اور لا الہ الا اللہ کو کنکریوں پر گن گن کر پڑھ رہے تھے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان کے پاس کھڑے ہو گئے اور فرمایا:

> ''تم یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو یا پھر بہت بڑی بدعت کے مرتکب ہو رہے ہو۔ انہوں نے کہا: ''اے ابوعبدالرحمٰن ایسی کیا بات ہے؟ ہم نیکی کے ارادے سے اللہ کا ذکر کر رہے ہیں۔'' تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کتنے ہی لوگ نیکی کرنا چاہتے ہیں لیکن انہیں ثواب نہیں ملتا۔''
>
> پھر آپ رضی اللہ عنہ نے ان کے اس عمل کی مذمت فرمائی۔

سبحان الله، لا اله الا الله اور الله اکبر کہنا مطلوب ہے لیکن اس طریقے کے بغیر، اس طرح جمع ہو کر، محدود عدد کے بغیر مطلوب ہے الا کہ کوئی دلیل مل جائے۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی دلیل ملنے پر تسبیح، تہلیل اور تکبیر کو محدود کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طریقہ کی تردید کی حالانکہ وہ مسجد میں اللہ کا ذکر ہی کر رہے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ جو طریقہ ایجاد کیا تھا یہ بدعت تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ان کے ذکر کی تردید نہیں فرمائی بلکہ ان کی اس بدعت کی تردید فرمائی اور ان پر سختی کی۔ ان کو اور ان کے فرقے کو برا بھلا کہا۔

راوی فرماتے ہیں:

''میں نے ان سب کو یا ان میں سے اکثر کو جنگ نہروان میں اپنے خلاف نیزہ زنی کرتے ہوئے دیکھا۔''

ان کی بدعت نے انہیں خوارج کے مذہب کی طرف پھیر دیا۔ چنانچہ انہوں نے واقعہ نہروان میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کی۔ جنگ نہروان امیر المومنین سیّدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور خوارج کے درمیان ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے خوارج کا ساتھ دیا، یہ بدعت کا ہی نتیجہ تھا۔ (اللہ کی پناہ یہ بدعت بدعتی آدمی کو کس طرف لے جاتی ہے۔)

لہٰذا اہل سنت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اہل بدعت سے قطع تعلقی کر لیتے ہیں۔ تا آنکہ وہ اپنی بدعت سے باز آ جائیں۔ کیونکہ اگر ان کے ساتھ قطع تعلقی نہ کی جائے تو اس سے ان کو تقویت ملے گی۔ ان کی حوصلہ افزائی ہوگی اور لوگ دھوکے میں مبتلا ہو جائیں گے۔ جب اہل علم اور باوقار لوگ ان سے بائیکاٹ کر لیں گے تو لوگ بھی انہیں چھوڑ دیں گے اور یہ لوگوں کے سامنے ذلیل ہو جائیں گے۔

اسی لیے عہد صحابہ اور فضیلت والے ادوار میں بدعتیں چھپی ہوئی تھیں۔ یہ چوتھی صدی ہجری کے بعد ظاہر ہوئیں۔ فضیلت والے ادوار کے گزر جانے کے بعد لوگوں میں بدعتیں ظاہر ہوئیں۔

وہ بات نہیں کہنی چاہیے جو آج کے دور میں بعض جاہل لوگ کہتے ہیں کہ بدعتیوں کی اچھائیوں کا بھی تذکرہ کیا جائے اور ان کی بدعات کو بھی بیان کیا جائے۔ اس کو وہ موازنات کا نام دیتے ہیں۔

اس سے بدعت رواج پکڑتی ہے ہمیں بدعتیوں کی اچھائیاں گننے کا حکم نہیں دیا گیا۔ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہمیں ان کی نیکیوں کی خبر کس نے دی ہے۔ اور ہمیں کیا علم کہ یہ اللہ کے ہاں بھی نیکیاں ہیں؟ ہمیں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ ان کی اچھائیوں کو تلاش کریں۔ بلکہ ہمیں تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم غلطیوں پر متنبہ ہوں تاکہ لوگ اس سے بچ سکیں۔ اور جو شخص غلطی پر ہے جب اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کریں تو وہ توبہ کرلے۔ جبکہ ان کی اچھائیوں اور خصوصیات کا تذکرہ کرنے سے لوگوں کے ہاں بدعت کا معاملہ ہلکا ہوجائے گا۔

❀❀❀❀❀

وَمُبَايَنَتُهُمْ (۱) وَتَرْكُ الْجِدَالِ، وَالْخُصُومَاتِ فِي الدِّيْنِ (۲) وَتَرْكُ النَّظرِ فِيْ كُتُبِ الْمُبْتَدِعَةِ وَالْإِصْغَاءِ إِلَى كَلَامِهِمْ. (۳)

ترجمہ......: ان سے الگ رہنا، ان سے دین کے معاملہ میں بحث اور جھگڑے ترک کرنا، اہل بدعت کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی گفتگو کی طرف میلان کو ترک کردینا بھی سنت ہے۔

تشریح......: (۱) یعنی لوگوں کو ان سے بچانے کے لیے ان سے علیحدگی اختیار کرنی چاہیے اور ان سے دوستی اور ان کی مجالس میں بیٹھنے سے باز رہنا چاہیے۔ تاکہ وہ لوگوں میں رسوا ہوجائیں اور معاشرے میں کمزور ہوکر رہ جائیں۔ جیسا کہ قُرون مفضلہ کے دور میں اہل بدعت بے حیثیت تھے۔ ان کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی اور انہیں درخور اعتناء نہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ تو قرون [1] مفضلہ کے بعد ظاہر ہوئے ہیں۔

(۲)......اسی طرح دین کے بارے میں جھگڑوں کو ترک کردینا بھی سنت ہے۔ الحمد للہ دین واضح ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کی وضاحت فرمادی ہے۔ سو ہم پر اس کو بجالانا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ ہم عبادات اور امور دین میں جھگڑا نہیں کرتے۔ اور

---

[1] یعنی وہ ادوار جن کو رسول اللہ ﷺ نے بہترین ادوار کہا ہے اور وہ یہ ہیں: عہد نبوی، عہد صحابہ، عہد تابعین۔ رضی اللہ عنہم

اس بات کی کرید نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں کام کو مشروع کیوں کیا؟ فلاں کام کا حکم کیوں دیا؟ اس میں کیا فائدہ ہے؟ جیسا کہ بعض لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنا وقت انہی کاموں میں گزار دیتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ ویسا کیوں ہے؟ اس میں کیا حکمت ہے؟ گویا کہ انہیں شک ہوتا ہے۔ جبکہ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ جب اللہ ربّ العالمین اور اس کے رسول ﷺ سے کوئی صحیح دلیل مل جائے تو اس حکم کو بجالائیں اور اس بارے میں بحث اور جھگڑا کرنا چھوڑ دیں:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ (الاحزاب: ۳۶)

''اور کبھی بھی نہ کسی مومن مرد کا حق ہے اور نہ کسی مومن عورت کا کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے ان کے معاملے میں اختیار رہو۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے سو یقیناً وہ گمراہ ہو گیا، واضح گمراہ ہونا۔''

اگر آپ کو حکمت معلوم ہو جائے تو الحمد للہ۔ اور اگر معلوم نہ ہو تو آپ حکمت تلاش کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ آپ کی ذمہ داری محض دلیل کو پہچاننا ہے۔ جب آپ کو دلیل معلوم ہو جائے تو آپ اس حکم پر عمل کریں، آپ کا عمل حکمت کی معرفت پر موقوف نہیں۔

اہل ایمان کا راستہ یہی ہے۔ جبکہ بحث اور جھگڑا کرنا گمراہ لوگوں اور شک کرنے والوں کا طریقہ ہے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا حساب لینے والوں کا شیوہ ہے۔ حالانکہ اس سے وقت کا ضیاع ہوتا ہے اور ان کے نزدیک اوامر ونواہی ناقص ٹھہرتے ہیں۔ ان باتوں کے پیچھے پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ شیطان کا کام ہے (اللہ کی پناہ) یہ جھگڑا بے کار ہے۔ البتہ جس بحث اور جھگڑے سے دین کی فصاحت اور شبہات کا ردّ ہو وہ واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر علیہ السلام سے فرماتے ہیں:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ﴾ (النحل : ۱۲۵)

''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا۔ اور ان سے اس طریقے کے ساتھ بحث کر جو سب سے اچھا ہے۔ بے شک تیرا رب ہی زیادہ جاننے والا ہے جو اس کے راستے سے گمراہ ہوا۔ اور وہی ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے۔''

﴿وَ لَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ﴾ (العنکبوت : ٤٦)

''اور اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو۔ الا یہ کہ وہ لوگ جنھوں نے ان میں سے ظلم کیا۔''

چنانچہ جس بحث کا مقصد غلبہ حق، شبہات کا رد اور باطل کا قلع قمع کرنا ہو وہ قابل تعریف ہے۔ کیونکہ وہ حق کو بیان کرنے اور دین کی حمایت کی غرض سے ہوتا ہے۔ اور جس بحث کا مقصد تکلف، تنگی اور لوگوں کے سامنے اپنی شخصیات کا اظہار ہو وہ جائز نہیں۔ کیونکہ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ لوگوں کے مابین دشمنی پیدا کرتی اور دلوں میں افزائش نفرت کا باعث بنتی ہے۔ لہٰذا یہ ممنوع ہے۔

سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صبیغ نامی ایک شخص جو بعض مسائل کے بارے میں بحث کیا کرتا تھا، مثلاً وہ قرآن کے متشابہ مقامات کے متعلق سوال کرتا تھا، جناب عمر رضی اللہ عنہ نے اسے طلب کر کے سزا دی۔ پھر اسے اس وقت تک مدینہ سے جلاوطن کیے رکھا جب تک اس نے اللہ کے حضور تائب ہو کر اپنے نظریات سے رجوع نہ کر لیا۔ [1]

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مقصد صرف امور عبادات میں بحث، مناظرے کرنا

[1] کتاب کے ص ۱۰۲ پر تعلیق نمبر ا۔

اور امور دینیہ میں شکوک وشبہات پیدا کرنا تھا۔ یہ ایک برا آدمی تھا جسے سزا دینا اور لوگوں کے سامنے ایسی بحثیں کرنے سے روکنا ضروری تھا۔

بعض جاہل لوگوں کا آج کے دور میں احادیث کو ضعیف قرار دینا اور ان کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنا اسی میں داخل ہے۔ یہ لوگ عوام الناس میں ایسی بحثیں کرتے ہیں۔ حالانکہ عوام الناس کو اس کا کیا فائدہ؟ اس سے لوگ دین اور سنت کے متعلق شک میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ایسی باتیں عوام الناس، جاہلوں اور ابتدائی طالب علموں کے سامنے نہیں کرنی چاہئیں۔

یہ تو ان علماء کا کام ہے جو جرح وتعدیل اور شرعی امور میں خاص ادراک رکھتے ہوں۔ عام لوگوں کے سامنے ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

(۳)...... یہ گذشتہ بحث کا ہی تکرار ہے۔ کیونکہ جب بدعتیوں سے قطع تعلقی ضروری ہے تو ان کی کتب سے کنارہ کشی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ بعض اہل بدعت مر چکے ہیں، ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کی کتابیں موجود ہیں۔ لہٰذا ایک مبتدی شخص جس میں اہلیت نہیں اسے یہ کتابیں نہیں پڑھنی چاہئیں۔ کیونکہ وہ اس سے گمراہ ہوجائے گا اور مرعوب ہوجائے گا۔

البتہ جو شخص پختہ علم والا ہو اسے ایسی کتابوں کا ردّ کرنے کے لیے اور لوگوں کو ان سے بچانے کے لیے ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ لیکن جس کے پاس حق و باطل اور صحیح و غلط کی پہچان کی معرفت کی اہلیت نہ ہو اسے اہل بدعت اور گمراہ فرقوں کا مطالعہ نہیں کرنا چاہیے تاکہ وہ اس کی فکر اور عقیدے میں داخل نہ ہوجائے۔ یہ کتابیں بعض اوقات بڑی خوشنما عبارتوں پر مشتمل ہوتی ہیں جو ایک ایسے شخص کو نقصان دیتی ہیں جس کے پاس بصیرت نہیں ہوتی۔ کیونکہ اکثر جھگڑا اور مباحثہ کرنے والے فتنہ پیدا کرنے کے لیے فصاحت اور زباندانی کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ منافقوں کے متعلق فرماتے ہیں:

﴿وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ﴾ (المنافقون : ٤)

''اور اگر وہ بات کریں تو تو ان کی بات پر کان لگائے گا۔''

کیونکہ وہ بہت اچھے انداز سے گفتگو کرتے تھے حتیٰ کہ سننے والا سمجھتا تھا کہ وہ درست کہہ

رہے ہیں۔ وہ اپنی باتوں اور دلائل کو بڑا بنا سنوار کر پیش کرتے تھے۔ ان کے لیے اچھے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ حالانکہ وہ منافق تھے جن کا ٹھکانہ آگ کا سب سے نچلا گڑھا ہوگا۔

شاعر کہتا ہے:

فِیْ زُخْرُفِ الْقَوْلِ تَزْیِیْنٌ لِبَاطِلِهٖ
وَالْحَقُّ قَدْ یَعْتَرِیْهِ سُوْءُ تَعْبِیْرِ

''بات کو ملمع کر کے پیش کرنے سے باطل بات کو بھی خوبصورت بنا دیا جاتا ہے جبکہ بعض اوقات برا اسلوب حق کو بھی بدنما بنا دیتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ (الانعام: ۱۱۲)

''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیطانوں کو دشمن بنا دیا۔ ان کا بعض بعض کی طرف ملمع کی ہوئی بات دھوکا دینے کے لیے دل میں ڈالتا رہتا ہے۔''

گویا ملمع کاری کا اصل مقصد کسی چیز کو خوبصورت اور خوشنما بنانا ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر گمراہ لوگ اپنی کتابوں اور اپنے خطبات میں عبارتوں کو خوشنما بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب کوئی جاہل انسان انہیں سنتا یا پڑھتا ہے تو اسے یہ خوبصورت لگتی ہیں اور اس کے دل میں اتر جاتی ہیں۔ لہٰذا اہل بدعت کی کتب کے مطالعہ اور ان کے دروس و خطبات اور پروگراموں کو سننے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ صرف ان کو رد کرنے کی غرض سے سننا چاہیے جبکہ انسان حق و باطل کو پہچانتا ہو اور اس پر قادر بھی ہو۔

اہل بدعت کی کتابوں اور خود ان کے ساتھ تعلقات کا تقاضا یہی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کی کتابوں کو ثقافتی طور پر چھاپنا اور عام کرنا چاہیے۔ ان کی اپنی آراء ہیں۔ لوگ اپنی آراء میں آزاد ہیں اور انہیں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا حق ہے۔

ہم ان سے کہتے ہیں: یہ جائز نہیں۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کے لیے شر کا دروازہ کھل جائے گا۔ بلکہ اہل بدعت اور گمراہ لوگوں کی کتابوں کو مسلمانوں کی لائبریریوں اور بازاروں سے نکال دینا چاہیے۔خود ان کی ذاتی تحویل سے بھی نکال لینی چاہئیں۔ کیونکہ یہ زہر کی مانند ہیں۔ جب زہریلی اشیاء کو پھیلنے سے روکا جاتا ہے تو ...... یہ تو زہر سے بھی بڑھ کر نقصان دہ ہیں۔ جیسے مریضوں کے جسموں کو صحت یاب کرنے کے لیے زہر سے بچایا جاتا ہے، ان کتابوں سے بچانا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ زہر صرف جسم کو نقصان پہنچاتا ہے جبکہ گمراہ کن کتابیں ایمان اور عقل کو نقصان پہنچاتی ہیں۔سو، یہ زیادہ خطرناک ہیں، لہٰذا دین و عقیدہ کی سلامتی کے لیے ان سے بچنا ضروری ہے۔ چنانچہ ہم بدعتی اور گمراہ لوگوں کی کتابوں کے متعلق ڈھیل نہیں دیتے۔ ہم کہتے ہیں یہ کیسی ثقافت ہے؟ یہ بجا ہے کہ ان سے انسان کی عقل وفکر میں وسعت آتی ہے لیکن یہ تو باطل کو پروان چڑھانے والی بات ہے۔

لہٰذا اہل بدعت کی کتابوں کے مطالعہ سے، ان کے ساتھ تعلقات رکھنے سے اور ان کی باتیں سننے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ان کے بعد ان کی کتابوں کا باقی رہنا اور بڑی مصیبت ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ مر گئے اور معاملہ ختم ہوگیا ہے۔ بلکہ وہ جسمانی طور پر تو مر چکے ہیں لیکن ان کے افکار ان کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کے پیچھے ایک قوت و طاقت ہے جو انہیں رواج دے رہی ہے۔ لہٰذا ان سے مکمل طور پر بچنا چاہیے۔ کیونکہ یہ مسلمانوں کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں۔

❀❀❀❀❀

وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ فِي الدِّيْنِ بِدْعَةٌ. (۱)

ترجمہ......: اور دین میں ہر نیا کام بدعت ہے۔

تشریح......: (۱) پہلے مصنف نے بدعت اور اہل بدعت سے خبردار کیا، اب یہ وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ بدعت کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"كُلُّ مُحْدَثَةٍ فِي الدِّيْنِ بِدْعَةٌ."

"دین میں ہر نیا کام بدعت ہے۔"

کیونکہ دین بدعت کو قبول نہیں کرتا۔ دین صرف وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مشروع کیا ہے۔ کسی کا قول و فعل صرف اسی صورت ہی قبول کیا جائے گا جب اس کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول سے کوئی دلیل ملے گی۔ دین میں تو ہر نیا کام بدعت ہے۔

البتہ جہاں تک نفع بخش دنیاوی امور میں نئی ایجادات کا تعلق ہے تو ان میں اصل جواز موجود ہے۔ الحمد للہ بہت سی مصنوعات اور ایجادات جو پہلے موجود نہ تھیں اب منظر عام پر آئی ہیں۔ انہیں ہم بدعت نہیں کہتے۔ بلکہ ہم کہتے ہیں: "انہیں اللہ نے جائز قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ امور دین سے متعلق نہیں ہیں۔ بلکہ روزمرہ کے ان کاموں سے تعلق رکھتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے فائدے کے لیے پیدا فرمایا ہے۔" چنانچہ ہم گاڑی، ہوائی جہاز اور بحری جہاز پر سواری کرتے ہیں۔ لاؤڈ سپیکرز اور ریکارڈر استعمال کرتے ہیں۔ یہ سب ایجادات ہیں، دین سے تعلق نہیں رکھتیں۔ یہ تو محض لوگوں کے لیے وسائل نفع ہیں۔ کوئی انہیں اچھے کاموں میں استعمال کرے گا تو یہ نعمت اور اطاعت الٰہی میں مددگار ثابت ہوں گی اور اگر کوئی انہیں برے مقاصد کے لیے استعمال کرے گا تو یہ اس کی اپنی غلطی ہے۔ ورنہ تو یہ لوگوں کے فائدے کے لیے ہی ایجاد کی گئی تھیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ بدعت ان کاموں کو کہا جاتا ہے جو دین میں نئے ایجاد کئے جائیں۔ لیکن جو چیزیں دنیاوی امور و ایجادات سے تعلق رکھتی ہیں وہ بدعت نہیں ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تیروں، تلواروں اور نیزوں کے ساتھ جہاد کرتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ بہت سا جدید اسلحہ ایجاد ہو چکا ہے جو پہلے موجود نہ تھا۔ مثلاً میزائل، جنگی جہاز، ٹینک اور بم وغیرہ۔ کیا ہم کہتے ہیں کہ یہ بدعت ہے اور ہم انہیں پسند نہیں کرتے؟ نہیں، بلکہ ہمارے اوپر اُن چیزوں کو لینا واجب ہے جو دشمن کا قلع قمع کرنے میں ہماری مدد و معاون

ثابت ہوں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ﴾

(الانفال : ٦٠)

''اوران کے (مقابلے کے) لیے قوت سے اور گھوڑے باندھنے سے تیاری کرو، جتنی کرسکو۔''

مِنْ قُوَّةٍ: یہ امر کے سیاق میں نکرہ آیا ہے۔لہٰذا اس میں ہر قسم کی وہ قوت داخل ہے جو زمان و مکان کا تقاضہ ہو۔ اگر ہم جدید تباہ کن اور مہلک اسلحہ کی بجائے تیر، تلوار اور نیزے سے ہی چمٹے رہیں تو یہ ہمیں ذرا بھی فائدہ نہیں دیں گے۔ ممکن ہے یہ تھوڑے بہت لوگوں سے تو دفاع کا کام دے سکیں لیکن دشمن کے لشکر اور حملے کو نہیں روک سکتے۔ کیونکہ دشمن کو صرف اس کے برابر یا اس سے سخت ہتھیاروں کے ساتھ ہی روکا جاسکتا ہے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾

یعنی جتنی استطاعت ہے، کوئی حد مقرر نہیں کی۔

﴿مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ﴾

''قوت اور گھوڑے تیار رکھو۔''

کیونکہ گھوڑوں میں قیامت تک کے لیے فائدہ رکھ دیا گیا ہے جیسا کہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے:

((اَلْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ بِنَوَاصِيْهَا الْخَيْرُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ .))

''گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک کے لیے فائدہ رکھ دیا گیا ہے۔''[1]

---

[1] مسند احمد (٣٢/٩٨)، (١٩٣٤٥)۔ بخاری (٢٨٥٢)۔ مسلم (١٨٧٣/٩٩) راوی عروہ بن ابی الجعد البارقی ہیں۔

اور فائدہ یہ ہے:

﴿مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ﴾

''قوت سے اور گھوڑے باندھنے سے تیاری کرو، جتنی کر سکو۔ جس کے ساتھ تم اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو اور ان کے علاوہ کچھ دوسروں کو ڈراؤ گے، جنھیں تم نہیں جانتے، اللہ انھیں جانتا ہے۔''

کچھ دشمن ہمارے اندر چھپے ہوئے ہوتے ہیں جب ہم (جنگی) قوت تیار کرتے ہیں تو ہمارے اندرونی و بیرونی دشمنوں پر یہ گراں گزرتی ہے۔ مگر جب ہم تیاری نہیں کرتے تو اندرونی و بیرونی دشمن خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ دو طرح کی قوت حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۱)...... دلیل کی قوت: یہ علم نافع سے حاصل ہوتی ہے۔

(۲)...... اسلحہ کی قوت: یہ ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق جدید اسلحے اور آلات حرب سے حاصل ہوتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ (التوبہ: ۷۳)

''اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری لوٹ کر جانے کی جگہ ہے۔''

منافقین کے خلاف دلیل اور زبان کے ساتھ، جبکہ کفار کے خلاف شمشیر و سناں کے ساتھ جہاد کیا جاتا ہے۔

❀❀❀❀❀

وَكُلُّ مُتَّسِمٍ بِغَيْرِ الْإِسْلَامِ مُبْتَدِعٌ. (۱)

ترجمہ......: اور جو شخص بھی اسلام کے علاوہ کوئی امتیازی نشان اپناتا ہے وہ بدعتی ہے۔

تشریح......: (۱) بدعت کی کچھ صورتیں یہ بھی ہیں: اسلام اور سنت کے علاوہ کسی اور چیز کو امتیاز بنانا۔ جیسے کوئی شخص کسی آغاز، مذہب یا رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور شخص کی طرف اپنی نسبت کرے۔ لہٰذا صرف اہل سنت والجماعت کی طرف نسبت ہونی چاہیے اور اتباع رسول اللہ ﷺ کی کرنی چاہیے۔ یہی درست نسبت ہے اور کتاب وسنت کے مخالف فرقوں، جماعتوں، مذاہب اور دیگر چیزوں کی طرف منسوب ہونا گمراہی ہے۔

❀❀❀❀❀

كَالرَّافِضَةِ (۱) وَالْجَهْمِيَّةِ (۲) وَالْخَوَارِجِ (۳) وَالْقَدَرِيَّةِ (۴) وَالْمُرْجِئَةِ (۵) وَالْمُعْتَزِلَةِ (٦) وَالْكَرَّامِيَّةِ (۷) وَالْكُلَّابِيَّةِ (۸) وَنُظَرَائِهِمْ (۹).

ترجمہ......: مثلاً روافض، جہمیہ، خوارج، قدریہ، مرجئہ، معتزلہ، کرامیہ، کلابیہ اور ان جیسے دیگر فرقے۔

تشریح......: (۱) رافضہ: شیعوں کا ایک گروہ ہے جسے رافضہ، جعفریہ اور مُوسویہ کہا جاتا ہے۔ انہیں رافضہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ زید بن علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہم بن ابی طالب کے پاس آئے اور ان سے کہا؛ ابوبکر وعمر سے الگ ہو جائیے۔ انہوں نے جواب دیا: میں ان سے اظہار براءت نہیں کروں گا۔ کیونکہ وہ دونوں میرے جد اعلیٰ (نانا) کے ساتھی اور وزیر مشیر ہیں۔ (یعنی رسول اللہ ﷺ کے) تو انہوں نے کہا "إِذَنْ نَرْفُضكَ" یعنی پھر ہم تجھ کو چھوڑ دیں گے اور تیری پیروی نہیں کریں گے۔ اس وجہ سے انہیں رافضہ کہا جانے لگا۔ کیونکہ انہوں نے ائمہ اہل بیت میں سے زید بن علی زین العابدین رحمہ اللہ کو چھوڑ دیا تھا۔

شیعہ کا جو گروہ زید بن علی زین العابدین رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے اسے زیدیہ کہا جاتا ہے۔ اور جو شیعہ جعفر صادق بن محمد باقر بن علی بن حسین رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب ہیں انہیں

جعفریہ کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ فقط اپنی نسبت ہی جعفر صادق رحمہ اللہ کی طرف کرتے ہیں ورنہ یہ اُن کے مذہب پر کاربند نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ علماء اہل سنت سلف صالحین اہل حق اور علماء سلف میں سے تھے۔ لہٰذا یہ محض ان کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں اور ان باتوں میں حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کی پیروی نہیں کرتے جو اہل سنت والجماعت کے مذہب کے مطابق ہیں۔ بلکہ یہ آپ رحمہ اللہ کی تکذیب کرتے ہیں۔ جعفریہ کی تمام کتابیں ابوعبداللہ (جعفر صادق رحمہ اللہ) کی تکذیب سے بھری پڑی ہیں۔

بہرحال ہمیں جعفر، زید رحمہما اللہ یا کسی اور کی طرف نسبت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ ہم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں اور اسی انتساب کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

(۲)...... جہمیہ: یہ جہم بن صفوان سمرقندی کے پیروکار ہیں۔ اسے ترمذی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ باطل اور کفریہ نظریات کا حامل تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا انکار کرتا تھا۔ جبر کا قائل تھا اور کہتا تھا کہ بندے اپنے اعمال میں مجبور ہیں۔ ان کے پاس کوئی اختیار اور قدرت نہیں۔

یہ ارجاء کا بھی قائل تھا۔ ارجاء سے مراد یہ ہے کہ ایمان صرف قلبی معرفت کا نام ہے خواہ زبان سے اس کا اقرار اور عمل سے اس کی تصدیق نہ بھی کی جائے۔ جو شخص دل سے اللہ کو اپنا رب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول سمجھتا ہے وہ مومن ہے۔ قول، عمل اور تصدیق کی کوئی شرط نہیں، فقط قلبی معرفت ہی کافی ہے۔

گویا اس نے بہت سے خبیث عقیدوں کو جمع کر رکھا تھا۔ مثلاً جبر، ارجاء، تجہم وغیرہ۔ صفات میں یہ تجہم کا مرتکب تھا۔ تقدیر کے معاملہ میں جبر کا قائل اور ایمان میں ارجاء کا عقیدہ رکھتا تھا۔ یہ قرآن کے مخلوق ہونے کا بھی قائل تھا۔ یہ تمام غلیظ نظریات ہیں۔ (اللہ کی پناہ) یہ جہم بن صفوان ہے۔ اس نے اپنا مذہب جعد بن درہم سے حاصل کیا تھا۔ جعد بن درہم نے اسے دو یہودیوں ابان اور طالوت سے سیکھا تھا۔ گویا ان کا مذہب یہودیوں کے مذہب سے مأخوذ ہے۔

(۳)...... خوارج: یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے چوتھے خلیفہ راشد سیّدنا علی بن ابی

طالب رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا، ان کی اطاعت سے نکل گئے، انہیں کافر قرار دیا اور ان سے جنگ کی تھی۔

پہلے پہل ان کی معیت میں جہاد کرتے تھے۔ پھر جب صفین کے معرکہ میں ان کی خواہش کے خلاف سیّدنا علی رضی اللہ عنہ اور اہل شام کے درمیان تحکیم کا معاملہ طے پایا تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو غلط اور کافر قرار دی دیا۔ حالانکہ پہلے انہوں نے ہی سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کو تحکیم قبول کرنے پر مجبور کیا تھا۔ جناب امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے مجبوراً اسے قبول کیا۔ ورنہ وہ تادم آخر جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے۔ کہنے لگے تو نے لوگوں کو حاکم بنا دیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (الانعام: ۵۷)

''فیصلہ اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں۔''

الغرض انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا۔ اطاعت کی لاٹھی توڑ ڈالی اور باہم مل گئے۔ چنانچہ امیر المومنین سیّدنا علی رضی اللہ عنہ نے جنگ نہروان میں ان کے خلاف قتال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہ کی مدد فرمائی اور آپ نے ان کو بری طرح قتل کیا اور مسلمانوں کو ان کے شر سے نجات دلائی۔ لیکن یہ مذہب آج تک باقی ہے۔ ان کے عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ ہے کہ اس امت میں کبیرہ گناہوں کے مرتکب کافر ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ زانی، چور، شرابی اور دیگر کسی کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہے اور ملت اسلامیہ سے خارج ہے۔ یہ عقیدہ کتاب و سنت اور حق کے خلاف ہے۔ اہل سنت والجماعت سلفی اہل حق کا عقیدہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کبیرہ گناہ کا مرتکب فاسق ہے۔ اس کے ایمان میں نقص آ جاتا ہے لیکن وہ کافر نہیں۔ اور یہی درست مذہب ہے۔

الغرض یہ دو جرائم کے مرتکب ہوئے۔ پہلا جرم مسلمان حکمرانوں کے خلاف خروج کرنا اور اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر خیال کرنا۔ حالانکہ یہ کام بذات خود منکر (برائی) ہے نیکی نہیں۔

دوسرا جرم: امت محمدیہ کے گنہگار لوگوں کو کافر قرار دینا۔ اسی وجہ سے انہوں نے خود اپنے اوپر کفر کا اور ہمیشہ جہنم میں رہنے کا فتویٰ لگالیا۔ کیونکہ یہ خود بھی تو کبائر سے محفوظ نہیں رہتے۔ کیا مسلمان حکمرانوں کے خلاف خروج کبائر میں سے نہیں؟ کیا اس کے علاوہ ان سے گناہ نہیں ہوتے؟ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے خود اپنے اوپر کافر اور ابدی جہنمی ہونے کا فتویٰ لگالیا۔ یہ ہیں خوارج۔

لہٰذا جو بھی ان کے مذہب پر چلے گا، یعنی امیر کی اطاعت سے نکل جائے گا، مسلمان حکمرانوں کے خلاف خروج (جنگ) کرے گا۔ یا شرک کے علاوہ دیگر کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کو کافر قرار دے گا وہ خوارج میں سے ہے۔ خواہ وہ کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی جگہ پر ہو۔

(۴)...... تقدیر پر ایمان: ارکان ایمان میں سے چھٹے نمبر پر ہے اور تقدیر پر ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں ہی ان تمام حوادث کو مقدر (مقرر) کر دیا تھا جو ہو چکے اور جو ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے۔ علاوہ ازیں جو کچھ بھی اس کائنات میں وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے سے ہوتا ہے۔ خواہ وہ نیکی ہو یا برائی۔ کفر ہو یا ایمان، اطاعت ہو یا معصیت۔ اور اس بات پر ایمان رکھنا بھی ایمان بالقدر میں داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الرعد: ١٦)

''اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔''

آپ اس بات کا یقین کریں اور اس پر ایمان رکھیں کہ جو کچھ آپ کو لاحق ہوا ہے، آپ اس سے بچ نہیں سکتے تھے اور جو آپ کے ساتھ پیش نہیں آیا وہ آپ کو لاحق ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہی ایمان بالقدر ہے اور یہی اہل سنت والجماعت سلف صالحین اہل حق کا مذہب ہے۔ دو فرقے ایسے ہیں جو تقدیر کے معاملہ میں اہل سنت والجماعت کے مذہب کے خلاف ہیں۔

پہلا فرقہ: انہوں نے تقدیر کے اثبات میں غلو کیا اور بندے کی قدرت، مشیت اور

ارادے کی نفی کردی۔ کہا کہ بندہ اپنی مشیت، قدرت اور ارادے کے بغیر کام کرتا ہے۔ وہ اپنے اعمال کے سلسلہ میں مجبور ہے، اس کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ انہیں جبریہ کہا جاتا ہے۔

دوسرا فرقہ: قدریہ کا ہے۔ انہوں نے بندے کی قدرتِ اختیار اور مشیت کے اثبات میں غلو کیا اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کی نفی کردی۔ یعنی انہوں نے اس بات کی نفی کردی کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے افعال کو تقدیر میں لکھ چھوڑا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہی بندوں کے افعال کو پیدا کیا ہے۔

انہوں نے ایک طرف غلو کیا تو دوسری جانب خود غلو کا شکار ہوئے۔ جبریہ نے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کے اثبات میں اس قدر غلو کیا کہ انہوں نے بندے کی مشیت کی ہی نفی کردی۔ جبکہ قدریہ نے بندے کی مشیت کے اثبات میں غلو کیا اور اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کی نفی کردی۔ یہ دونوں قسم کے لوگ قدریہ ہیں جن میں سے ایک فرقہ غلو کرنے والا ہے اور دوسرا نفی کرنے والا۔

اہل سنت والجماعت سلفی اہل حق کا مذہب معروف ہے یعنی تقدیر کا اثبات کرنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کی بھی مشیت اور ارادہ ہے۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے سے ہی وجود میں آتی ہے اور بندے کی بھی ایک مشیت ہوتی ہے۔ اس کا بھی ایک ارادہ ہوتا ہے۔ اسے بھی اختیار حاصل ہے جس کی بناء پر اسے جزا یا سزا دی جائے گی۔ یہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔ اور جنہوں نے اس کی مخالفت کی اسے قدریہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے تقدیر کے مسئلہ میں مخالفت کی ہے۔

(۵)......مرجئہ: ارجاء سے مراد تاخیر ہے۔ آپ کہتے ہیں ''أَرْجَأْتُ الشَّيْئَ ''یعنی میں نے فلاں چیز کو مؤخر کیا۔ جب فرعون نے اپنی قوم سے موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم کے متعلق مشورہ طلب کیا تو انہوں نے کہا:

﴿قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ﴾ (الاعراف: ۱۱۱)

''انھوں نے کہا اسے اور اس کے بھائی کو مؤخر رکھ۔''

یعنی ان کے معاملے کو مؤخر کر دے تا آنکہ تو اچھی طرح غور وفکر کر لے۔ جادوگروں کو بلالے اور لوگوں کے سامنے انکا مقابلہ کروا۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کے ارادے کی وجہ سے ہوا۔ انہوں نے سمجھا کہ موسیٰ جادوگر ہے اور جب وہ اپنے جادوگروں کو اس کے بالمقابل لے آئیں گے تو انہیں غلبہ حاصل ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے برعکس کام کیا۔ اس نے یہ بات واضح کر دینے کا ارادہ کیا کہ موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام اللہ ربّ العالمین کی طرف سے آئے ہیں اور موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے پاس جو معجزات ہیں جادو ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس عظیم اجتماع میں جادو کا باطل ہونا ظاہر ہو گیا۔ جادوگر توبہ کر کے اللہ کے حضور سربسجود ہو گئے۔ کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ جو موسیٰ کے پاس ہے وہ حق ہے۔ وہ اصحاب فن اور اصحاب دانش تھے، جادو کو پہچانتے تھے۔ وہ جان گئے کہ جو موسیٰ کے پاس ہے وہ کسی انسان کی صنعت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ معجزہ اور موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی سچائی کی علامت ہے۔ چنانچہ وہ آپ عَلَیْہِ السَّلَام پر ایمان لے آئے۔ مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں ہماری دلیل کے یہ الفاظ ہیں:

"أرجه وأخاه."

یعنی یہاں ارجہ کا معنی ہے: "تو اس کو مؤخر کر دے" اور یہی ارجاء ہے۔ لیکن ارجاء سے ہماری یہاں مراد اعمال کو ایمان سے مؤخر کرنا ہے۔ مرجئہ کہتے ہیں: اعمال ایمان میں داخل نہیں ہیں۔ گویا انہوں نے اعمال کو حقیقت ایمان اور اسم ایمان سے مؤخر کر دیا اور اعمال و ایمان کو دو مختلف چیزیں بنا دیا۔ یہ مرجئہ ہیں اور ان کے چار فرقے ہیں۔

پہلا فرقہ......: پہلا فرقہ جہمیہ ہے جو محض معرفت قلبی کو ایمان سمجھتے ہیں خواہ کوئی ایک عمل بھی نہ کرے، عقیدہ بھی نہ رکھے، تصدیق بھی نہ کرے اور اقرار بھی نہ کرے اگر وہ دل میں معرفت رکھتا ہے تو وہ مومن ہے۔

اس عقیدے کے مطابق فرعون بھی مومن ہے۔ کیونکہ وہ بھی پہچانتا تھا کہ موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام جو شریعت لائے ہیں وہ سچی ہے۔ لیکن وہ تکبر اور سرکشی کی وجہ سے انکار پر ڈٹا رہا۔

﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ (النمل: ١٤)

''اور انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا۔ حالانکہ ان کے دل ان کا اچھی طرح یقین کر چکے تھے۔ پس دیکھ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا۔''

گویا جہمیہ کے عقیدے کے مطابق فرعون بھی مومن تھا۔ کیونکہ وہ اللہ کو پہچانتا تھا اور ابلیس بھی ان کے نزدیک مومن ہوگا۔ کیونکہ وہ نہ صرف اللہ کو پہچانتا تھا بلکہ اس نے وضاحت کے ساتھ اقرار بھی کیا تھا۔

﴿قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ﴾ (الحجر: ٣٩)

''اس نے کہا: اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے۔''

اور اس نے یہ بھی کہا تھا:

﴿فَبِعِزَّتِكَ﴾ (ص: ٨٢)

''تو تیری عزت کی قسم!۔''

اس نے اللہ کے غلبے کا اثبات کیا اور اس کی قسم اٹھائی لہٰذا ان کے مذہب کے مطابق ابلیس بھی مومن ہے اور اس طرح تو روئے زمین پر کسی کو بھی کافر نہیں کہا جا سکتا۔ یہ باطل مذہب ہے اور ارجاء کی بدترین صورت ہے۔

دوسرا فرقہ......: دوسرا فرقہ ان لوگوں کا ہے جو محض تصدیق بالقلب (دل سے تصدیق) کو ہی ایمان سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف معرفت کافی نہیں بلکہ دل سے تصدیق بھی ضروری ہے۔ خواہ زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل نہ بھی ہو۔ جو شخص اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور اس کے دین کی دل سے تصدیق کرتا ہے وہ کامل ایمان والا مومن ہے۔ یہ اشاعرہ اور ان کے ہم خیال علمائے کلام کا قول ہے۔ گویا ان کے نزدیک ایمان محض تصدیق قلبی کا نام ہے۔

تیسرا فرقہ......: تیسرا فرقہ ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں: ''ایمان صرف اقرار کا نام ہے

خواہ کوئی دل میں عقیدہ نہ بھی رکھے۔ اگر صرف زبان سے اقرار کرلے تو وہ مومن ہوگا۔'' یہ کرامیہ یعنی محمد بن کرام کے پیروکاروں کا قول ہے جس کا ذکر عنقریب آرہا ہے۔

چوتھا فرقہ...... مرجئہ کے چوتھے فرقے میں وہ لوگ شامل ہیں جو کہتے ہیں کہ ایمان تصدیق قلبی اور اقرار لسانی کا نام ہے۔ لیکن عمل بالجوارح ایمان کا حصہ نہیں۔ بلکہ یہ تو محض ایمان کی شرط اور ایمان کی تکمیل کرنے والی چیز ہے، حقیقت ایمان میں داخل نہیں۔ انہیں فقہاء مرجئہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بہت سے احناف کا مؤقف ہے۔ ان کا مذہب یہ ہے کہ ایمان دلی اعتقاد اور زبانی اقرار کا نام ہے۔ اعمال حقیقت ایمان میں داخل نہیں۔

تو پتہ چلا کہ مرجئہ کے چاروں فرقے اعمال کو حقیقت ایمان سے خارجی چیز قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایمان ایک مفرد چیز ہے جس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ یعنی جناب جبریل علیہ السلام کا ایمان ایک فاسق ترین مسلمان کے ایمان جیسا ہے۔ جناب جبریل کا ایمان نہ اس سے زیادہ ہے نہ کم۔ بلکہ ان میں سے بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ایمان کی موجودگی میں گناہ اسی طرح کوئی نقصان نہیں دیتے جس طرح کفر کے ہوتے ہوئے نیکیاں فائدہ بخش نہیں ہوتیں۔ یہ ان کے باطل مذہب کی تفصیلات میں سے ایک بات ہے۔

لیکن اہل سنت والجماعت سلف صالحین اہل حق کہتے ہیں: ''ایمان زبان کے ساتھ اقرار، دل کے ساتھ تصدیق اور جوارح کے ساتھ عمل کرنے کو کہتے ہیں۔'' یہ نیکیوں سے بڑھتا اور گناہوں سے کم ہوتا ہے۔ لہٰذا تمام لوگوں کا ایمان ایک جیسا نہیں۔ بعض کا ایمان کامل ہے اور بعض کا ناقص۔ یہی وہ درست قول ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل کو جمع کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

(۶)......معتزلہ: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے بزرگ اور قائد واصل بن عطاء کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں۔ یہ امام التابعین جناب حسن بصری رحمہ اللہ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسی اثناء میں حسن بصری رحمہ اللہ سے مرتکب کبیرہ کے بارے میں کسی نے سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا۔

''وہ ناقص ایمان والا مومن ہے۔''

واصل بن عطاء نے کہا:

''میں نہ اسے مومن کہتا ہوں اور نہ ہی کافر۔ بلکہ میں کہتا ہوں: وہ دو مقامات کے درمیان ایک مقام ہوتا ہے۔ اگر وہ توبہ کیے بغیر فوت ہو جائے تو کافر اور دائمی جہنمی ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ حسن بصری رحمہ اللہ کی مجلس سے الگ ہوگیا اور اپنے گرد پیروکاروں کا ایک حلقہ لگا لیا۔ تب سے انہیں معتزلہ کہا جانے لگا۔ ایمان کے بارے میں ان کا مؤقف خوارج کے قریب ہے۔''

یہ کہتے ہیں: ''مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے لیکن کفر میں داخل نہیں ہوتا۔ بلکہ دونوں مراتب کے درمیان ایک مرتبہ پر ہوتا ہے۔ اگر وہ توبہ کئے بغیر مر گیا تو کافر اور دائمی جہنمی ہوگا۔ جیسا کہ خوارج کہتے ہیں۔'' صفات کے بارے میں ان کا رویہ یہ ہے کہ یہ صفات کا انکار کرتے ہیں اور اپنی مرضی سے ان کی باطل تاویلات کرتے ہیں۔

(۷)...... کرامیہ: یہ محمد بن کرام کے پیروکار ہیں اور اثبات صفات میں غلو کرتے ہوئے تشبیہ [1] و تجسیم [2] تک جا پہنچتے ہیں۔

(۸)...... کلابیہ: یہ عبد اللہ بن سعید بن کلاب کے پیروکار ہیں۔ اکثر اشاعرہ بلکہ آج کے دور میں تو تمام اشاعرہ اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سات یا چودہ صفات کے علاوہ تمام صفات کا انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے بقول ان صفات کے وجود پر عقل دال ہے۔ جبکہ باقی صفات کی دلیل عقل سے نہیں ملتی۔ بلکہ وہ محض نقل (قرآن و حدیث) سے ثابت ہیں۔

(۹)...... یہ تو محض مثالیں بیان ہوئی ہیں ورنہ فرقے تو بہت سارے ہیں۔ بہت سے نئے پیدا ہو رہے ہیں اور بہت سے گذشتہ فرقوں سے ہی وجود میں آ رہے ہیں۔ جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] تشبیہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دینا۔

[2] تجسیم سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی جسمانی کیفیات بیان کرنا۔ (مترجم)

((وَسَتَفْتَرِقُ هٰذِهِ الْأُمَّةُ عَلٰى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً، كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً.))

''عنقریب یہ امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ایک کے علاوہ سب جہنم میں جائیں گے۔'' [1]

علماء فرماتے ہیں: یہ تو بنیادی فرقوں کی تعداد ہے۔ ورنہ ان کی شاخیں اور ان میں سے نکلنے والے مزید فرقوں کی تعداد ۷۳ سے بھی زیادہ ہے۔

❀❀❀❀❀❀

فَهٰذِهِ فِرَقُ الضَّلَالِ وَطَوَائِفُ الْبِدَعِ، أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا. وَأَمَّا بِالنِّسْبَةِ إِلٰى إِمَامٍ فِيْ فُرُوْعِ الدِّيْنِ كَالطَّوَائِفِ الْأَرْبَعِ فَلَيْسَ بِمَذْمُوْمٍ. (١)

ترجمہ......: یہ تو گمراہ فرقے اور بدعتی جماعتیں ہیں، اللہ ہمیں ان سے اپنی پناہ میں رکھے۔ البتہ فروع دین (دین کے جزوی مسائل) میں کسی امام کی طرف نسبت کرنا مذموم نہیں۔

تشریح......: اصول دین میں رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کی طرف اپنی نسبت کرنا جائز نہیں۔ اصول دین سے مراد عقیدہ ہے۔ کیونکہ عقیدہ توقیفی علم ہے۔ اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس میں محض کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے دلائل کی ہی پیروی کی جائے گی۔ اسی وجہ سے عقیدہ میں نہ تو سلف صالحین کا اختلاف ہے اور نہ ہی ان کے بعد آنے والے ان کے متبعین کا اس بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ کیونکہ عقیدہ ایک توقیفی علم ہے اس کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی اتباع وتسلیم پر ہے۔ عقیدہ میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر کوئی عقیدہ میں اختلاف کرتا ہے تو وہ گمراہ ہے۔

اختلاف تو صرف فرعی مسائل میں ہوتا ہے۔ یعنی فقہ سے تعلق رکھنے والے مسائل

[1] امام احمدؒ نے اسے اپنی مسند میں اسی طرح نقل کیا ہے (۱۳۴/۲۸)، (۱۶۹۳۷) اور ابوداؤد نے اسے معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے (۴۵۹۷)۔ اس حدیث کی سند حسن ہے۔

میں۔ کیونکہ ان کا دارومدار استنباط و اجتہاد پر ہوتا ہے۔ ہمیں صرف فقہی اور نئے پیش آمدہ مسائل و حادثات میں اجتہاد کرنے اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ان کا حکم معلوم کرنے پر مامور کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان مسائل کے متعلق نص موجود نہیں ہوتی۔

جن مسائل میں نص آ گئی ہے ان کے بارے میں کوئی بحث کی ضرورت نہیں۔ مثلاً سود، زنا، شراب، منشیات اور قطع رحمی کی حرمت نصوص میں وارد ہے۔ ان میں اجتہاد کی ضرورت نہیں۔ ان میں صرف راہ تسلیم و اطاعت کو اختیار کرنا چاہیے۔

مباح چیزوں کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے نص ارشاد فرما دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت کو حلال کیا ہے۔ اس میں اختلاف کی اجازت نہیں۔ کیونکہ اس کے حلال ہونے پر اللہ تعالیٰ نے نص بیان فرما دی ہے۔ تمام اشیاء دراصل حلال ہیں سوائے ان چیزوں کے جن کے ممنوع ہونے پر کتاب وسنت کی کوئی دلیل وضاحت کرے۔

فقہاء ومجتہدین کا میدان وہ فرعی مسائل ہیں جن کا حکم نص میں بیان نہیں ہوا۔ اسی لیے اجتہادی مسائل میں علماء کا اختلاف ہوگیا اور اس سلسلہ میں چار مذاہب وجود میں آ گئے: **مذہب** ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ ، **مذہب** مالک بن انس رحمہ اللہ ، **مذہب محمد** بن ادریس شافعی رحمہ اللہ ، اور **مذہب** احمد بن حنبل رحمہ اللہ ۔

بایں معنی کہ ان تمام ائمہ میں سے ہر ایک کا اجتہاد و استنباط کا اپنا طریقہ تھا۔ ان میں سے ہر ایک حق کا متلاشی اور دلیل کا طلبگار تھا۔

عالم کے لیے کسی کی تقلید کرنا جائز نہیں جبکہ وہ خود دلیل کو پہچان سکتا اور حکم کو تلاش کر سکتا ہو۔ وہ اپنی طاقت کے مطابق اجتہاد کرے اور کسی کی تقلید نہ کرے۔ تقلید البتہ ایک عام آدمی اور ابتدائی طالب علم کے لیے جائز ہے۔ جبکہ عالم پر اجتہاد کرنا واجب ہے اور اجتہاد کے بعد وہ جس نتیجے پر پہنچے اسی پر عمل کرے۔ اگر اس کا اجتہاد درست ہوا تو اسے دوگنا ثواب ملے گا۔ ایک اجر اجتہاد کرنے کا اور دوسرا صحیح نتیجے تک پہنچنے کا۔ اور اگر اس کا اجتہاد غلط ہو بھی گیا تو اسے اجتہاد کرنے کا ایک اجر مل جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی غلطی کو معاف کر دے گا۔ لیکن

ہمارے لیے اس غلطی کی پیروی کرنا جائز نہیں۔ اجتہاد قابل تعریف ہے اور اس میں اختلاف قابل مذمت نہیں۔ کیونکہ یہ خواہش پرستی کا نتیجہ نہیں بلکہ حق کی تلاش اور اجتہاد کا نتیجہ ہے۔

لیکن اگر شہوت اور خواہش پرستی کی وجہ سے اختلاف کیا جائے تو یہ جائز نہیں۔ یعنی انسان صرف اپنی خواہش اور چاہت کے موافق چیزوں کو نہ لے کیونکہ یہ مذموم ہے۔ البتہ اگر اس کے پاس علمی اہلیت اور تحقیق و جستجو کی صلاحیت ہو تو اس پر اجتہاد کرنا واجب اور کسی دوسرے کی تقلید کرنا حرام ہے۔ تاکہ وہ ازخود حکم کو پہچانے یا اس کے قریب قریب پہنچ جائے۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا .)) [1]

''سیدھے ہو جاؤ اور قریب قریب ہو جاؤ۔''

التسـدیـد: سے مراد حق کو پالینا ہے اور **مقاربة** سے مراد حق کے قریب ہونا ہے۔ خواہ حق تک رسائی نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی کوشش کرتا ہے اور محنت صرف کرتا ہے تو یہی وہ فقہی اجتہاد ہے جس کا دفاع طلب دلیل اور طلب حکم شرعی سے ہوتا ہے۔ یہ قابل تعریف ہے، قابل مذمت نہیں۔ ائمہ اربعہ کی طرف نسبت کر کے اپنے آپ کو حنبلی، مالکی، شافعی، حنفی کہنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ تعصب نہ ہو۔ بلکہ جب دلیل مل جائے تو اسے لے لے خواہ وہ اس بات کے امام کے مذہب میں نہ ہو۔ ایک حنفی کو جب شافعی کے پاس دلیل مل جائے تو شافعی کے قول کو قبول کرنا اس پر واجب ہے۔ ایک حنبلی کو اگر مذہب مالکی کے حق میں دلیل مل جائے تو اس پر امام مالک کے قول کو قبول کرنا واجب ہے۔ کیونکہ وہ ہمیں یہی وصیت کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے: ''تم ہمارے اقوال کو تب تک نہ لو جب تک تمہیں ان اقوال کی دلیل نہ مل جائے۔''

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے تھے:

---

[1] اسے امام احمدؒ نے اپنی مسند میں (۴۱/۴۱۶) (۲۴۹۴۱)، بخاری (۶۴۶۴، ۶۴۶۷) اور مسلمؒ نے (۲۸۱۸) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے۔

’’جب میرا قول رسول اللہ ﷺ کے قول کے خلاف ہو تو اسے دیوار پر دے مارو۔ جب کوئی حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔‘‘

امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ بھی قول ہے:

’’اس پر امت کا اجماع ہے کہ جس کے سامنے سنت رسول اللہ ﷺ واضح ہو جائے اس کے لیے کسی کے قول کی وجہ سے سنت کو چھوڑنا جائز نہیں۔‘‘

امام مالک رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

’’کیا اگر ہمارے پاس کوئی بہت بڑا مناظر (بحث کرنے والا) آ جائے تو ہم اس کی بحث کی وجہ سے بواسطہ جبریل محمد ﷺ پر نازل ہونے والی شریعت کو چھوڑ دیں؟‘‘

اور وہ فرمایا کرتے تھے:

’’ہم میں سے ہر شخص کسی کی بات کو ردّ کر سکتا ہے اور خود اس کی بات کو ردّ کیا جا سکتا ہے سوائے اس قبر والے کی بات کے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی حدیث مبارک کے۔‘‘

امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے:

’’مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے جنہیں صحیح سند والی حدیث مل جاتی ہے پھر بھی وہ سفیان کی رائے کو لیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (النور: ٦٣)

’’رسول کے بلانے کو اپنے درمیان اس طرح نہ بنا لو جیسے تمھارے بعض کا بعض کو بلانا ہے۔ بے شک اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں۔ سو لازم ہے کہ وہ لوگ ڈریں جو اس کا حکم ماننے

سے پیچھے رہتے ہیں کہ انھیں کوئی فتنہ آ پہنچے۔ یا انھیں دردناک عذاب آ پہنچے۔''

کیا آپ جانتے ہیں فتنہ سے کیا مراد ہے؟ فتنے سے مراد شرک ہوسکتا ہے۔ جب وہ آپ ﷺ کے کسی قول کو ترک کرے تو اس میں کجی آ جائے اور وہ ہلاک ہو جائے۔

یہ ائمہ کرام رحمہم اللہ کے اقوال ہیں۔ وہ ہم سے کہتے تھے: تم ہمارا صرف وہی قول قبول کرو جو دلیل کے مطابق ہو۔ جو دلیل کے خلاف ہو اسے چھوڑ دو۔ کیونکہ مسئلہ مذاہب کا نہیں بلکہ مسئلہ اتباع دلیل کا ہے۔ البتہ ہم ان ائمہ کے اجتہادات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی روشنی میں استنباط کرتے ہیں اور ان کی روشنی میں ہی بحث کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک علمی سرمایہ اور ہمارے ہاتھوں میں ایک آلہ (اجتہاد) ہے۔

الغرض ہم پر دلیل مانگنا واجب ہے۔ اور دلیل کو قبول کرنے کی ہدایت ہمارے ائمہ کے اقوال سے ہی ہمیں ملتی ہے۔ کسی حنبلی کے کسی شافعی کے قول کو اختیار کرنے میں یا کسی شافعی کے کسی حنبلی کے قول کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ وہ سب امام اور بھائی تھے۔ لہٰذا حنفیہ، حنابلہ، شافعیہ اور مالکیہ ایسے فرقے نہیں جیسے خوارج، معتزلہ اور مرجئہ ہیں۔ بلکہ یہ تمام ایک فرقہ ہیں جو حق پر کاربند ہے۔ اگرچہ ان میں سے کسی سے کسی اجتہادی مسئلے میں غلطی ہو جاتی ہے تو اس کی غلطی کو چھوڑ دیا جائے گا اور درستی کو لے لیا جائے گا۔ یہی واجب ہے۔ لہٰذا اس کلام کو جاننا بھی واجب ہے کیونکہ یہ بہت اہم ہے۔ یہ وہ مذموم نسبت نہیں جس کے متعلق گذشتہ صفحات میں تنبیہ کی گئی ہے۔ جہمیہ، خوارج، معتزلہ، شیعہ اور مرجئہ وغیرہ کا انتساب اس قسم کا نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا اختلاف اصول اور عقیدے میں ہے۔ جبکہ مذاہب اربعہ کا اختلاف فقہ اور مسائل اجتہاد میں ہے جو کہ ایک اچھی چیز ہے اور اس میں الحمد للہ گنجائش ہے۔

❀❀❀❀❀

فَإِنَّ الْإِخْتِلَافَ فِی الْفُرُوعِ رَحْمَةٌ (۱) وَالْمُخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ مَحْمُوْدُوْنَ فِیْ اِخْتِلَافِهِمْ (۲) مُثَابُوْنَ فِیْ اِجْتِهَادِهِمْ، وَاخْتِلَافُهُمْ رَحْمَةٌ وَاسِعَةٌ (۳) وَاِتِّفَاقُهُمْ حُجَّةٌ قَاطِعَةٌ. (۴)

ترجمہ......: پس بے شک فروع میں اختلاف تو رحمت ہے اور فروع میں اختلاف کرنے والے قابل تعریف ہیں۔ انہیں ان کے اجتہاد کا ثواب ملتا ہے۔ ان کا اختلاف ایک وسیع رحمت ہے اور ان کا اتفاق ایک پختہ دلیل ہے۔

تشریح......: (۱) فروع میں اختلاف رحمت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو گنجائش دی ہے اور انہیں تلاش حق کے لیے کوشش کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان پر تنگی نہیں کی کہ انہیں ایک قول کو لینے کا مکلّف بنا دیا ہوتا۔ بلکہ انہیں اجتہاد اور شرعی حکم کو جاننے کے لیے محنت صرف کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس میں اختلاف تب تک رحمت ہے جب تک وہ کتاب وسنت کی دلیل کے مخالف نہ ہو۔ اگر کتاب وسنت کی دلیل کے مخالف ہو تو وہ عذاب ہے رحمت نہیں۔ اسی طرح عقیدہ کے مسائل میں اختلاف بھی عذاب ہے رحمت نہیں۔

(۲)......یعنی فقہی فروعات میں اختلاف کرنے والے قابل تعریف ہیں، قابل مذمت نہیں۔ کیونکہ انہیں اجتہاد کی اجازت دی گئی ہے اور اجتہاد کرنے والوں کے لیے ایک موقف پر جمع ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ ہر ایک کا مبلغ علم اور حالات وعقل مختلف ہوتے ہیں۔

جو اس موضوع پر تشفی بخش مطالعہ کرنا چاہے وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے رسالہ ''رفع الملام عن الائمة الأعلام'' کا مطالعہ کر لے۔ اسے اس موضوع پر تفصیلی معلومات مل جائیں گی۔ چنانچہ ہم کسی معین مذہب کی تقلید جامد نہیں کرتے۔ لیکن ہم ان مذاہب میں موجود خیر، فقاہت اور اصول سے بے رغبتی بھی نہیں کرتے بلکہ ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

(۳)......یعنی ان کا فقہ اور استنباط میں اختلاف ایک وسیع رحمت ہے جس میں اللہ

تعالیٰ نے گنجائش دی ہے۔ انہیں ایک قول لینے کا مکلّف بنا کر تنگی نہیں دی کہ وہ تمام مجتہدین میں سے ایک کا قول اختیار کریں خواہ وہ درست ہو یا غلط۔ نہیں، بلکہ یہ تو اللہ کی رحمت ہے۔

(۴)...... بلاشبہ اجماع حجت ہے اور یہ درج ذیل ۴ متفقہ دلائل میں سے ایک ہیں:

(۱) قرآن (۲) سنت (۳) اجماع: اصول بھی امت مسلمہ میں اتفاقی ہے۔ (۴) قیاس: اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ جمہور اہل علم اس کے قائل ہیں اور بعض علماء مثلاً اہل ظاہر اس کے مخالف ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ اصولوں کے بارے میں اختلاف ہے جن کا محل اصول فقہ کی کتابیں ہیں۔ لیکن پہلے تین اصول اتفاقی ہیں۔ یعنی قرآن، حدیث اور اجماع۔

❁❁❁❁❁❁

نَسْأَلُ اللّٰهَ أَنْ يَعْصِمَنَا مِنَ الْبِدَعِ وَالْفِتْنَةِ، وَأَنْ يُبْقِيَنَا عَلَى الْإِسْلَامِ وَالسُّنَّةِ، وَأَنْ يَجْعَلَنَا مِمَّنْ يَتَّبِعُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فِي الْحَيَاةِ، وَيَحْشُرَنَا فِي زُمْرَتِهِ بَعْدَ الْمَمَاتِ بِرَحْمَتِهِ وَفَضْلِهِ. (آمين)

وَهٰذَا اٰخِرُ الْمُعْتَقَدِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهُ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا. (۱)

ترجمہ......: ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں فتنے اور بدعات سے محفوظ رکھے۔ اسلام وسنت پر ہمیں باقی رکھے اور ہمیں ان لوگوں میں سے بنادے جو زندگی میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرتے ہیں۔ ہمیں موت کے بعد اپنی رحمت اور اپنے فضل سے نبی کریم ﷺ کی جماعت میں اُٹھا لے۔ یہاں عقیدے کا اختتام ہوا۔ تمام تعریفیں تنہا ایک اللہ کے لیے ہیں اور رحمت ہو ہمارے سردار محمد ﷺ، آپ ﷺ کی آل، آپ ﷺ کے صحابہ پر اور بے حساب سلامتی ہو سب پر۔

تشریح......: (۱) اللہ تعالیٰ مصنف رحمہ اللہ کو جزائے خیر دے کہ اس نے یہ عقیدہ طیبہ پیش کیا،

اسے واضح کیا پھر اس کو اس عظیم دعا کے ساتھ مکمل کیا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہماری اور مصنف کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور ہمیں اور آپ سب کو تا قیام قیامت حق پر ثابت قدم رکھے۔

درود و سلام ہو ہمارے نبی محمد ﷺ پر، آپ ﷺ کی آل پر اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر۔

❁❁❁❁❁

الحمدللہ ’’شرح لمعة الاعتقاد الهادی الی سبیل الرشاد ......دائمی عقیدہ‘‘ مکمل ہوئی۔ فضیلۃ الشیخ / صالح بن فوزان بن عبداللہ الفوزان حفظہ اللہ (سعودی کبار علماء کمیٹی کے ممبر) نے یہ شرح بروز ہفتہ ۳ ذوالقعدہ ۱۴۱۹ھ کو مکمل کی تھی۔ اللہ عزوجل ان کو ہم سب اہل ایمان واہل توحید اہل السنہ والجماعت کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔

شرح ہذا کے بعد ہم چاہتے ہیں کہ ’’عقیدہ وایمان‘‘ سے متعلق شیخ محترم سے لوگوں نے مختلف اوقات میں جو سوالات کیے اور پھر آپ نے ان کے جوابات جو تحریر فرمائے تھے، ان کو بھی فائدہ مزید کے لیے یہاں درج کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم ’’دار الامام احمد‘‘ قاہرہ، مصر کی طرف سے شائع شدہ کتاب مذکور بالا کے ہمراہ اس ضمیمہ کا ترجمہ بھی شامل کر رہے ہیں۔

قارئین کرام اپنی صالح دعاؤں اور نیک تمناؤں میں ہمیں ضرور یاد رکھیں۔ جزاکم اللہ خیرا

دعا کے تمنا کنندگان

مترجم ومحقق اور ناشر

اداروں کے تمام اعضاء وارکان

❀❀❀❀❀

عقیدے کے متعلق سوال و جواب

سوال: جناب شیخ کیا اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کے لیے کوئی اصول ہیں اور کیا اللہ تعالیٰ کے وہ نام ننانوے کے عدد تک ہی محدود ہیں جن کو شمار کرنے والا جنت میں داخل ہوگا۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں بیان ہوا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے ناموں کے اصول کیا ہیں؟ بس جو بھی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے ہم اس کا اثبات کریں گے اور جو اسماء الٰہی نہ اللہ کی کتاب میں مذکور ہیں اور نہ ہی اس کے رسول ﷺ کی حدیث میں، ہم ان کی نفی کرتے ہیں اور اس پر ایمان نہیں لاتے۔ یہی ایک اصول ہے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق؛ کیا اللہ تعالیٰ کے وہ نام ننانوے کے عدد تک محدود ہیں جن کو شمار کرنے والا جنت میں داخل ہوگا جیسا کہ حدیث میں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے ناموں کی تعداد محدود نہیں ہے اور نہ ہی ان سب کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی جانتا ہے۔ لیکن یہ ننانوے نام ایسے ہیں جن کو شمار کرنے والا جنت میں داخل ہوگا۔ یعنی جو شخص ان کی معرفت حاصل کرتا ہے اور ان پر عمل کرتا ہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ یہ عدد بتا دینا تحدید کا مقتضی نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ان ننانوے ناموں کی جو شخص معرفت حاصل کر لے، ان پر یقین رکھے اور ان کے تقاضوں کے مطابق عمل کرے، اسے جنت کا داخلہ نصیب ہوگا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کے تمام ناموں کو خود اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ ، سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ ، أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِي كِتَابِكَ ، أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ ، أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِي عِلْمِ

الْغَيْبِ عِنْدَكَ .))

''میں تجھ سے (اے اللہ!) تیرے نام کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جو تو نے اپنی ذات کو دیا۔ یا تو نے اسے اپنی کتاب میں نازل کیا۔ یا جو تو نے اپنی کسی مخلوق کو سکھایا ہے۔ یا جسے تو نے اپنے پاس علم غیب میں رکھنے کو ترجیح دی ہے۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ کے الفاظ ''أو استأثرت به'' میں اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ نام ایسے ہیں جنہیں اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

سوال: جناب شیخ! جب آپ نے یہ آیت مبارکہ ذکر کی: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰہ: ٥) تو یہاں ایک معنی عرش کے ساتھ متصل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور دوسرا معنی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش سے بلند ہے۔ تو دونوں میں سے کون سا ترجمہ کیا جائے؟

جواب: اس کا ترجمہ وہی کیا جائے گا جو سلف نے فرمایا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ یعنی وہ عرش کے اوپر بلند ہوا۔ لہٰذا آپ اپنی طرف سے کوئی عبارت یا معنی بیان نہ کریں۔ معانی قرآن کی تفسیر کی یہی صورت ہے اس میں فی نفسہ قرآن کریم کا ترجمہ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس کی تفسیر کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔

اسی لیے اسے ترجمۃ معانی القرآن (معانی قرآن کا ترجمہ) کہا جاتا ہے۔ آپ نہ تو اپنی طرف سے کوئی تفسیر کریں اور نہ ہی اپنی طرف سے کوئی الفاظ استعمال کریں۔ آپ وہی ترجمہ کریں جو اسلاف اور علماء نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے۔

آپ اپنی طرف سے کوئی معنی یا لفظ بیان نہ کریں۔ کیونکہ بعض تراجم میں مترجمین (ترجمہ کرنے والوں) نے اپنی طرف سے الفاظ استعمال کیے جس کی وجہ سے معنی خراب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ بعض ترجمہ کرنے والوں نے آیت:

---

[1] اسے امام احمدؒ نے اپنی مسند میں حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے (٦/٢٤٦) (٣٧١٢)، اس کی مکمل تخریج اور تنقید مسند میں دیکھیں۔

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (البقرہ : ۱۸۷)

''وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔''

کے ترجمہ میں کہا ہے کہ:

''وہ تمہاری پتلونیں ہیں اور تم ان کی پتلونیں ہو۔''

یہ ترجمہ انہوں نے اس لیے کیا کیونکہ وہ پتلون (پینٹ) کے علاوہ کسی لباس کو جانتے ہی نہیں۔ علماء ومفسرین کے الفاظ انہوں نے استعمال نہیں کیے۔

﴿وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا﴾ (الاسراء: ۱۳)

''اور ہر انسان کو، ہم نے اسے اس کا نصیب اس کی گردن میں لازم کر دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے لیے ایک کتاب نکالیں گے، جسے وہ کھولی ہوئی پائے گا۔''

کسی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''ہم چمٹا دیں گے اس کی چڑیا۔''

کیونکہ وہ پرندوں میں سے صرف چڑیا کو جانتا تھا۔

الغرض ترجمہ کرنے والے کے لیے کلام اللہ کی تفسیر کرتے ہوئے اپنی طرف سے سادہ عبارتیں یا الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ بلکہ علماء سلف کی تصدیق شدہ تفسیر قرآن بیان کرنی چاہیے اور لفظی ترجمہ کرنا چاہیے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن قرآن کے الفاظ کا ترجمہ ہرگز ممکن نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم معجزہ ہے۔ لہٰذا آپ کسی بھی زبان سے اس کے الفاظ کے ہم پلہ الفاظ نہیں لا سکتے۔

سوال: جناب شیخ! کیا یہ صحیح ہے کہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے روضۃ الناظر میں آیات صفات کو متشابہات میں سے گردانا ہے؟ اور کیا انہوں نے روضۃ الناظر میں بھی وہی کچھ کہا ہے جو اس کتاب میں بیان فرمایا ہے؟

جواب: ان کا کتاب ہذا والا کلام ہی معتبر ہے۔لیکن انہوں نے صفات کی دو قسمیں کی ہیں: (۱) واضح (۲) مشکل۔ اور یہ تقسیم غلط ہے۔ کیونکہ تمام واضح ہیں، ان میں کوئی بھی مشکل نہیں۔

البتہ ''روضۃ الناظر'' میں انہوں نے متاخرین اصولیوں مثلاً اشاعرہ وغیرہ کے کلام پر ادراج کیا ہے۔اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''روضۃ الناظر'' غزالی کی کتاب ''المستصفی'' کا اقتباس ہے اور غزالی اشعری ہیں۔ ان سے بسا اوقات یہ عبارت رہ گئی ہے۔

سوال: جناب شیخ! عبداللہ ابن مبارک کے متعلق منقول ہے کہ جب ان سے یہ سوال کیا گیا: ہم اپنے رب کو کیسے پہچانیں؟ تو انہوں نے جواب دیا، ہم اسے اس طرح پہچانتے ہیں کہ وہ آسمانوں سے اوپر عرش پر مستوی ہے۔ ان سے پوچھا گیا، کسی حد کے ساتھ؟ تو انہوں نے جواب دیا: ہاں حد کے اندر۔ پھر مصنف رحمہ اللہ نے جس حد کی نفی کی ہے اس کے درمیان اور ابن مبارک رحمہ اللہ کی ثابت کردہ حد کے درمیان کیا فرق ہے؟

جواب: ابن مبارک رحمہ اللہ کبھی کوئی غلط معنی مراد نہیں لے سکتے۔ کیونکہ وہ ائمہ سلف میں سے ہیں۔ حد سے ان کی مراد حقیقت ہے یعنی اللہ تعالیٰ عرش پر حقیقتاً مستوی ہیں۔

سوال: کویت میں ایک داعی امام نے ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر اس طرح مستوی ہے کہ وہ عرش سے چھو نہیں رہا۔ اور اس کے لیے انہوں نے کتاب ''شرح السنہ'' سے دلیل دی۔ حتیٰ کہ جب اس سے ان طلبہ نے استواء کی کیفیت کے متعلق دریافت کیا جن کے سامنے وہ کتاب کی تشریح کر رہا تھا تو اس نے کہا: اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں۔ جو لوگ اس کے خلاف کوئی بات کرتے ہیں یہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ آپ جناب کی اس قول کے بارے میں کیا رائے ہے اور ان کی تردید کا طریقہ کیا ہے؟

جواب: دعوۃ کے اماموں میں سے کوئی امام ایسی بات نہیں کرتا۔ بلکہ وہ کہتے ہیں: اللہ عرش پر مستوی ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ اللہ عرش کو چھو رہا ہے یا نہیں۔ کیونکہ کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ اس کی نفی وارد ہے اور نہ اثبات۔

ہم کہتے ہیں: اللہ عرش پر حقیقی طور پر مستوی ہے وہ عرش سے بلند و بالا ہے۔ اسے عرش کی کوئی حاجت نہیں، بلکہ عرش اس کا محتاج ہے۔ یہ کہنا کہ وہ عرش سے چھو نہیں رہا یا اس طرح نہیں ہے۔ یہ زائد باتیں ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔

سوال: جناب شیخ! ہم ان لوگوں کی کیسے تردید کریں جو امام نووی، ابن حجر رحمہما اللہ وغیرہ جیسے بعض معتبر، متقدمین علماء کی تاویلات کو دلیل بناتے ہیں۔ ہم ان کبار علماء کا کیا عذر پیش کریں؟

جواب: ہم کہیں گے: یہ کبار علماء ہیں۔ سنت رسول کی حفاظت میں ان کا بہت بڑا مقام ہے اگرچہ ان سے صفات کے مسئلہ میں کچھ غلطیاں ہوئی ہیں۔ ان صفات کو بیان کیا جائے، ان کی وضاحت کی جائے اور اس معاملہ میں ان کبار علماء کی تائید نہ کی جائے۔ یہ غلطیاں ان کے علم وفضل میں کمی نہیں کرتیں۔

سوال: اس شخص کا کیا حکم ہے جو کہتا ہے "تقدیر نے چاہا" مثلاً کوئی یوں کہے: "میں اس سے تعلقات کرنا چاہتا تھا لیکن تقدیر نے چاہا کہ میں نہ آؤں"

جواب: کسی فعل کو اللہ کی صفت کی طرف منسوب کر کے یہ کہنا جائز نہیں۔ "تقدیر نے چاہا" یا "اللہ کے ارادہ نے چاہا" یا اس جیسے دوسرے الفاظ۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے: "اللہ نے چاہا، اللہ نے مقدر کیا۔" الغرض افعال کی نسبت اللہ کی طرف کرنی چاہیے نہ کہ اس کی صفات کی طرف۔

سوال: جناب شیخ! کیا اللہ تعالیٰ کی حیات کی قسم کھانا شرک ہے یا نہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی صفات کی قسم کھانا توحید ہے نہ کہ شرک۔ کیونکہ قسم یا تو اللہ تعالیٰ کی ذات کی ہوتی ہے یا اس کے اسماء وصفات کی۔ اور اللہ تعالیٰ کی حیات، اس کے چہرے، اس کے کلام اور اس کی آیات قرآنیہ کی قسم یہ سب اس کے اسماء وصفات کی ہی قسمیں ہیں جو درست قسمیں ہیں اور یہی توحید ہے۔

سوال: جناب شیخ! صفات کی درج ذیل قسمیں بنانے کا کیا حکم ہے؟ (۱) ذاتیہ (۲) فعلیہ

(۳) ذاتیہ فعلیہ۔ مثال سے وضاحت فرمائیں، اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

جواب: صفات ذاتیہ کی مثالیں یہ ہیں: چہرہ، ہاتھ، انگلیاں اور قدم۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ صفات فعلیہ کی مثالیں یہ ہیں: اترنا، آنا، مستوی ہونا، پیدا کرنا، عطا کرنا، زندہ کرنا، مارنا وغیرہ۔

سوال: جناب شیخ! ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ﴾ (الحدید: ٤) ''اور وہ تمھارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو۔'' کیا ''معکم'' کا ترجمہ یہ کرنا تاویل نہیں تمہارے ساتھ ہے اپنے علم کی بناء پر؟

جواب: یہ تاویل نہیں۔ کیونکہ لغت میں معیت کے کئی معانی ہیں۔ ان میں سے ایک معنی ہے: اختلاط کے بغیر قریب ہونا اور ساتھی بننا۔ (مَازِلْنَا نَمْشي وَالْقمرُ مَعنا) آپ کہتے ہیں: ''ہم چلتے رہے جبکہ چاند ہمارے ساتھ تھا۔'' تو چاند اگرچہ آسمان پر ہے لیکن وہ آپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی آپ کے سفر میں آپ کا ساتھی ہوتا ہے۔ وہ آپ سے چھپتا نہیں۔ آپ اس کی روشنی میں چلتے ہیں۔ مخلوق کی یہ صورت حال ہے تو خالق کا کیا عالم ہوگا؟

جب چاند آسمان پر ہوتے ہوئے بھی آپ کے ساتھ ہوسکتا ہے اور لغت میں یہ تعبیر بھی صحیح ہے تو خالق کے لیے کیوں نہیں ہوسکتی؟ وہ عرش کے اوپر بلندیوں میں ہوتے ہوئے بھی اپنے علم اور احاطے کے اعتبار سے اپنے بندوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

سوال: جناب شیخ! آپ کی سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نماز تراویح کے متعلق اس قول کے بارے میں کیا رائے ہے؟ ''نِعْمَ الْبِدْعَةُ هٰذه'' ''یہ ایک اچھی بدعت ہے''

جواب: ہم جانتے ہیں کہ نماز تراویح بدعت نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ تین یا چار راتوں تک نماز تراویح ادا کی اور اس ڈر سے چھوڑی کہ کہیں یہ نماز فرض قرار نہ دے دی جائے۔ لہٰذا نماز تراویح دین میں بدعت نہیں۔ بلکہ یہ ایک سنت ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری کیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مراد صرف لغوی بدعت تھی نہ کہ شرعی بدعت۔ اہل علم اس سوال کا یہی جواب دیتے ہیں۔

سوال: جناب شیخ! کیا عقیدہ کے باب میں یہ قاعدہ درست ہے: "مَا خَطَرَ بِبَالِكَ ، فَاللّٰهُ مُخَالِفٌ لِذَالِكَ ." ویسا نہیں جو (صورت) تیرے ذہن میں آئے۔ اللہ تعالیٰ اس کے خلاف ہے (یعنی اس جیسا نہیں)۔"

جواب: اس کا معنیٰ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے تصور و خیال کے برخلاف ہے۔ کیونکہ وہ ہر چیز سے بڑا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا﴾

(طه : ۱۱۰)

"وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔"

الغرض اللہ تعالیٰ کو خود اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ نہ کوئی اس کا احاطہ کر سکتا ہے۔ نہ عقل اس کا تصور کر سکتی ہے اور نہ ہی فہم سے اس کی صورت سمجھی جا سکتی ہے۔

سوال: جناب شیخ! کیا اس عبارت کو اسماء و صفات کے قواعد میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ "ناموں میں مشابہت سے صفات میں مماثلت لازم نہیں آتی۔"

جواب: یہ درست ہے کہ اسماء اور معانی میں مشابہت سے کیفیت میں مشابہت لازم نہیں آتی۔ یہ ایک واضح بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات مخلوق کے اسماء و صفات کے ساتھ لفظی اعتبار سے مشترک ہیں، ان کا معنیٰ بھی مشترک ہے لیکن کیفیت اور حقیقت مختلف ہے۔

سوال: کیا درج ذیل آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا چہرہ ہر جگہ اور تمام جہات میں ہے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ (البقرہ : ۱۱۵) "تم جس طرف رخ کرو، سو وہیں اللہ کا چہرہ ہے۔"

جواب: اس آیت کی کئی تفاسیر ہیں۔ مشہور تفسیر یہ ہے کہ یہاں "وجہ" سے مراد قصد ہے۔ یعنی تم اپنی نماز میں جو بھی قصد کرو اور جس جہت میں بھی رخ کرو تم یقیناً شرعی سمت میں ہی رخ کرو گے۔ یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے حکم کے اعتبار سے ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں بیت المقدس

کی طرف رخ کرنے کا حکم دے تو تم پر اس کی بجا آوری واجب ہے اور تمہاری نماز صحیح ہوگی۔ اور اگر اللہ تعالیٰ تمہیں کعبہ شریف کی طرف منہ کرنے کا حکم دے، تب بھی تمہاری نماز درست ہوگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے اعتبار سے ہے:

﴿فَاَيۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ﴾

یعنی تم جس طرف بھی منہ کرو وہ اللہ کی طرف سے حکم کردہ جہت ہی ہے۔

یہاں ''وجہ'' سے مراد وہ جہت ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے نماز میں متوجہ ہونے کا حکم دیا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد وہی ''وجہ'' ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ يَنْصِبُ وَجْهَهُ قِبَلَ وَجْهِ الْمُصَلِّيْ، فَإِذَا صَلَّيْتُمْ فَلَا تَلْتَفِتُوْا .))

''بے شک اللہ تعالیٰ اپنے چہرے کو نمازی کے چہرے کے سامنے جما لیتا ہے۔ لہٰذا جب تم نماز پڑھو تو ادھر ادھر نہ جھانکو۔'' [1]

تو ''فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ'' کا معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نمازی کے سامنے آ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت دوران سفر نفلی نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ مسافر کا رخ جس طرف بھی ہو جائے نماز پڑھ لے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جنہیں قبلہ کی سمت کے متعلق شبہ پڑ جائے اور وہ اپنے اجتہاد سے نماز پڑھ لیں۔

سوال: جناب شیخ! درج ذیل آیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ متشابہات میں آیات صفات بھی شامل ہیں؟ جیسے:

﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰى﴾ (طٰهٰ: ٥)

[1] یہ حضرت حارث الاشعری کی حدیث کا ٹکڑا ہے۔ اسے امام احمد نے مسند میں (۲۸/۴۰۴) (۱۷۱۷۰) اور ترمذی (۲۸۶۳) نے نقل کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

﴿وَ لَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَیۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ لَهُ الۡحُكۡمُ وَ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ﴾ (القصص : ۸۸)

﴿اَنِ اقۡذِفِیۡهِ فِی التَّابُوۡتِ فَاقۡذِفِیۡهِ فِی الۡیَمِّ فَلۡیُلۡقِهِ الۡیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاۡخُذۡهُ عَدُوٌّ لِّیۡ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ وَ اَلۡقَیۡتُ عَلَیۡكَ مَحَبَّةً مِّنِّیۡ وَ لِتُصۡنَعَ عَلٰی عَیۡنِیۡ﴾ (طٰہٰ : ۳۹)

اور صفات والی احادیث بھی متشابہات میں سے ہیں؟ جمہور اہل سنت جن میں سے ائمہ کرام سفیان ثوری، ابن دینار اور ابن عیینہ رحمہم اللہ بھی ہیں۔ ان کا مذہب یہ ہے کہ ہمارے ذمے ان پر ایمان لانا، ان سے مراد معنی کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹانا، ان کی تاویل کو چھوڑ دینا اور ان کو حقیقت پر محمول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کرنا واجب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حوادث سے متشابہات محال ہے۔

جواب: یہ کلام اوّل تا آخر غلط ہے۔ یہ گمراہ لوگوں کا عقیدہ ہے اور یہ کلام بھی انہی سے منقول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات متشابہات کی قبیل سے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ محکم ہیں، ان کا معنی واضح ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ البتہ ان کی کیفیت اور حقیقت متشابہ ہے۔ ان کا معنی متشابہ نہیں ہے اور نہ ہی اسلاف میں سے کسی نے انہیں متشابہات میں شمار کیا ہے۔ یہ امام سفیانؒ وغیرہ پر بہتان ہے۔ اور یہ کہنا غلط ہے کہ یہ جمہور اہل سنت کا مذہب ہے۔ بلکہ یہ تو اشاعرہ کا مذہب ہے جو اپنے آپ کو اہل سنت کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ اہل سنت نہیں ہیں۔ ان کو اہل سنت کا نام دینا صحیح نہیں بلکہ خلاف واقع ہے۔ جبکہ ان کے ماخذ علم اہل سنت کے ماخذ علم سے مختلف ہیں۔ ان کے اور اہل سنت کے مذہب میں بہت سی وجوہات کی بناء پر فرق ہے۔

الغرض اس عبارت میں اشاعرہ کے عقائد بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کلام درست نہیں۔ سلف صالحین صفات میں تفویض [1] نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک صفات کے معانی

[1] تفویض کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے معانی بیان نہ کرنا بلکہ انہیں اللہ کے سپرد کر دینا۔ (مترجم)

واضح ہیں۔ اسی لیے جب امام مالک رحمہ اللہ سے استواء کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''استواء معلوم ہے (یہ نہیں فرمایا کہ استواء کا معنی اللہ کے سپرد ہے بلکہ فرمایا استواء معلوم ہے یعنی اس کا معنی معلوم ہے) البتہ کیفیت نامعلوم ہے۔'' (گویا امام مالک رحمہ اللہ نے معنی اور کیفیت میں فرق کیا ہے) اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے (یعنی اس کی کیفیت کے متعلق۔) سائل نے آپ سے کہا تھا: اللہ تعالیٰ عرش پر کیسے مستوی ہے؟ گویا اس نے کیفیت کے متعلق سوال کیا تھا، استواء کے معنی کے متعلق نہیں۔

اسلاف سے لے کر بعد میں آنے والے لوگوں تک اہل سنت والجماعت لسف صالحین اہل حق میں سے کسی نے تمام صفات یا چند صفات میں تفویض نہیں کی۔ بلکہ وہ ان کی ایسی تفسیر کرتے تھے جس پر الفاظ دلالت کرتے تھے اور وہ ان کے معانی پر ایمان رکھتے تھے۔ صرف کیفیت کو اللہ کے سپرد کرتے تھے۔

سوال: جناب شیخ! اس حدیث کی صحت کیسی ہے: ''يَعْجِبُ رَبُّكَ مِنَ الشَّابِّ لَيْسَ لَهُ صَبْوَةٌ.'' ❶

ترجمہ: ''تیرا رب اس نوجوان سے تعجب کرتا ہے جس کے لیے میلان نہ ہو۔''

اور اگر یہ ضعیف ہے تو وہ کون سی صحیح دلیل ہے جس پر اس (صفت) کی بنیاد ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کی صفت تعجب پر کوئی اور دلیل ہے؟

جواب: جی ہاں! قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ بہت سی ایسی چیزیں ذکر کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے افعال پر تعجب کرتا ہے۔

سوال: جناب شیخ! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لونڈی سے یہ فرمانا جہت کے اثبات کی دلیل نہیں؟ ''أَيْنَ اللّٰهُ؟'' ❷ ''اللہ کہاں ہے؟''

جواب: جی ہاں! اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حدیث جہت علو کے اثبات کی دلیل ہے۔ اس

❶ مسند احمد: ۲۸/ ۶۰۰.

❷ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

میں مطلق جہت مذکور نہیں۔ علاوہ ازیں جب نبی معظم ﷺ نے عرفہ میں اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خطاب فرمایا اور ان سے پیغام رسالت پہنچا دینے کی گواہی طلب کی تو آپؐ نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا اور فرمایا: ''اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ'' [1] ''اے اللہ گواہ بن جا۔''

آپ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے ہاتھوں کے ساتھ اشارہ فرمایا پھر انہیں لوگوں کی طرف لوٹایا اور فرمایا:

''اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ .''

''اے اللہ گواہ ہو جا۔''

یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے لیے جہت علو کے اثبات میں واضح ہے۔

سوال: جناب شیخ! آپ نے فرمایا کہ استواء ایک فعلی صفت ہے، اس کا ایک معنی علو بھی ہے اور بلاشبہ علو صفت ذاتی ہے؟ امید ہے کہ آپ اس کی وضاحت فرما دیں گے۔

جواب: ''علوّ'' اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی مخلوق سے بلند رہتا ہے۔ جبکہ استواء ایک فعلی صفت ہے۔ وہ جب چاہتا ہے ایسا کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ''ثــم'' کے لفظ کے ساتھ ترتیب سے بیان کیا ہے۔ جبکہ علو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حق میں ثابت ہے۔ گویا استواء علو کی ایک قسم ہے۔ وہ جب چاہتا ہے ایسا کرتا ہے لیکن مطلق علو، اللہ تعالیٰ کے لیے دائمی اور ابدی طور پر ثابت ہے۔

سوال: جناب شیخ! اگر کوئی شخص فرمان باری تعالیٰ: ﴿تَجۡرِیۡ بِاَعۡیُنِنَا﴾ (القمر : ١٤) کی تفسیر ''بِأَمْرِنَا'' کے ساتھ کرتا ہے تو کیا اس کو تاویل شمار کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: یہ واضح تاویل ہے۔ بِاَعۡیُنِنَا کا معنی ہے: ہمارے دیکھتے ہوئے۔ چنانچہ اس میں اللہ تعالیٰ کے دیکھنے اور اللہ تعالیٰ کی آنکھ کا اثبات ہے۔ لہٰذا ''تَجۡرِیۡ بِاَعۡیُنِنَا'' کا معنی ہے ہماری نظروں کے سامنے۔ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کا خیال رکھ رہے تھے اور اسے چلا رہے تھے۔

---

[1] امام احمدؒ نے اسے علاء بن خالد سے اپنی مسند میں بیان کیا ہے (۳۳/۴۴۵) (۲۰۳۳۶) یہ حدیث صحیح ہے۔

سوال: جناب شیخ! کیا اللہ تعالیٰ کے لیے صفت نزول (اترنا)، صفت مجیئ (آنا) اور صفت اتیان (آنا) کا اثبات کرنے سے ہم پر اللہ تعالیٰ کے لیے صفت صعود (چڑھنا) صفت ذھاب (جانا) اور صفت ہبوط (اترنا) کا اثبات بھی لازم آتا ہے؟

جواب: ہم صرف اسی صفت کا اثبات کریں گے جس کا اللہ تعالیٰ نے اثبات کیا ہے۔ اور صرف اسی چیز کی نفی کریں گے جس کی اللہ تعالیٰ نے نفی کی ہے۔ جب تک اس کا اثبات یا نفی وارد نہ ہوگی ہم اس کے بارے میں خاموش رہیں گے۔

سوال: بعض علماء سے یہ قول منقول ہے کہ ''صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ اترا اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے پیچھے پڑتے ہوئے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ اپنی ذات کے ساتھ اترا۔ کیونکہ یہ سلف سے منقول نہیں ہے؟

جواب: ہم یوں کہیں گے: ''اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے اترتا ہے۔''

سوال: کیا اللہ تعالیٰ کی صفات کی کیفیت کے متعلق سوال کو بدعت شمار کیا جائے گا؟

جواب: جی ہاں! اس میں کوئی شک نہیں کہ صفات الٰہی کی کیفیت کے متعلق سوال کو بدعت شمار کیا جائے گا۔ اسی لیے امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا تھا:

> ''میرے خیال میں تو بدعتی ہے۔ پھر اس کو اپنی مجلس سے نکال باہر کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ کیفیت کے متعلق سوال نہیں کرنا چاہیے۔''

سوال: جناب شیخ! اللہ تعالیٰ کا کلام صفت ذاتیہ ہے یا فعلیہ؟

جواب: کلام، اللہ تعالیٰ کی صفات فعلیہ میں سے ہے۔ کیونکہ اس نے جب چاہا کلام کیا اور جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے۔

سوال: آپ جناب کی اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے جو کہتا ہے کہ ''استوی'' کا معنی ہے جلس (بیٹھا) کیا اسے تاویل شمار کیا جائے گا؟

جواب: یہ باطل ہے۔ کیونکہ اس کی تفسیر لفظ جلوس (بیٹھنے) کے ساتھ مروی نہیں۔ اور ہم اپنی طرف سے کسی چیز کا اثبات نہیں کرتے۔

سوال: کیا "اَلْمُنْتَقِمُ" کو اسماء الٰہی میں شمار کیا جائے گا؟

جواب: فعل ہے: ﴿اِنْتَقَمْنَا مِنْهُمْ﴾ (الزخرف : ٥٥) صفت یوں بیان کی جائے گی کہ وہ انتقام لیتا ہے۔

﴿عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ﴾ (آل عمران : ٤)

گویا اللہ تعالیٰ نے اپنا نام عزیز اور ذوانتقام یعنی صاحب انتقام بیان کیا ہے۔ لیکن المنتقم بیان نہیں کیا۔ نہ ہی کہیں اور یہ نام آیا ہے۔

سوال: جناب شیخ! کیا آج کے دور میں علماء سلف کی عقیدہ کے موضوع پر کوئی ایسی کتاب موجود ہے جس سے انسان جھگڑے کو مٹا سکے اور اشاعرے کے مذاہب میں داخل نہ ہو؟ بالخصوص ابتدائی طالب علموں کے لیے۔

جواب: ایسی بہت سی کتابیں موجود ہیں جن میں سلف کا عقیدہ بیان ہوا ہے۔ الحمد للہ وہ آسان بھی ہیں، تحقیق شدہ بھی ہیں اور آج کے دور میں عام بھی ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں: "شرح اصول السنة والجماعة" امام لالکائی کی۔ ابن ابی عاصم کی "کتاب السنه" امام آجری کی کتاب "کتاب الشريعه"، امام ابن خزیمہ کی "کتاب التوحيد" امام اثرم کی "کتاب السنه" اورعبداللہ بن امام احمد رحمہ اللہ کی "کتاب السنه" اوران کے علاوہ بھی اہل سنت کی بہت سی کتابیں مل جاتی ہیں۔

سوال: جناب شیخ! حدیث میں ہے: "أَنَا فَوْقَكَ وَأَمَامَكَ وَعَنْ يَمِيْنِكَ وَعَنْ شِمَالِكَ." "میں تجھ سے اوپر ہوں، تیرے سامنے ہوں، تیرے دائیں ہوں اور تیرے بائیں ہوں۔"

کیا اس سے اللہ تعالیٰ کا ہر جگہ اپنی ذات کے ساتھ ہونا لازم آتا ہے یا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے؟

جواب: میں نے اس کے مقام پر اس کی تشریح کر دی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات سے اوپر ہے۔ یہ ان دیگر دلائل کی طرح ہے جو اللہ تعالیٰ کے عرش پر بلند ہونے

پر دلالت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے علو کے باوجود اپنی تمام مخلوقات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اللہ پر کوئی چیز مخفی نہیں وہ آسمانوں کے اوپر ہے اور اس کا علم و احاطہ ہر جگہ پر ہے۔

سوال: بدعتیوں کے اس قول سے کیا مراد ہے کہ ''قرآن مخلوق ہے'' لفظ مخلوق کا کیا معنی ہے؟ کیا بدعتیوں کی اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جبریل کے سینے میں پیدا کیا تھا؟ مجھے امید ہے کہ آپ مزید وضاحت فرما دیں گے۔

جواب: ان کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کلام نہیں کرتا بلکہ اس کلام کو جبریل علیہ السلام میں پیدا کیا اور جبریل اللہ تعالیٰ کے ارادے کو بیان کرتے ہیں۔ یا اللہ نے اسے لوح محفوظ میں پیدا کیا اور جبریل نے لوح محفوظ سے اسے حاصل کیا۔ ان کا یہ کہنے کا؛ مقصد اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کی نفی کرنا ہے۔ جیسا کہ وہ دیگر تمام صفات الٰہی کی نفی کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد کفر و الحاد ہے۔ لیکن وہ واضح طور پر یہ کام نہیں کرتے بلکہ خفیہ طریقوں سے اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو حقیقتاً بولا ہے۔ جبریل نے اس کے حکم سے اسے سنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا۔ رسول نے اسے امت تک پہنچایا اور امت نے اسے اپنی آئندہ نسلوں تک منتقل کیا اور یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا۔

سوال: جناب بعض گمراہ فرقوں کا زعم باطل ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کے کلام کی تعبیر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ کلام الٰہی کی حکایت ہے۔ تو عبارت اور حکایت میں کیا فرق ہے؟

جواب: دونوں کا ایک معنی ہے۔ لیکن ماتریدیہ کہتے ہیں؛ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی حکایت ہے عبارت (تعبیر) نہیں۔ جبکہ اشاعرہ کا قول یہ ہے کہ؛ یہ کلام الٰہی کی تعبیر ہے اور اشاعرہ و ماتریدیہ دونوں کا کہنا ہے کہ یہ جو مصاحف میں ہے یہ کلام اللہ نہیں۔ کیونکہ کلام اللہ ایک صفت ہے جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے۔ لیکن قرآن جبریل علیہ السلام یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے اور اس کی تعبیر کی ہے۔ لہٰذا یہ عبارت ہے۔ ماتریدیہ کہتے ہیں: یہ حکایت ہے۔ کیونکہ ان کے بقول عبارت کا لفظ حکایت سے زیادہ دقیق ہے۔ حکایت کا لفظ خفیف ہے۔ جب اسے عبارت کہا جائے تو اس کا معنی یہ

ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام نفسی کے بالکل مطابق ہے۔ حالانکہ ان کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہ حکایت ہے۔ حکایت کے لفظ میں عبارت کے لفظ سے زیادہ وسعت پائی جاتی ہے۔

لیکن یہ تمام اقوال ہی گمراہی پر مبنی ہیں۔ (اللہ کی پناہ) انہوں نے ایک طرح جہمیہ کی موافقت کی ہے۔ وہ یوں کہ یہ قرآن جو ہمارے پاس موجود ہے یہ کلام اللہ نہیں۔ یہ بات بالکل جہمیہ کے قول کی طرح ہی ہے۔

سوال: کیا ''اعراب القرآن'' سے مراد قرآن کو تجوید کے ساتھ پڑھنا ہے اور کیا تجوید کے ساتھ پڑھنا واجب ہے؟

جواب: ''اعراب القرآن'' کے ساتھ قراءت کا معنی یہ ہے قرآن کو لغوی غلطیوں کے بغیر پڑھنا۔ جبکہ تجوید: مد، ادغام اور اس جیسے دیگر احکام کا نام ہے۔ یہ تلاوت و اداء کو خوبصورت بنانے والی چیزیں ہیں۔ یہ واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔ احکام تجوید میں شدت اور مبالغہ نہیں کرنا چاہیے۔

تجوید اور احکام تجوید تحسینات میں سے ہیں۔ جو ان کو سیکھے اور ان کو ادا کرے وہ قابل تحسین ہے اور جسے ان کا علم نہ ہو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بشرطیکہ وہ قرآن کو پڑھتے ہوئے ایسی غلطیاں نہ کرے کہ منصوب کو مرفوع، مرفوع کو منصوب اور منصوب کو مجرور پڑھ دے۔

چنانچہ مطلوب اعراب القرآن ہے۔ یعنی قرآن کو عربی انداز میں غلطی کے بغیر پڑھنا۔ لیکن خوبصورت آواز میں خوبصورت تلاوت کرنا اور تجوید یہ سب قابل تحسین امور ہیں اور تکمیل قراءت سے تعلق رکھتی ہیں۔

سوال: کیا بندوں کے افعال مخلوق ہیں۔ اور کیا میرا قرآن کو پڑھنا بھی مخلوق ہے؟

جواب: آپ کی آواز مخلوق ہے البتہ جو چیز آپ پڑھتے ہیں وہ اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں۔ اسی طرح آپ کا قرآن کو لکھنا مخلوق ہے لیکن جس چیز کو آپ لکھتے ہیں وہ مخلوق نہیں۔

سوال: شیخ مؤلف نے یہ حدیث بیان کی ہے: ''مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فَأَعْرَبَهُ'' لیکن الشیخ/ احمد سلطان نے اپنی کتاب میں اسے سخت ضعیف کہا ہے اور یہ بات کسی اہل حدیث سے نقل کی

ہے۔ جبکہ مؤلف نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اس حدیث کا کیا حکم ہے؟

جواب: جب اکثر یا تمام اہل حدیث کسی حدیث کو ضعیف کہہ دیں تو ہم بھی اسے ضعیف کہیں گے۔ اور اگر ان کا اختلاف ہو، بعض اسے صحیح کہتے ہیں، بعض ضعیف کہتے ہوں اور بعض حسن قرار دیتے ہوں تو بلاشبہ شرعی قواعد کے مطابق ترجیح کی صورت اختیار کی جائے گی۔ جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو اس معنی کی بہت سی احادیث ملتی ہیں جو اچھے انداز میں تلاوت کرنے اور اس کا اہتمام کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔

سوال: شیخ اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ ''دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ناممکن ہے۔'' دنیا میں دیدار الٰہی صرف اس لیے نہیں ہوتا کہ لوگوں کے اندر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی قوت نہیں، تو کیا لوگوں کی دیدار الٰہی کے سلسلے میں کمزوری اللہ کے دیدار کے محال ہونے کا سبب نہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ کا دیدار فی نفسہ محال نہیں۔ رہی لوگوں کی قوت تو یہ الگ چیز ہے۔ مذکورہ قول کے قائل نے یہ نہیں کہا کہ لوگوں کے لیے اللہ کو دیکھنا محال ہے۔ بلکہ اس نے رؤیت کو محال کہا ہے۔ ہم کہتے ہیں: یہ غلط ہے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام ایک محال چیز کا سوال نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی کسی ناجائز چیز کا سوال کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ کلیم اللہ تھے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق زیادہ جانتے تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ مجھے دیکھا نہیں جا سکتا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ:

﴿وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

(الاعراف: ۱۴۳)

''اور جب موسیٰ ہمارے مقررہ وقت پر آیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا کہ میں تجھے دیکھوں۔ فرمایا: تو مجھے

ہرگز نہ دیکھے گا۔ اور لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھ۔ سو اگر وہ اپنی جگہ برقرار رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا۔ چنانچہ جب اس کے ربّ نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو اس نے کہا تو پاک ہے۔ میں نے تیری طرف توبہ کی اور میں ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہوں۔''

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے نزدیک دیدار میں ایک رکاوٹ حائل تھی۔ اور وہ ہے انسان کا اس دنیا میں عاجز ہونا۔ اور جس چیز میں کوئی رکاوٹ حائل ہو وہ بذات خود محال نہیں ہوتی۔ بلکہ فی نفسہ وہ ممکن ہوتی ہے۔ وہ مانع ہوتا ہے جو اس کو انسان کے لیے ممنوع بنا دیتا ہے۔

سوال: جناب شیخ! کیا ایک شخص کے لیے زیادہ محفوظ راستہ یہ نہیں کہ وہ تقدیر پر مجمل ایمان لائے جو چاروں مراتب پر مشتمل ہو۔ لیکن وہ ان تفصیلات میں نہ جائے جو انسان کو پریشانی کا شکار بنا دیتی ہیں۔ مثلاً کسی شخص کے جنت یا جہنم میں جانے کے بارے میں سوال کرنا باوجودیکہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ کفر کریں گے اور یہی اللہ تعالیٰ نے چاہا بھی۔ تو کیا زیادہ محفوظ راستہ مجمل ایمان، تسلیم وقبول اور سکوت اختیار کرنے کا ہے یا تفصیلات کے بارے میں سوال کرنے کا۔

جواب: عقیدے کو اس کی تفصیلات کے ساتھ جاننا ضروری ہے۔ ان تفصیلات میں قضاء وقدر کا مسئلہ بھی ہے۔ یہ انسان پر حسب استطاعت واجب ہے۔ اگر اس کے پاس استطاعت ہو تو اس کے لیے تفصیلات کو جاننا ضروری ہے۔ اور اگر استطاعت نہیں تو مجمل عقیدے کا علم کافی ہے اور یہ چار مراتب قرآن کریم اور احادیث میں مذکور ہیں۔ یہ گمراہ کن چیزوں میں سے نہیں جیسا کہ سائل نے کہا ہے۔ بلکہ یہ کتاب وسنت میں مذکور ہیں۔ چنانچہ ان کی معرفت حاصل کرنا اور اس حد تک ان میں پختگی پیدا کرنا ضروری ہے کہ انسان اس معاملے میں صاحب بصیرت بن جائے اور گمراہ یا بھٹکے ہوئے لوگوں کے ساتھ خود گمراہ نہ ہو۔

سوال: جناب شیخ! آپ نے اپنی گفتگو میں ذکر کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: ارادۂ شرعیہ کے ساتھ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کافر کو مسلمان ہونے کا حکم دیا ہے۔ یہ کیوں پورا نہیں ہوتا؟

جواب: وہ جو چاہتا ہے ارادہ کونیہ کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ وہ ارادہ ہے جس سے کوئی چیز باہر نہیں۔لیکن ارادہ دینیہ کے مطابق مراد کبھی حاصل ہوتی ہے اور کبھی اللہ کی حکمت کے مطابق مراد حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا ارادہ دینیہ اور ارادہ کونیہ میں فرق ہے۔ اسے آپ سمجھ لیجیے۔

سوال: جناب شیخ! کیا ''طٰہٰ'' اور ''یٰس'' نام رکھنا صحیح ہے؟ اور جس کا یہ نام رکھ دیا جائے وہ کیا کرے؟

جواب: اگر عقیدہ یہ ہو کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے نام ہیں تو پھر جائز نہیں۔ اور اگر یہ عقیدہ نہ ہو تو یہ نام رکھے جا سکتے ہیں۔

سوال: جناب شیخ! میں آپ سے نزول قرآن کی کیفیت جاننا چاہتا ہوں۔ بالخصوص اس لیے کہ آپ نے گذشتہ سبق میں یہ بیان کیا تھا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ثابت نہیں، جس میں ہے کہ مکمل قرآن بیک وقت بیت العزت پر نازل ہوا۔

جواب: یہ حدیث جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے۔ جیسا کہ ابن کثیر وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ نبی کریم ﷺ تک مرفوع نہیں ہے۔ جبکہ قرآن کریم کو جبریل علیہ السلام اللہ جل و علا سے حاصل کرتے تھے۔ نہ لوح محفوظ سے لیتے تھے اور نہ ہی بیت العزت سے۔ بلکہ اسے اللہ تعالیٰ سے حاصل کرتے پھر اسے محمد ﷺ پر نازل فرما دیتے تھے۔ قرآن کریم کے بارے میں حق بات یہی ہے کہ جناب جبریل علیہ السلام نے اسے اللہ تعالیٰ سے سنا اور محمد ﷺ کو پہنچایا۔ پھر نبی کریم محمد ﷺ نے اسے امت تک پہنچایا۔ اور امت نے اسے نسل در نسل ایک دوسرے تک منتقل کیا۔ چنانچہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

سوال: جناب شیخ! جب تقدیر کو گناہوں کی دلیل بنانا جائز نہیں تو آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جھگڑے کے وقت اسے دلیل کیوں بنایا تھا؟

جواب: میرے بھائی! آدم علیہ السلام نے قضاء و قدر کو گناہ کے لیے دلیل نہیں بنایا تھا۔ بلکہ مصیبت کے لیے دلیل بنایا تھا۔ اور وہ ہے جنت سے نکلنا۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا تھا: تو نے ہمیں جنت سے نکالا ہے۔ [1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا تھا کہ تو نے درخت کا پھل کیوں کھایا؟ بلکہ یہ کہا تھا کہ ''تو نے ہمیں جنت سے نکالا'' اور یہ ایک مصیبت ہے۔ گویا حضرت آدم علیہ السلام نے مصیبت کے لیے قضاء وقدر کو دلیل بنایا۔ اور علماء کا کہنا ہے کہ قضاء وقدر کو مصیبت کی دلیل بنایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ بندے کو مطیع رہنا چاہیے، ثواب کی امید رکھنی چاہیے اور اللہ سے توبہ کرنی چاہیے۔ لیکن اس کو عیوب اور گناہوں کی صحبت نہیں بنایا جاسکتا۔

سوال: جناب شیخ! کیا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ عمل کو ایمان میں داخل نہیں کرتے اور کیا انہیں مرجئہ فقہاء میں سے شمار کیا جائے گا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ہم ان کی طرف سے عذر کیوں پیش کرتے ہیں؟

جواب: جی ہاں! ابوحنیفہ اور ان کے استاد حماد بن ابی سلیمان دونوں اسی قول کے قائل ہیں کہ ایمان زبان سے اقرار اور دل کے عقیدے کا نام ہے۔ اعمال جوارح اس میں داخل نہیں اور بلاشبہ یہ ارجاء ہے۔ اسی لیے لوگ انہیں مرجئہ فقہاء اور مرجئہ اہل سنت کا نام دیتے ہیں۔ وہ اہل سنت میں سے ہیں لیکن ان سے یہ چھوٹی سی غلطی ہوگئی۔ بلاشبہ یہ غلطی ہے اور ہم کسی کی بھی غلطی کو قبول نہیں کرتے۔ نہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی اور نہ ہی کسی اور کی۔ کیونکہ ہمارا ہدف صحیح اور حق بات تک پہنچنا ہے۔ اس غلطی سے امام ابوحنیفہ کی عزت ہمارے نزدیک کم نہیں ہوتی۔

سوال: جناب شیخ! کیا انسان کو مجبور سمجھا جائے یا مختار یا دونوں؟

جواب: اس اعتبار سے اسے مجبور سمجھا جاتا ہے کہ وہ امراض و مصائب کا شکار ہوتا ہے جس میں اس کا اختیار نہیں۔ اپنے افعال و تصرفات اور ارادے کے اعتبار سے اسے مختار سمجھا جاتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو کام کرے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے۔ لہٰذا نہ تو وہ محض مجبور اور نہ ہی محض

[1] بخاری (۶۶۱۴)، مسلم (۲۶۵۲/۱۳) راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

مختار ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے مجبور ہے اور ایک اعتبار سے مختار۔ یہ تفصیل ضروری ہے۔

سوال: جناب شیخ! کیا محض دل کے عمل کے ساتھ شہادتین کا اقرار کافی ہے؟ کیونکہ یہ ایک عمل ہے جو کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔ بالخصوص جب کوئی صدقات و زکوٰۃ کا اہتمام کرتا ہو، روزے رکھتا ہو، اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ سے ڈرتا بھی ہو۔لیکن سستی یا جہالت کی وجہ سے نماز ترک کرتا ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: یہ مرجئہ کا قول ہے کہ ایمان اقرار باللسان اور اعتقاد بالقلب کا نام ہے۔ اعمال اس میں داخل نہیں۔ جبکہ جمہور اہل سنت کا قول یہ ہے کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں اور ان کو ترک کرنے سے یا تو ایمان زائل ہو جاتا ہے جیسا کہ نماز کو چھوڑنے سے۔ یا ایمان کم ہو جاتا ہے۔

سوال: جناب شیخ! میں مرحلہ ثانویہ (میٹرک) کا طالب علم ہوں۔ اس میں ہم ادبی موضوعات پڑھتے ہیں۔ کاتب کہتا ہے جو شخص طاقتور نہیں، پختہ ارادے اور عزم کا مالک نہیں وہ اسلام کے بغیر مسلمان ہے۔ اور دوسرے مقام پر وہ کہتا ہے: ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر معاشرے میں انسان ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ کدھر جا رہا ہے اور اس نے کیسا پایا ہے؟
اور وہ کہتا ہے: ایمان باللہ کے مختلف راستے ہیں۔ بعض لوگ عقل کے ذریعے اس تک پہنچتے ہیں، بعض لوگ موروثی طور پر۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ فرمائیں: کیا یہ اقوال صحیح ہیں۔ کیونکہ پڑھانے والے استاد صاحب کہتے ہیں کہ یہ ادبی تعبیرات ہیں۔

جواب: یہ کفریہ تعبیرات ہیں، ادبی نہیں۔ اس کا یہ کہنا کہ میں نہیں جانتا میں کہاں سے آیا ہوں؟ اور کہاں جاؤں گا؟ یہ شک اور حیرت کا اظہار ہے اور یہ کفر ہے (اللہ کی پناہ)۔ جی ہاں! ہم جانتے ہیں کہ ہم کہاں سے آئے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ کہاں جانے والے ہیں۔ اور ہم خیر اور شر کے راستوں کو پہچانتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ بیان فرما دیے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ (شریعت) کا انکار ہے اور ایمان موروثی طور پر نہیں ملتا۔ بلکہ کتاب وسنت اور رسول اکرم ﷺ کی اتباع سے ملتا ہے۔

لہٰذا ایسی باتوں پر خاموش رہنا جائز نہیں بلکہ ان کو لکھ کر تعلیم کے ذمہ داران تک پہنچانا

ضروری ہے تاکہ وہ اس پر غور کریں۔ کیونکہ یہ بہت خطرناک بات ہے۔ بالخصوص جبکہ یہ طلباء کو پڑھائے جانے والے نصاب میں شامل ہے۔

سوال: جناب شیخ! اللہ تعالیٰ رسول اکرم ﷺ سے فرمائیں گے ''جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہے اسے آگ سے نکال لیں'' ❶ تو جو شخص نماز کو ترک کرتا ہے وہ جہنم میں ہمیشہ کیسے رہ سکتا ہے۔ جبکہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے، نماز کی فرضیت کو جانتا ہے اور اس کا عقیدہ بھی اسلاف والا ہے۔

جواب: اگر اس کا عقیدہ اسلاف والا ہوتا تو وہ نماز کی حفاظت کرتا۔ اسلاف نماز کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ لہٰذا جو شخص نماز کی حفاظت نہیں کرتا وہ عقیدۂ سلف پر نہیں بلکہ وہ کفر اکبر کا ارتکاب کرنے والا کافر ہے۔ لہٰذا وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ جیسا کہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے صحیح احادیث مروی ہیں۔ چنانچہ جب کوئی جان بوجھ کر نماز ترک کرتا ہے تو وہ عقیدہ سلف سے خارج ہو جاتا ہے اور دائرۂ ایمان سے نکل جاتا ہے۔

سوال: جناب شیخ! کیا زمین کے ساکن ہونے اور متحرک نہ ہونے کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن کی مخالفت کرنے والے کو گمراہ، بدعتی یا کافر کہا جاسکتا ہے۔ اور اس شخص کا کیا حکم ہے جو عصر حاضر کے ماہرین فلکیات کے اقوال کو دلیل بناتا اور ان پر اعتماد کرتا ہے؟

جواب: جو قرآن وسنت کی مخالفت کرے اسے اس وجہ سے گمراہ قرار دیا جائے گا۔ اور اگر وہ عمداً ایسا کرے اور یہ کہے کہ جو کچھ قرآن وسنت میں مذکور ہے خلاف عقل اور غیر صحیح ہے۔ تو ہم کہتے ہیں وہ کافر ہے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو جھٹلاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی آیات کو نہ جھٹلائے محض ان کی تاویل کرتا ہو تو ہم اسے خطا کار اور ظالم کہیں گے۔

سوال: جناب شیخ! کیا میّت قبر میں جوتوں کی آواز کے علاوہ بھی کوئی آواز مثلاً لوگوں کی گفتگو سنتی ہے؟

جواب: میّت صرف وہی آواز سنتی ہے جس کے سماع کی دلیل ملتی ہے۔ لیکن جس آواز کو سننے

---

❶ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

کی دلیل ثابت نہیں ہم اس آواز کے سماع کا اثبات نہیں کرتے۔ کیونکہ غیبی امور میں صرف نقل صحیح پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا جس آواز کے بارے میں دلیل مل جائے کہ میّت اسے سنتی ہے تو ہم اسے تسلیم کرلیں گے۔

سوال: جناب شیخ! اللہ تعالیٰ میّت کے گھر والوں کے اس پر نوحہ کرنے کی وجہ سے میّت کو کیوں عذاب دیتے ہیں؟ حالانکہ اس کے گھر والوں کے فعل کا اس پر کوئی گناہ نہیں؟ امید ہے آپ وضاحت فرمائیں گے۔

جواب: کیونکہ اس نوحہ کا سبب میّت خود ہوتی ہے۔ علماء فرماتے ہیں: اس حدیث کو اس صورت حال پر محمول کیا جائے گا جب اس نے ان کو اپنے اوپر نوحہ کرنے کی وصیت کی ہو۔ یا اسے علم ہو کہ مرنے کے بعد لوگ اس پر نوحہ کریں گے لیکن اس نے انہیں منع نہیں کیا۔ بلکہ انہیں چھوڑ دیا اور نصیحت نہیں کی۔ اس کو اس وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے گھر والوں کو منع نہیں کیا اور ان کی تردید نہیں کی۔

بہرحال جو حدیث میں آیا ہے کہ میّت کو اس پر کئے جانے والے نوحہ کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے ہم اسے صحیح مانتے ہیں۔ البتہ اس کو عذاب دینے کی کیفیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

سوال: جناب شیخ! اس شخص کا کیا حکم ہے جو اولیاء کو مدد کے لیے پکارتا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ یہ شرک ہے؟ یاد رہے کہ وہ ایک ایسے علاقے میں رہتا ہے جہاں شرک کی دعوت دینے والے بہت سے لوگ موجود ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حق کی دعوت دینے والے بھی موجود ہیں اگرچہ وہ تھوڑی تعداد میں ہیں۔

جواب: ایسے شخص کو معذور نہیں سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اس کو دعوت پہنچ چکی ہے اور اس پر حجت قائم ہوچکی ہے۔ اگر وہ مسلمانوں کے ملک میں رہتا ہے، قرآن سنتا ہے، احادیث سنتا ہے، اللہ کی طرف دعوت دینے والوں اور حق کے داعیوں کی پکار سنتا ہے لیکن اس کے باوجود اپنے شرک پر قائم رہتا ہے اور اس پر اصرار کرتا ہے تو یہ معذور نہیں۔ کیونکہ اس پر حجت قائم

ہو چکی ہے۔

سوال: جب مسلمان کسی ایسے عمل کا ارتکاب کر بیٹھے جو اسلام سے خارج کر دیتا ہے تو کیا اس کے سامنے اس جرم کی سنگینی واضح کیے بغیر براہ راست ہم اس پر کفر کا فتویٰ لگا سکتے ہیں۔ یا اس پر حجت قائم کرنے تک ہم اس کے کفر کے بارے میں توقف کریں؟

جواب: اگر کوئی ایسا جاہل ہو تو اس کے خلاف اس وقت تک فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا جب تک اس کو بتا نہ دیا جائے۔ اگر وہ پھر بھی اپنے عمل پر قائم رہے تو اسے مرتد قرار دیا جائے گا اور اگر کسی کو اس کا علم بھی ہو تو اس کو مرتد کہا جا سکتا ہے۔ اسے توبہ کرنے کی ترغیب دی جائے گی کیونکہ اس پر حجت قائم ہو چکی ہے۔

سوال: کیا ہم ان لوگوں کو جہنمی نہیں کہہ سکتے جو نماز تو پڑھتے ہیں لیکن شرک بھی کرتے ہیں؟

جواب: ہم مشرکوں پر جہنمی ہونے کا فتویٰ لگا سکتے ہیں لیکن ہمیں ان کی وفات کے وقت کی حالت کا یقینی طور پر علم نہیں۔ لہٰذا ہم کہیں گے؛ تمہارا یہ کام کفریہ ہے جو ملت اسلامیہ سے نکال دیتا ہے۔ اس عمل کی وجہ سے تمہیں کافر سمجھا جائے گا جیسا کہ صحیح حدیث اس پر دال ہے۔ البتہ ہم یہ فتویٰ نہیں لگا سکتے کہ وہ جہنمی ہیں۔ کیونکہ اس فتوے کا تعلق انجام کے ساتھ ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کس حالت میں مریں گے۔ انفرادی اعتبار سے یہی حکم ہے لیکن عمومی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے وہ کافر ہے۔ اور جو شرک و کفر کی حالت میں ہی فوت ہو گیا وہ جہنمی ہے۔ عمومی اعتبار سے فتویٰ دینے کے جواز میں کوئی شک نہیں۔ گویا عمومی اور خصوصی حکم لگانے کے درمیان فرق ہے۔

سوال: فضیلۃ الشیخ کیا فاسق کے پیچھے نماز پڑھنے کا جواز صرف حکمرانوں کے ساتھ خاص ہے یا ہر فاسق کے پیچھے نماز پڑھی جا سکتی ہے خواہ وہ حکمران نہ بھی ہو؟

جواب: حکمران کے پیچھے نماز پڑھنے کے جواز پر تو امت کا اجماع ہے اور یہی اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔ لیکن حکمرانوں کے علاوہ دوسرے فاسق لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ حنابلہ کا مؤقف یہ ہے کہ فاسق کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔

"الزاد" کے متن میں یہ بات مذکور ہے۔

سوال: جناب فضیلۃ الشیخ عقیدے کی بہت سی کتب مثلاً طحاویہ، لمعۃ الاعتقاد وغیرہ میں یہ جملہ لکھا ہوا ہے کہ "ہم کسی گناہ کی وجہ سے کسی کو اس وقت تک کافر قرار نہیں دیں گے جب تک وہ اسے حلال نہ سمجھے۔ مرجئہ اس جملے سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ کفر کا تعلق عمل کے ساتھ نہیں بلکہ یہ صرف عقیدے کے ساتھ متعلق ہے۔ امید ہے آپ اس جملے کا صحیح مفہوم بیان کریں گے۔

جواب: اس جملے میں عمل کو اس بات کے ساتھ مقید کرنا ضروری ہے کہ وہ عمل شرک سے کمتر ہو۔ ورنہ ایسا عمل جس میں شرک پایا جائے اس کے مرتکب پر کفر کا فتویٰ لگایا جائے گا۔ مثلاً بتوں کو سجدہ کرنے والا اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے والا کافر ہے۔ کیونکہ یہ کفریہ اعمال ہیں۔ اسی طرح تارک نماز بھی کافر ہے خواہ وہ نماز کے وجوب کا انکار نہ بھی کرتا ہو۔ صحیح احادیث اور دلائل سے ایسے شخص کا کفر ثابت ہے۔

هٰذَا مَا عِنْدَنَا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ .

یادداشت